

کرشن چندر



باون پتے



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

باون پتے
ایک ٹاول

باون پتے

کرشن چندر

ایکس ناول

مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور



نقشہ	نواز
طبع	مظہر پرنٹرز لاہور
قیمت	۲ روپے

.....

رفعیہ وادرمین روڈ پر دلہیت سیٹوڈیو کے قریب ایکسٹرا یونین کے آفس کے باہر بھی کے کھجے سے لگی اپنی سہیلی رضیہ سے باتیں کر رہی تھی کہ اتنے میں فوہمارت پر ڈکشن کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھٹا چاریہ دوڑا دوڑا اُس کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا ”سیٹو تمہیں بلاتے ہیں“ رفعیہ نے ہاتھ ہلا کے گویا پوسٹل کو اپنے ذہن سے دور دفنان کرتے ہوئے کہا ”جاؤ۔ جاؤ تمہارے سیٹو دس بار بلا کر کبھی کام نہیں دیتے۔ میں نہیں آؤں گی۔“

سولے بجنا چاریہ کا دوڑتے دوڑتے دم پھول گیا تھا۔ حالانکہ فوہمارت پر ڈکشن کا دفتر یہاں سے پچاس ساٹھ گز سے زیادہ دور نہ تھا۔ پھر بھی وہ ہانپ رہا تھا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ”نہیں رضیہ ابھی تھوڑی دیر میں ناپچنے والی لڑکیوں کی ٹرائی ہوگی۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔ راستہ کو شوٹنگ ہے۔ پانچ ٹوکیاں موجود ہیں۔ ایک اور چاہئے۔ تم چلی چلو۔ ورنہ۔“

بھٹا نے رضیہ کی طرف دیکھا۔ رضیہ نے اپنی گولڈ واچ کی طرف دیکھا اور پھر رضیہ سے سفارش کرتے ہوئے کہا ”تو چلی جا۔ میری تو آج اپنے دلدار کے ساتھ جوہر پراپوائنٹ مینٹ ہے۔“

”ہاں ہاں“ رضیہ جھک کر کہی ”تو جا جوہر پر ہمیشہ کرے۔“

رضیے کہا ” تو بھی میٹس کر سکتی ہے۔ کسی کو دلدار بنائے۔“

” وہ میرے چھ دلدار گھر پر جو بیٹھے ہیں محمد علی روڈ پر۔ اُن کا کیا کر دل گی پھر؟ دن بھر سیٹ پر اتھار کے کتیا کے بچوں کی طرح چاؤں چائوں کرتے رہتے ہیں۔ ایک میرا دلدار وہ بیٹھ حاجی یا سین بھائی لوط بھائی ہے۔ ایک مکان! جس کا چار مہیے کا کرایہ مجھے دینا ہے۔ ایک میرا دلدار وہ حیدر بھائی میا گدانی ہے جس کی دوکان سے میں راشن لاتی ہوں۔ ایک میرا دلدار ریلوے نگہانی کا وہ کلرک ہے جس کے ہاں ہوا مجھے نوکس ٹرین کے پاس کے روپے جمع کرانے پڑتے ہیں۔ ایک میرا دلدار —————“

بھٹا چاریہ نے اپنی چٹنی ناک پر اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک ٹھیک کی اور گڑگڑاتے ہوئے بولا ” رضیہ بونی! (رضیہ بانی)“

” ہاں بھائی؟“

” سیکھو بلا تیسے! بھٹا چاریہ نے ٹری عاجزی سے نو بھارت پروڈکشن کی بلاڈنگ کی طرف اشارہ کر کے کہا ” اچھا چن :- رضیہ نے بھٹا چاریہ کی گویا درخواست منظور کرتے ہوئے کہا۔ پھر رضیہ کی طرف مڑ کر بولی ” سہلے گی نا بھٹا!“

” ہاں“ رضیہ نے اپنے سونے کے ٹاکٹ کو اپنے صاف ستھرے مسنرے رنگ کے سینے پر ٹکھاتے ہوئے کہا۔

” کہاں؟“

” یہیں.... چھ بجے شام کو۔ اسی کبلی کے کھمبے کے نیچے۔“

” بانی۔ بانی“

رضیہ جلدی جلدی نو بھارت پروڈکشن کے دفتر کی طرف چلنے لگی۔ گو بھٹا چاریہ کا دم پھولا جا رہا تھا۔ بھر بھی وہ جلدی جلدی کسی نہ کسی طرح قدم ملائے رضیہ کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور چلتے ہوئے

تقریباً ہاتھ جوڑتے ہوئے گنگلیاتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا: رضیہ ہوئی، تم کہاں غلام اس انگلیں شکر ہے۔ تم بہت شریف معلوم ہوتی ہو۔ یہ لائن تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ اب گرگاہی ہو تو ان منہ میں پنجاہوں، گجراتوں کے ساتھ کام کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ صرف بوچھالی ڈائریکٹروں کے ساتھ کام کرو۔ بوچھالی لوگ بڑے کچھڑ بھرتے ہیں۔ ہیرا بھال، ہیرا شیکور، ہیرا دیو کی بابو، ہیرا نیر تھیسرس، یہاں میں نے تین گھنٹوں سے تمہارا بات کیا ہے۔“

بھٹا چاریہ نے رضیہ کی طرف اس طرح پچھلی بھاہوں سے دیکھا۔ جیسے کچھ اپنے سالگرہ کے ٹیک کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ کہہ اور کہنے والا تھا کہ اتنے میں تو بھارت پر وکشن کا دفتر آگیا۔ اور رضیہ جلدی سے اندر چلے گئے۔ ہال میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے پانچ اور لوگیاں بیٹھی تھیں۔ غالباً اُس کی طرح ڈانس کی ٹرائی دینے آئی تھیں۔ وہ اُن میں سے تین کو نہیں جانتی تھی۔ دو سے میں علیک سلک تھی۔ رضیہ نے ہاتھ اوپر اٹھائے انہیں آداب کیا۔ اُن دونوں نے سر کی جنبش سے بڑی نفرت سے آداب کا جواب دیا۔ کیونکہ وہ دونوں بے حد غوب صورت تھیں۔ گوری چٹنی، اچھے لباس، اور حسین زربوروں میں بھی بھائی۔ گویا بالکل ڈھن بن کر ڈول میں بیٹھنے کے لئے تیار۔ اور رضیہ کی شکل صورت، ذرا یوں ہی سی تھی۔ رنگ سانولا۔ آنکھیں بڑی بڑی مگر نیچے حلقے پڑے ہوئے۔ ناک نیچی۔ مگر ہونٹ موٹے۔ اور ہر کے دانت ذرا ٹیڑھے میڑھے۔ قد نہ چھوٹا نہ لمبا۔ مگر چہرے سے نیچے جسم بے حد متناسب تھا۔ سینہ، کمر، کولہے، رانیں، پنڈلیاں۔ اک بھی ہوئی۔ مشاق پہننے والی کی مشاق کیفیت لئے ہوئے۔ رضیہ جب سٹوڈیو کے فرش پر ناچتی تھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا جیس کی سٹار کوئی کنول رقص کر رہا ہے۔ مگر سٹی میں نور اور تھی اس لئے کام خدا شکل سے ملتا تھا۔

رضیہ نے ہال کا دیوار پر گئے ہوئے کواک کی طرف دیکھا۔ اُسے یہاں آئے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے۔ اور ابھی تک ڈائریکٹر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اُس نے نظر گھما کر ہال کے اندر دروازے

”آں؟ بھلا؟“

پنجابی لڑکی کو بڑا غصہ آ رہا تھا۔

بھٹا چاریہ نے اُسے جھلاتے ہوئے کہا ”ابھی ہوگی۔ سیٹھ کا انتظار ہے“ سیٹھ تو اندر بیٹھے ہیں۔ لیک اور لڑکی نے چمک کر کہا۔ ”میں جب آئی تھی تو اُن کو اندر جلاتے دیکھا تھا۔ بھر کو کیا بناتے ہو۔ دس سال سے فلم انڈسٹری میں کام کر رہی ہوں سیٹھ جیتاں بھائی کو میں نہیں جانتی کیا؟“

بھٹا چاریہ نے اور بھی دھیرے سے دھیرے سروں میں اُن سب سے کہا۔ ”وہ تو کہنی کے مالک ہیں نا سیٹھ جیتاں بھائی بانگڑا۔ مگر یہاں اس وقت لیک دوسرے سیٹھ کا انتظار ہے۔ سیٹھ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کا...“

”یہاں کون کس کا سیٹھ ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔“ دس سال سے فلم میں کام کرنے والی لڑکی بڑی آزدگی سے بولی۔ اور بھٹا چاریہ کی طرف چٹو کر کے بیٹھ گئی۔

بھٹا چاریہ نے بائیں بے بس ہو کر کہا ”بس ابھی آتے ہوں گے۔ اُن کا ٹیلی فون آیا تھا۔ ابھی آدھ گھنٹہ میں آجائیں گے۔ ٹرائی ہو جائے گی۔“

”ٹرائی وائیو“ وہ پنجابی لڑکی بھٹا چاریہ کے اندر جھلنے کے بعد بولی۔ ”ساڈا امر تر ہوتا۔ تو اس کی ہاتھیں جھیر دیتی۔ پنج وہجے دا بھلا کے بھٹا یا ہویا۔ اس سو دے پُترے!“

رفیہ کو اس کی باتیں سُن کر مڑا آگیا۔ اچھا تو یہ بے چاریاں پانچ بجے سے ڈانس کی ٹرائی کے لئے مضمی نہیں! رمیہ نے دل ہی دل میں تسکریہ ادا کیا کہ وہ ابھی آئی ہے۔ ورنہ اُسے بھی اتنا ٹوٹا انتظار کرنا پڑتا۔ اتنے میں یلائی وڈ کے دروازے کے اندر سے ایک زرد کا قہقہہ سُنائی دیا۔ ادھر سب لوگوں کی نظرس اُنکے لئے دروازے پر جا کر جم گئیں

پلائی وڈ اور کاخی کا دردانہ ایک پلائی وڈ کہیں کے اندر کھلتا تھا۔ یہ دردانہ اس کہیں میں کچھ اس طرح سے فٹ تھا کہ بال میں بیٹھنے والے کو اس کہیں میں بیٹھنے والے کا صرف دھڑنظر آسکتا تھا۔ اور اس دردانے سے اوپر جھانکنے والے کو صرف دھڑ سے اوپر کا حصہ نظر آسکتا تھا۔ بیسنی یہ دردانہ اس کہیں کے وسط میں اوپر سے اور نیچے سے دونوں طرف سے کھلا تھا کہ پلائی وڈ کم خرچ ہو۔ گویا یہ دردانہ نہ تھا۔ کلڑی کا ایک نیکر تھا۔ جو ہو کے ساحل پر نہانے والی حیسنہ کے لئے تیرکی کا لباس تھا۔ جس میں نظر زیادہ آتا ہے۔ اور چھپایا کم جاتا ہے۔

رفیہ جو بال میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ پلائی وڈ کہیں میں ایک میز کے نیچے بہت سی کشتی جگہوں کا اجتماع دیکھ رہی تھی۔ بھٹا چاریہ جو کہیں کے اندر دردانے سے لگا کھڑا تھا وہ ان ہانگوں سے اوپر کے انسانی جسم دیکھ رہا تھا جو اُس وقت بظاہر زری ایسے دل چپ کھیل میں مصروف نظر آتے تھے۔ مگر بھٹا چاریہ جانتا تھا کہ اُن میں سے ہر شخص کے کان ایک کونے میں پڑے ہوئے ٹیلی فون پر گئے ہوئے ہیں۔ جہاں ابھی ابھی سیٹھ بھگت لال کا کال آیا تھا۔ بھٹا چاریہ نے ہی کھینٹے دالوں پر نظر دوڑائی۔ اُن میں سب سے نمایاں فلم کے پروڈیوسر سیٹھ میناں بھائی بانکڑا تھے۔ ان کا تھ۔ زریہ اندام سر کے بال بال مکمل سفید۔ گوری جتنی رگت پر بشارت کھیلتی ہوئی۔ ہاتھوں میں ہیرے کی تین انگوٹھیاں

پہننے ہوئے سب سے کم متفکر دکھائی دیتے تھے۔ سیٹھ بیتال بھائی نے جنگ کے زمانے میں فلموں کے لائسنس کی بلیک مارکیٹ کی تھی، ان دنوں فلم کے ایک لائسنس کے عوض بلیک مارکیٹ سے لاکھ سوا لاکھ روپے لے جاتا تھا، بس گورنمنٹ آف انڈیا سے فلم بنانے کا ایک لائسنس لے آئیے اور اُسے بلیک مارکیٹ میں بیچا دیجئے مگر بیٹے سوا لاکھ روپے لے جاتے گا۔

سیٹھ بیتال بھائی ہاتھ دیا اب تک کوئی پختہ فلمیں بنا چکے تھے۔ جنگ سے پہلے ہر ماہ تھری یا ایک فلم تیار کر لیتے تھے۔ بارہ لائسنس یوں ہی آگئے۔ پھر ان کے پاس تین سٹوڈیو تھے۔ چار چکرروں کے لائسنس اُن سٹوڈیو کے حصے میں بھی آئے۔ بارہ لائسنس یہ ہو گئے۔ جو بیس لائسنس اگر وہ بازار میں بیچے تو ہر سال خرچے میں بیٹھے ٹھلے تیس لاکھ کی آمدنی ہو جاتی۔ مگر سیٹھ اتنے لالچی نہ تھے۔ انہیں قوم کا بھی خیال تھا۔ تین سٹوڈیو میں جو لوگ کام کر رہے تھے ان کی بیوی بچوں کا بھی خیال تھا۔ اس لئے وہ سال میں صرف بارہ لائسنس کا لے بازار میں بیچتے تھے اور بارہ کی تصویریں بناتے تھے۔ یہی سب جو منافع ہوتا تھا وہ اس کی ایک پانی ظلم میں نہیں لگاتے تھے۔ بلکہ اس سے زمین خریدتے تھے۔ مکان، جڑی بڑی بلڈنگیں۔ مٹا فو لاد کے حصے۔ روٹی کے مل کی ایکسٹی۔ شکر کی مل کی پارٹنرشپ۔ غرض کہ جہاں سرمایہ زیادہ محفوظ سمجھتے۔ وہاں اپنا منافع لگاتے تھے۔ اور یہ بات انہیں اُن کی میڈم بھائی سے نہیں۔ میڈم اُن کی بیوی نہ تھی۔ اُن کی بیوی تو کالیا دیوی روڈ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنے پانچ بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میڈم اُن کی دامستہ تھی۔ ان کی جان۔ اُن کی ڈارنگ۔ اور جب سے میڈم نے اُن کے کاروبار میں دل چسپی لینا شروع کی تھی، میڈم اُن کی عقل بھی تھی۔ سیٹھ بیتال بھائی اپنا اپنی عقل کا استعمال صرف خاص موقعوں پر کرتے تھے۔ کیونکہ سرمائے کے حصوں میں عقل کا ایک خاص کام کرتی ہے۔ ایک خاص حد کے بعد جب سرمایہ خرچ ہو جاتا ہے۔ تو پھر خود بخود بڑھتا ہی ہے۔ پھر عقل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پھر سرمایہ اور منافع کی اپنی عقل ہوتی ہے۔ جو خود بخود بڑھ

کھدائیں کی طرح کام کرتی تھی ہے۔

سیٹھ میتال بھائی بائیکڑیہ کا سرمایہ جب پچاس لاکھ سے تجاوز کر گیا۔ تو انہوں نے بھی سرمایہ کی اس خود رو عقل سے کام لینا شروع کیا۔ اتنا بڑا سرمایہ ہفت کے گولے کی طرح ہوتا ہے۔ جوں جوں اُسے گھماتے جاتے۔ یہ خود بخود ہفت کے گولے کی طرح بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اور اپنے گرد اور روپیہ سمیٹتا جاتا ہے۔

سیٹھ میتال بھائی بائیکڑیہ نے روپے کو منافع کی اس بڑی منزل پر پہنچا کر خود ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اور کاروبار زیادہ تر میڈم کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ خود اس وقت نہایت خوشگئی اور زندہ دلی سے بیٹھے ہوئے رسی میں ہار رہے تھے۔ اور میڈم کا انتظار کر رہے تھے۔ جو لالہ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کو لانے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ بٹا چاریہ کی نگاہ میڈم کی کرسی پر گئی جہاں اس وقت بائیکڑیہ سیٹھ کا نیا فلم ڈائریکٹر کرم میز پر جھڑپیں مٹایا ایک منٹ سے اُداس انداز میں رٹی کھیل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے شریخ ہوتا تھا۔ جیسے اُسے اس کھیل میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صرف وقت کاٹنے کے لئے یہاں بیٹھا ہے اور یہ صحیح بھی تھا۔ کرم کا دل اس وقت تاش کے چوں میں نہ تھا۔ وہ بھی لالہ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کی آمد کا منتظر تھا۔ کیونکہ سیٹھ میتال بھائی بائیکڑیہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ لالہ بھگت لال کے آتے ہی وہ اُسے اس کی نئی بچکپور کے لئے جو کرم سیٹھ صاحب کے لئے شروع کر رہا تھا ایک ہزار روپیہ دے دیگا۔ کرم کو سیٹھ میتال بھائی نے ایک قوی فلم بنانے کے لئے نوکر رکھا تھا۔ کیونکہ کرم فلمی حلقوں میں سوشلسٹ سمجھا جاتا تھا۔ وہ دھارم فلم انڈسٹری میں بیرونی بننے کے لئے آیا تھا۔ میانہ قد، خوب صورت کمانی چہرہ، فراخ ماتھا، گنگنہ لڑے بال۔ اُسے کسی بھی فلم کا ہیرو بنادینے کے لئے کافی تھے۔ فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے وہ اُردو تاتاری میں بھی ایک مستند حیثیت کا مالک تھا۔ اس لئے جب وہ فلم انڈسٹری میں آیا۔ تو شروع شروع میں اس کا بہت آدم بھگت ہوئی۔ وہ وہ فلموں کا بچے بعد درمگرے ہیرو بن گیا۔ مگر اوکاری اُسے اس نئی ر

جس قسم کی قلعہ دوزی اداکاری کی ضرورت تھی۔ وہ اس سے ہو نہیں سکی۔ اور جس قسم کی فطری اداکاری وہ پسند کرتا تھا اُسے یہاں کے فلم ڈائریکٹر گیسٹ لکھے تھے۔ پھر اداکاری چھوڑ کر اس نے گیت لکھنے کالے لکھے۔ کہانیاں لکھیں۔ تین چار فلمیں بھی ڈائریکٹ کر ڈالیں۔ مگر ان فلموں میں وہی سیسٹ تھی۔ یہ فلمیں عام راستوں سے اس قدر مٹی ہوتی تھیں ان میں گلے نہ تھے۔ ناج تو بالکل نہیں تھے۔ وہ ہاؤ ہولی کامیٹی بھی تھیں ان فلموں میں کوئی مسخر اپنی توند ہلا کے ہنسا نہ تھا۔ نہ کوئی ظریف جملہ کی سی مٹھیں لگائے آدمی اور آدمی انگریزی بولتا تھا۔ ان فلموں کا ماحول ایسا ٹیل اور گھنچو جیسے ہندوستان میں رہنے والے کروڑوں کسانوں اور غریب فردوروں کا ہوتا ہے۔ گروہ ایسے فیئر شاعرانہ، موضوع اس قدر روزمرہ کی بھینٹوں اور صورتوں کے ساتھ بندھا ہوا کہ فلم دیکھنے والے تو دو ہی دن میں ہلکے گئے اور تصویریں فیل ہو گئیں۔ اور وہ جو خوب صورت تھا۔ حسین تھا۔ جو اپنے وطن سے اپنا لوکا سا جسم۔ یوسف کاسٹن اور غالب کی سی نظر لایا تھا۔ جنگ کے آخری چار سالوں میں پچک کے زد گیا۔

اس وقت اس کی دائرہ می بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی پتلون پر سیل کے پچکے تھے۔ اور دوسرے نظر نہ آنے والے ٹانگے تھے۔ جنہیں اس کی درد مند بہن نے بڑی محنت سے سیاہا۔ سیٹھ جیٹاں بھائی بانکیز یا کچھ جیسا سوچ رہے تھے گویا جنگ کے بعد قوی موضوعات کا زمانہ آئے گا۔ اس لئے انہوں نے پہلے ہی سے سوچ بچھ کے اکرم کو اپنے ہاں دوسال کے کنٹریکٹ پر رکھ لیا۔ مگر اب وہ اکرم کی پچکس شروع کرنے میں بہت پچکا رہے تھے۔ جانے چلے نہ چلے۔ اس ملک میں جہاں دو آنے کے منافق کے لئے افراد اپنے ملک سے نڈاری کر جاتے ہیں! جانے اس ملک میں قوی موضوع کو لینے ہونے کوئی کچھ چلے گی بھی کہ نہیں.... کہ اُن کا حشر بھی اُن تصویروں کی طرح ہو گا جو اکرم نے اس سے پہلے بنائی تھیں سینہ چہ ماہ سے کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ اکرم کی پچر شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور اکرم پریشان تھا گویا اس کے پاس دوسال کا کنٹریکٹ تھا۔ لیکن جس ڈائریکٹر کے پاس پچر نہ ہو اس کے کنٹریکٹ کی

کیا حیثیت ہوتی ہے۔ یہ اگر اب ان چار سالوں میں خوب سمجھ چکا تھا۔ دیکھئے کج قیمت کیا رنگ لاتی ہے۔ آج سیٹھ نے اس کی کچھ شروع کرنے کے لئے اس سے ایک ہزار کے چیک کا وعدہ تو کیا ہے۔

بنا چارہ خوب جانتا تھا کہ اکرم کے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے۔ مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے اپنے فلم ڈائریکٹر شری جوشی جی بھی اسی چیک کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ری کھیل رہے تھے۔ جوشی جی بڑے سنجے ہوئے فلم ڈائریکٹر تھے۔ ان کی فلم ڈھونگی، ڈالی، ڈم ڈم، اور ڈڈاں ڈڈاں ڈڈاں عوام میں بے حد مقبول ہوئی تھیں۔ جوشی جی کی ہر فلم ڈال سے شروع ہوتی تھی، اور وہ اپنی فلموں میں عورت کے جسم کی نمائش کے بے متواں تھے۔ عورت کے بال، عورت کی آنکھیں، عورت کا سینہ، عورت کے بازو، اس کے کولے، رانیں، پنڈلیاں ہر چیز کی نمائش کرنے کے فائل تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا، اور وہ عورت کو باہل نکال کر کے فلمیں لے آتے تھے۔ کیا کروں سیٹھ؟ جوشی جی نے دنگی اٹھا کر رنگ لگاتے ہوئے کہا "سنسری کھینچی سے ڈر لگتا ہے۔ دروازہ ایسی پچھر بنائیں کہ قیامت تک نہ اترے!"

سیٹھ بیٹیاں بھائی نے اس کی ایک چٹکی جیتے ہوئے کہا "مگر جوشی جی تم نے اپنی تھی پچھر کا نام کیا سوچا ہے؟" "نام، ہم؟ جوشی جی نے میز پر زور سے ہاتھ مار کے کہا "اسے نام، اسے سیٹھ وہ ڈھونڈ نام لوں گا، وہ ڈھونڈ نام لوں گا، پھر یہ ایک رنگ کر پینے گئے سر پر ہاتھ بھیر کے بولے "ارے سیٹھ یہ ڈھونڈ نام خود کیا ہے؟ ڈھونگی ڈالی، ڈم ڈم، ڈڈاں ڈڈاں ڈڈاں اور ڈھونڈ!"

"ڈھونڈ کا مطلب کیا ہے؟" اکرم نے ذرا اک تیز قسم کی آزدگی سے پوچھا جس میں تھوڑی سی حقارت بھی شامل تھی "یہ ڈھونڈ کس زبان کا لفظ ہے؟"

"کسی زبان کا بھی ہو اپنے کو اس سے کیا ہے۔۔۔۔۔۔ جوشی جی گرج کے بولے "مگر اچھا لگتا ہے"

کہ نہیں۔ بولتے وقت منہ بھرتا ہے کہ نہیں۔ ڈمفو! ذرا بول کے دیکھو۔ ایسا سالا معلوم ہوتا ہے کسی نے منہ میں غبار رکھ دیا۔ ڈمفو!!

”واہ واہ میرے یار!“
جوشی جی نے خود اپنی پیٹھ کو کھینچی دی۔

بھٹا چاریہ زور سے بولا ”واہ! واہ! جوشی جی کیا نام سُجھا ہے۔ ڈم فو ایک دم نیا۔ ایک دم اور کھل ایک دم جنگلی!“

میز پر ڈانس ڈانسر کیتھر باورال بھی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا اور کنبھوں پر لابی لابی قلبیں بڑھا رکھی تھیں۔ اس کا چہرہ ایک دیے غار میں زندہ کتے کی طرح لبوتر اور کچکا ہوا تھا جسے غائباً چور مبینے سے گھبی پیٹ بھر کے کھانا نہ ملا ہو۔ مگر یہ بات نہیں تھی۔ باورال غلی صنت کے رقاصوں میں سب سے عمدہ اور بڑھیا رقاص مانا جاتا تھا۔ وہ ایک عمدہ غلیٹ میں رہتا تھا۔ ایک عمدہ کاریں گھومتا تھا۔ ایک عمدہ چوکری کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کاریں اور عمدہ تیں بدلنے میں اُسے یر پوٹے حاصل تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ وہ دنیا کی ہر قوم کی عورت چمک چکا ہے۔ اور ضیا امراض میں کوئی ایسا مرض نہیں جو اسے لاحق نہ ہوا ہو۔ اس کا چہرہ انہیں امراض کا بیتا جاگتا تھا تھا ”ڈمفو! پھر وہ بھی پھل پڑا۔ اور جوشی سے اتھلائے ہوئے کہنے لگا۔

ڈم فو۔ ڈم فو

بم فو۔ بم فو

کم کم گم گم۔ کم کم گم گم

ڈم فو!!!

کالی سے زرتیہ کا بھادوتا کے اس نے کہا۔ ایسی اسپیننی ٹینگنی دمن اس پر دوں گا کہ سارا بانی دڈکا

نئے دیر کو گے چکر کے رہ جائے۔ سیٹھ ڈم فوسیت عمدہ نام ہے :

اب میر پر صرف ایک آدمی خاموش تھا۔ بجن دت موسیقار یعنی سوزگ ٹائر کی طرح بجن دت کی ذہین آنکھیں کھ رہی تھیں۔ اور اکرم جانا تھا کہ اسے یہ نام پسند نہیں ہے۔ بجن دت ہندوستانی فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے اپنی قوی موسیقی کے بہترین ماہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے گاؤں گاؤں گھوم کے کوئی دو ہزار سے زیادہ لوگ گیت اور سینگلوں دھنیں جیج کی تھیں وہ جب فلم انڈسٹری میں آیا تھا تو اکرم کی طرح ایک آدمش۔ ایک خواب۔ ایک قوی فلسفہ۔ ایک سماجی مقصد۔ ایک نیا زاویہ نگاہ دے کے آیا تھا۔ جس تصویروں کی موسیقی مرتب کرنے کے بعد اس کے دل کی چنگاری روشن تھی۔ مگر چاندی کے ڈھیروں تلے دبی تھی۔ کیونکہ اس نے کامیابی کے لئے لوگ دھنوں میں فحش اور بازی گیت باندھے تھے۔ وہ دھنیں جس میں اس کے ملک کے کسانوں نے گندم کی فصل بولی تھی۔ دھان کے خوشہ لہرائے تھے وہ دھنیں جو کنواریوں کے ترنجن۔ دہلی کی ڈولی اور ماں کی لوری کے لئے وقف تھے۔ آج قصا بوں کی طرح کوٹھوں کا گوشت۔ مکر کا خم اور پٹالیوں کی گاؤں دی بج رہے تھے۔

بجن دت کو معلوم ہوا تھا کہ فلم انڈسٹری میں نہیں کسی بوجہ خانے میں لگسا ہے۔ مگر یہاں اُسے قوی موسیقی کو ذوق کرنے کے لئے چپاس ہزار روپے مل رہے تھے اور فلم کے باہر کوئی اُسے پاس دینے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے بہت عرصہ ہوا بجن دت نے سوچ بھ کے آٹھ بند کرنی۔ اپنے رواج کو تالا لگایا اپنے سماجی مقصد کو دھنوں گہری چاندی کی بھوت میں چھپا دیا۔ اور خود ہاتھ میں ہارمون کا بخیرے کر ان لوگ دھنوں کو ذوق کرنے میں لگ گیا۔ جنہیں اس نے اپنی جوانی کے بہترین ایام میں اس کاوش سے آشنا کیا تھا :

بجن دت نے دیکھی کا ایک بہت بڑا پیگ ایک ہی سانس میں ہلق میں اڑا لیا۔ اور آنکھیں نیچی کر کے ہلا کیونکہ اکرم اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ سدا پچھے (بہت عمدہ ہے) چلے گا !

سیٹھ بیتاں بھائی بانگڑیا نے خوش ہو کر جوشی جی کی طرف دیکھا۔ پھر مٹا پارس کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "بیتا
 کل سیٹھی خیر سے بہہ دے کہ وہ جوشی کی نئی فلم ڈرامہ دکھا اشتہار دے دے فلم یوز میں پورا مصروف کر دے"
 اکرم نے شرم سے سر جھکا لیا۔ کیا وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ کہیں بھاگ کے نہیں جاسکتا
 کیا وہ ایٹیں نہیں ڈھو سکتا۔ کیا وہ قلمی گیری نہیں کر سکتا۔ کیا وہ روٹی کی مل میں مزدوری نہیں کر سکتا۔ کیا
 وہ دھوک پر جہاز لوں کا کام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ————— بیک ایک اکرم نے محسوس کیا کہ وہ ان میں سے
 کوئی کام نہیں کر سکتا۔ وہ بیک ایک اڑیاں درگڑ کے خاموش ہو گیا۔ اور ایک پتہ اٹھانے لگا۔ جو کہ اجو کر
 تھا۔ جیسا کہ نہیں رہا تھا۔ تاش کا پتہ۔ زندگی کے ایک طرے لٹھے کی طرح اس پر نہیں رہا تھا بیک ایک کرم
 نے تاش میز پر بھینک دی۔ اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سیٹھ بیتاں بھائی گمراہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اکرم نے کہا "کچھ نہیں سیٹھ۔ سر میں درد ہو رہا
 ہے۔ اکرم یہ کہہ کر کہیں کے اس طرف کی کھڑکی میں چلا گیا۔ جو باہر بازار کی طرف نکلتی تھی۔ اس کھڑکی میں تھے
 وہ بازار کا دیکھ سکتا تھا۔ ایرانی کی دوکان فلم ایکسٹروں سے بھری پڑی تھی۔ پان دالے کی دوکان پر
 تین نئے کھڑے پان کھا رہے تھے۔ اور چند بے ٹکڑے ان کے گرد کھڑے بنس رہے تھے۔ سڑک کے
 پار پرانی موٹر وں کے پرزے بیچنے والا بچن سنگھ اپنی کھاٹ پر میٹھا میٹھا ڈنگ رہا تھا۔ ٹیلی فون کے بجھے کی
 نازوں پر کوسے بیٹھے تھے ان سے اوپر آسمان بے حد گدلا اور کشید تھا۔ اور اس آسمان کی دھندلی اڑ
 بدبوداری نشانیں ایک پیلا بد نما وجہوں والا پاند ایک جلی ہوئی روٹی کی طرح نظر آ رہا تھا۔

اکرم نے قدر سے اپنی ٹھیکیں نکالیں۔ وہ جانے تو کہاں جانے کھڑکی سے واپس چلا آیا
 بیتاں بھائی نے اس کے گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تہا را گلاس اسی طرح بھرا چڑا ہے"
 اکرم پر کرسی پر بیٹھ کر دیکھی بیٹھ لگا۔ دیکھی برف! زندگی کی طرح۔ ناکامی کی طرح اس کے گٹھے ہوئے کرے
 کی طرح۔ اچھی فلم کے خالی ہال کی طرح۔ محبوب کے آخری لمحہ کی طرح۔ موت کے جا رہے کی طرح۔ کیا

اتنی ساری تختیوں سے دس بجے کا ایک گھنٹہ ہوتا ہے ؟ مگر لوگ تو کہتے ہیں اس میں نشہ ہوتا ہے۔ آج نشہ کہاں ہے ؟

جھٹلا کے اکرم اٹھ کھڑا ہوا۔ مین اُسی وقت پلائی وڈ کے دروازے کی نگلی عورت اپنی جگہ سے ہٹی۔ قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ دروازہ کھلا اور سیٹھ بھگت لال ڈسٹری بیوٹر کو اس ترک و اعتشام سے داخل ہوا کہ لوگ اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔

سیٹھ بھگت لال کا چہرہ اس قدر گول تھا۔ گویا معلوم ہوتا تھا کسی نے پرکار رکھ کر دائرہ کھینچ دیا ہے۔ اُس کے چہرے کے نیچے کا جسد یعنی سینہ، مکر اور پیٹ بھی موٹاپے کی وجہ سے اس قدر گول تھے کہ اس کے چہرے اور پیٹ کو دیکھ کر لوں بھوس ہوتا تھا۔ گویا کسی نے بڑے دائرے کے اوپر ایک چھوٹا دائرہ رکھ دیا ہے۔ اگر سیٹھ بھگت لال جیو میٹری کی اشکال کا ہی مجموعہ ہوتے تو خیریت تھی، مگر وہ تو اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھے۔ وہ شمالی ہند کے سب سے بڑے ڈسٹری بیوٹر تھے۔ تن و توش ہی میں نہیں دولت کی فراوانی کے اعتبار سے بھی وہ سب سے بڑے تھے۔ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ سال میں چار بار بجی آتے تھے اور جب آتے تھے تو پورے پورے شہر کی سٹریٹوں کی طرح اُن سے جھٹ جاتے تھے۔ اس وقت بھی جب وہ اندر آئے تو دو چار صاحبوں کو ساتھ لے آئے۔ ایک تو اُن میں سے جو ناٹا سا۔ وُجے تھا اور جی کی سی آنکھوں والا آدمی تھا۔ وہ تو فوجی تھا۔ امرت سر کا ایک ایگزیکٹو تھا۔ امرتسر کا سب سے عمدہ سینما گھر اس کا تھا۔ وہ سراوہ جو کلمے رنگ کا، اونچے دانوں والا، نہایت ہی سیاہ بالوں والا۔ جن پر اس نے بہت زیادہ تیل چھڑ رکھا تھا۔ وہ جو گھڑے تھا۔ چور گھڑے کے وہ سینما تو احمد آباد میں تھے۔ ایک ناسک میں۔ اور ایک راج کوٹ میں تھا۔ چور گھڑے گہرات کا شہور ایگزیکٹو تھا۔ چور گھڑے کے ساتھ ایک ڈبلا پیلا دھوئی پہنے ہوئے اردو آدمی تھا۔ بٹشہ نے اُسے پہچان لیا۔ یہ سیٹھ امر چند تھے جو پُر میں اُن کے تین سینما تھے۔ اس کے علاوہ وہ کافی ہرجوں کا ہو پار بھی کرتے تھے۔ یہ بٹشہ کو اس لئے

معلوم تھا کہ سیٹھ امجد نے ایک دفعہ اس کے ساتھ دسکی پیٹے ہوئے غود بتایا تھا۔ کہ جب انہیں کالی مرحوں کے بیڑ پار میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے تو وہ اچھی کچریں حاصل کر کے اپنے سینا گروں میں چلاتے ہیں۔ اور جب نقصان ہوتا ہے یا کم فائدہ ہوتا ہے تو سنٹ یا دیوڑی دیوتاؤں کے قصوں والی تصویریں حاصل کرتے ہیں۔ اگر آج وہ خوشی ہی کی کچر لینے آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے، بھٹانے سوچا کہ اُن کا کالی مرحوں والا بیڑ پا اچھا چل رہا ہے۔ اور اگر وہ اکرم کی تصویرے کے جلتے ہیں تو بھوکہ کالی مرحوں کے بیڑ پار میں منہ ہے! اس چھوٹے سے کہیں میں اتنی کرسیاں نہ تھیں کہ سب لوگ وہاں بیٹھ سکتے۔ گو سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے بھر بھی سیٹھ بھگت لال نے یہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جیتا بھائی بانڈو بانڈو کر ساتھ ملے کہیں میں چلے گئے۔ جو میڈم کا کہیں تھا۔ میڈم کے کہیں میں جلتے ہی جیتا بھائی کو میڈم کی یاد آئی۔ بولے ”میڈم کہاں ہیں؟“ سیٹھ بھگت لال نے مشکرا کے کہا ”وہ تو اپنی سہیلی راج راج کے ہاں گئیں ہیں۔ مجھ سے کہا۔ آپ انہیں وہاں ٹیلی فون کریں۔ اگر کوئی کام ہو۔“

جیتا بھائی نے پوچھا ”چیک؟“

”ابھی دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سیٹھ بھگت لال نے چور گھڑے کو اندر بلایا۔ ایک لمحہ جیتا بھائی کی طرف دیکھا پھر چور گھڑے کو لے کر ”ایک منٹ کے لئے صاف کرنا“ کہہ کر وہ چور گھڑے کو لے کر سب سے اندر کے کہیں میں چلے گئے۔ جو میڈم کے کہیں سے ملحق تھا جس میں سیٹھ جیتا بھائی خود بیٹھتے تھے۔ اندر جا کے بھگت لال نے چور گھڑے سے کہا ”اسے پار مجھے یہاں آکے دوایا۔ جیتا بھائی اگر ایک ہزار روپیہ دینا ہے نقد، تم اس رقم میں سے دے دو۔“

چور گھڑے بولا ”خوشی جی کی تصویر پر دونوں گا۔“

”اچھا۔ اچھا! بھگت لال بے صبری سے بولے۔“

چور گھڑے پہلے ہی سے حجب میں ایک ہزار کی رقم لے کے آیا تھا۔ وہ یہ سب باتیں

خوب جانتا تھا کہ کیسے بات ہوگی۔ اُس نے اُہستہ سے نوسو کے نوٹ گن کے بھگت لال کو دئے اور دس کے پانچ نوٹ گن کے دئے۔

بھگت لال نے کہا "یہ توکل نوسو پچاس ہوئے۔"

"پچاس دیکھی کے لئے رکھ لئے؟ چور گھر نے مسکرا کے کہا "نہیں پرچہ کیا۔ ابھی قورات جو ان ہے اور ان "یہ کہہ کر چور گھر نے فوراً جیب سے ہزار روپے کی ٹائپ شدہ رسید نکالی۔ اور نوٹسین میں بھگت لال کے آگے بڑھا دیا۔ بھگت لال نے ایک ہزار کی رسید پر دیکھا کر دئے اور نوسو پچاس کے نوٹ اپنی جیب میں ڈال لئے۔ اس کے بعد اس نے چور گھر سے کہا "ذرا باہر جا کے بیتال بھائی کو یہاں بھیج دو۔"

بیتال بھائی اندر آیا۔ سیٹھ بھگت لال نے اُسے ساڑھے آٹھ سو روپے دئے۔

بیتال بھائی نے نوٹ گن کے کہا مگر یہ تو ساڑھے آٹھ سو ہی ہیں۔ سیٹھ "حم نے تو ایک ہزار۔" سیٹھ بھگت لال نے بات کاٹ کے فوراً کہا "بھئی سے ڈرافٹ نہیں آیا ہے۔ یہ تو میں اپنی جیب سے لے رہا ہوں۔ میں نے کہا تھا ہی شوٹنگ ڈر کے۔"

پھر اُس نے اپنی جیب سے ایک ہزار کی ٹائپ شدہ رسید نکالی۔ اور اس پر بالکل ایک دیکھا لے لئے۔ بیتال بھائی نے روپے جیب میں رکھے اور سیٹھ کو وہی چور گھر بیڈم کی کہیں میں جوشی جی کو بھلا کے کہنے لگے "یہ ساڑھے سات سو اس وقت ملے ہیں۔ یہ لے جاؤ اور اس سے ابھی کام چلاؤ۔"

جوشی نے کہا "سیٹھ ہزار کا خرچہ ہے۔ ساڑھے سات سو میں کیسے چلے گا؟"

"ابھی چلاؤ تا بیتال بھائی نے جوشی کو آنکھ مار کے کہا "کل بے سوں تک اور کرنا ہوں۔"

جوشی نے سادھے جیب میں ڈالتے چلے گئے "ایسے کیسے چلیں گا سیٹھ۔ وہ جو تھوڑی سی رہا ہے رکھا ہے۔ سیٹھ اُسے لے لے گا۔"

مکے مکہ ہے۔ روپیہ آج کل: ہیکڑ یا سینہ ہونہ ہیکے ہونے: سارے بھگت لال نے سارے مکے مکہ
 دے کے ہزار کی رسید لے لی ہے تھوڑے۔ یہ کوئی دھندے کا زمانہ ہے۔ اب میں ہزار روپیہ مکہ مکہ پہنچا
 کروں۔ اچھا۔ لے۔ تو بھی اس ہزار کی رسید پر دستخط کر دے گا:۔
 جوشی جی نے پچھلے سے رسید پر دستخط کر دئے۔

باہر کی گھین میں آکے جوشی نے بھٹا کو آنکھ مار دی۔ بھٹا اور وہ دونوں پچھلے سے کہیں سے کھسک گئے، اُن کا
 خیال تھا کہ باکسی کو معلوم نہیں ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ سب جانتے تھے۔ وہ جو ریل کیل رہے تھے
 وہ سب سے زیادہ جانتے تھے۔ مگر چپ تھے۔

جوشی نے بھٹا کو پانسو روپے دے کر کہا: ”بس یہی شے دے دے گی۔“
 ”مگر؟“

جوشی نے بھٹا کو آنکھ مار کے کہا: ”اگر تم کچھ نہیں۔ اب اسی میں کام چلائے، ہزار کی رقم اسی میں پورا کرنا ہوگی۔“
 ”ایک ہزار کی رسید بھی مجھے چاہئے۔“

”بہت اچھا جناب کل تک وہ دونوں گا:۔ بھٹا نے سر ہٹا کے بڑی خوش اسلوبی سے کہا جیسے سب کچھ
 ٹھیک ہو گیا ہو۔ اس کے بعد اس نے گھین کے اندر بیٹھے ہوئے باور لال کو بل کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ
 دے پے اور کہا: ”مٹی ساڑھے چار سو ملے ہیں۔ اس میں پچاس ہیں نے شوٹنگ کے لئے رکھ لئے ہیں
 باقی یہ چار سو روپے تم لوگوں میں بانٹ دو۔“

”انہیں چار سو میں سب کچھ:۔ باور لال نے سنی خیر نگاہوں سے بھٹا چار۔ یہ کی طرح دیکھ کر کہا
 ”جی ہاں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہزار کی رسید بھی انہی سے بنے گی۔ لوگیاں تو سب تمہاری بھین ہیں
 نا؟“ بھٹا نے پوچھا: ”اُن سے زیادہ رقم کی رسید بھی حاصل کر سکو گے؟“

باور لال نے اپنی جگہ سے جیسا وہ دھڑکا تھا۔ بال میں مٹی ہوئی لوگوں کی طرح نظر دوڑائی۔ بولا: ”نہیں“

کے حوا میں سب کو جانتا ہوں :

”رفیقہ کو میں ٹھیک کر لوں گا؟“ بھٹا چاریہ نے مسکرا کر کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ بابو لال بولا ”میں لڑکیوں کو موٹروں میں بٹھاتا ہوں“

چھ لڑکیاں تھیں۔ چھ مرد تھے۔ دوسو موٹروں میں ٹھونس ٹھانس کے کسی طرح بیٹھ گئے۔ لڑکیوں نے پہلے ائی۔ اے۔ ہاں؟ کی۔ کچھ روکھے سے قہقہے لگائے۔ لیکن ”ہنو“، ”چھوڑو“، ”مر کم بخت“ کے بعد سب سلسلے سے ٹھکانے پر لگ گئیں۔ بس ایک رفیقہ تھی۔ جو سب سے الگ بیٹھی تھی۔ موٹر واحد سے نکلی۔ غلاموں سڑک پر پہنچی۔ ”تک برٹ“ مپا کر کے شواجی پارک کی طرف حوم گئی۔ تو شواجی لڑکی نے جو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے مار بھگت لال کی آغوش میں بیٹھی تھی۔ اس کے پیٹ میں لٹکی چھو کر بولی ”ایسے پیٹئے۔ تیرے پیٹ میں کتنی بولے؟“

سب لوگ ہنسنے لگے۔ رفیقہ جل کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چور گھڑے بار بار اس پر گرا کر پڑتا تھا۔ اور دوسمٹ کر الگ بول جاتی تھی۔ جیتال بھائی اُس لڑکی کو گود میں لئے ہوئے تھے جو دس برس سے غلامانہ شری میں کام کر رہی تھی۔ وہ جیتال بھائی کو خوب اچھی طرح جانتی تھی۔ واقعی اچھی طرح جانتی تھی جیتال بھائی اور دوسرے لوگ بھی دیکھ رہے تھے۔ کہ چور گھڑے کا سادہ کھمچ نہیں رہا ہے۔ مگر وہ سب لوگ غلامش تھے۔ پھر باندہ کی سجدہ گئی۔ سانا کروڑ کا شیشن گیا۔ جب موٹریں کالینا کی سڑک سے گئی، آگے پہلی تو رفیقہ نے چلو کے کہا۔ یاد کرنا سنو ڈیو ہے؟ بھگت لال نے چور گھڑے کی طرف چہرہ نکھا ہوں سے۔ نکھا۔ چور گھڑے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا: ”ادھر سنو ڈیو تو کوئی نہیں ہے۔ بہار جیل ہے۔“

بہار جیل پر ہم کیا کرنے جا رہے ہیں؟
 ہمیں تو ٹرائی ہو گئی ”ایک لڑکی نے جس کے کہا۔“

اور اس کی آواز مردانہ و عورتوں کے بلند بانگ فہمہوں میں ڈوب گئی۔

رفیہ نے کہا: گاڑی روک دو۔

گاڑی چلتی رہی۔

رفیہ نے چلا کے کہا: گاڑی روک دو۔ نہیں تو میں شور مچاؤں گی۔

باکڑیا نے غصے سے بابولال کی طرف دیکھا جو ایک ہاتھ سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے

اپنی من میں مٹی بھری لڑکی کی کمرشل رہا تھا۔ بابولال نے اپنے شانے ہلا کے باکڑیا سے کہا: سیٹھ

اسے بتا لایا تھا۔ کہتا تھا میں مجھ لوں گا اس سے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

باکڑیا نے بابولال سے کہا: گاڑی روک دو بابولال۔ بائی کو بلانے دو۔ رفیہ بندی سے دروازہ کھول

کر اتر گئی۔ گاڑی آگے چل دی۔ ایک لڑکی غصے سے چلا کے بولی۔ بڑی شریف نادبی تھی ہے۔ دوسری

بولی تھی تھی آئی ہے۔ جو۔ چار چھ ماہ میں جب جم کے فاقے لگیں گے پھر خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ سب

سننے لگے۔ گاڑیوں کی آواز رفیہ سے دور ہوئی گئی۔ رفیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آج میرے گھر

میں پھر کو نہیں ہے۔ اسے اپنی بہن کے پانچ بچوں کا خیال آیا۔ تم کیوں مر گئیں میری بہن۔ اُس

مرحوم بہن کو بد دعا دی۔ تم کیوں مر گئے میرے شوہر! اس جوانی میں۔ اس نے اپنے مرحوم شوہر کو بد دعا

دی۔ تم کیوں مر گئے میرے باپ۔ اُس نے اپنے مرحوم باپ کو بد دعا دی۔ اب کہاں سے بستے بڑے

کنبد داؤں کو ہاؤں۔ میرے پاس تو اس جسم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور تلخ لہجے میں نے شوقیہ ہی سکول

میں یوں ہی سیکھ لیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تلخ کافن پہننے سے پہلے جسم جینا ہوگا۔ میرے شوہر جے

باپ۔ میری بہن۔ میرے خدا۔ میرے کنبے والو۔ میرے خاندان والو۔ میری بولی بولی کاٹ کے

کھانے والو تم پر لعنت۔

جب وہ ایک درخت سے لگ کر خوب اپنی طرح سب کو گایاں لے رہی تو پھر اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے

اور اپنے آپ کو کھلانے ہوئے اور کالینا کی لڑکھاپس چلتے ہوئے اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہنے لگی۔ آج بھوک ہو تو کیا ہے۔ کام کم کتا ہے تو کیا ہے۔ کبھی کبھی تو کتا ہے۔ اور عزت سے۔ ہے۔ اور حبیب بے عزتی سے کتا ہے۔ تو تم نہیں لیتیں! تو اس میں مر جانے کی کون سی بات ہے۔ ایک دن دنیا دیکھے گی۔ دنیا تمہاری قدر کرے گی۔ ایک دن تم اس سارے جنجال سے نکل جاؤ گی۔ میں کسی طرح پالا کی سے۔ کسی کو سبلا پھسلا کے ایک ایک بڑا سا رول حاصل کر لو، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں۔ ہاں! میں یہی کر دوں گی۔ رضیہ اپنے دل کے اندر کی دوسری رضیہ کو کھلانے لگی۔ میں اپنی عصمت تھوڑے بچوں کی۔ ان سستی لڑکیوں کی طرح۔ مگر میں ذرا چالاکی اور ہوشیاری سے کام لے کے کسی ٹائمر کیڑ کو بناؤں گی۔ اور اس سے ایک بڑا سا رول لے کر اُسے وعدہ بتا دوں گی۔ پھر حبیب میں مشہور ہو جاؤں گی۔ پھر مجھے کون ہاتھ لگ سکے گا۔ رضیہ اپنی شطرنج کی چال پر خودی مسکراتے لگی۔ اور تیز تیز قدموں سے واپس چلنے لگی۔

ادھر ہاکڑا سیٹھ کی گاڑی بیدھیل کی طرٹ گئی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد لاہر میٹم کی
 جیگر نو بھارت پر دو گمش کے باہر کے ٹکی گاڑی میں سے میٹم دو سڑیوں کو لے کے اتری۔ راج لٹا
 اور شمشاد۔ دونوں ظلم اند شری کی اولاد ہے کی سر ڈنیں لگی جاتی تھیں۔ جو بچی وہ گاڑی سے اُتریں
 تیر خوشیوں کے جھوٹے تھوڑے ایرانی دستروں تک اُلتے گئے اور راہ چلتے لوگ جو مسنون پرانی
 ڈبل دولی کی باس۔ بیڑیوں کے پرانے جہاز کی مشد اور دیں پھر کاٹے کی طرح اُلتی ہوئی دستروں کی ٹیلی پکا
 کی کماند سے وقف تھے۔ یہ ایک بکرار دیکھنے لگے۔ یہ خوش وگد مرے آئی تھی۔ مگر اس سے چیز کہ وہ
 کچھ دیکھ سکتے۔ ریشمی لباسوں میں سرساقی ہوئی سیرتیں میٹم کے ساتھ نو بھارت پر دو گمش کے ان میں
 داخل ہو گئے۔ جہاں جوشی جی کے کہیں میں عزت کرم اور بٹھا پارہ۔ دو ایس ایسے ہوئے جہازوں کی
 طرح بڑی بے دلی سے تاش کے پتے پھینک رہے تھے کہیں نہیں رہے تھے۔ پھینک رہے تھے جہاز کے ہوتے
 رضی گئی تھی اور کرم کے ہاتھ سے ہز کا چیک۔ اس لئے زندگی کی تاش کا ہر پتہ چاہے وہ کئی ہو یا کئی ہوتا
 کرم اور میٹم کے لئے ایک سی حیرت رکھتا تھا اسی لئے جب میٹم راج کا اور شمشاد کو لے کے اندر آئی تو کرم
 ہان بوجھ کے نہیں اٹھا۔ اگر وہ لوگ اس کی بے عزتی کر سکتے ہیں تو وہ بھی اس کی بے عزتی کر سکتے ہیں۔

روپے والے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ مگر بڑا کھڑا ہو گیا۔ میڈم نے کرسی پر سر ہٹا کئے اپنے جام میں خرقہ اکرم کی طرف دیکھا۔ اور سمجھ گئی کہ کیا ماجرا ہے۔ اس بے چارے کو آج بھی ہزار کا چیک نہیں ملا۔ اس نے اکرم سے بات بھی نہیں کی۔ وہ بھٹا سے مخاطب ہو کے بولی۔

”سیٹھ کہاں گئے ہیں؟“

”سٹوڈیو! بھٹا چاریہ نے موڈ بانہ لہجے میں کہا۔

”ہاں وہ اس نئے سٹوڈیو میں گئے ہیں۔ جو بہار جیل کے کنارے تیار ہو رہا ہے۔“ اکرم نے دسکی کے پیکی طرف بڑبڑ غور سے دیکھ کر کہا: ”ساتھ میں چھ لڑکیاں بھی تھیں۔“

میڈم سب سمجھ گئی۔ مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ بھٹا سے پوچھنے لگی: ”اور کون کون تھا؟“

بھٹا کا ہنسی ہوئی آواز میں بولا: ”لالہ بھگت لال تھے۔ شری چور گھڑے تھے۔ بابو لال تھے۔ بجن دت تھے۔“

اکرم نے غصے سے کہا: ”اور اپنے ڈائریکٹر خوشی جی کا نام کیوں نہیں لیتے جو جن کے بغیر بہار جیل کا کوئی پروگرام مکمل نہیں ہو سکتا؟“

میڈم پھر اکرم سے کچھ نہیں بولی۔ اس نے اپنے بونٹ چبائے اپنے فزاک کو گردن کے قریب سے ٹھیک کیا۔ یہ میڈم کی عادت تھی۔ جب اسے غصہ آتا۔ یا جب وہ کسی گہری سوچ میں ہوتی یا جب کبھی بزنس میں وہ کوئی نیا داؤں کیلئے کو ہوتی وہ اس غصے پہلے بالکل بے اختیار ہو کر بالکل غیر شعوری طور پر اپنی گردن کے قریب سے فزاک کو ٹھیک کرتی تھی۔ فزاک میں کوئی نقص ہوتا ہو۔ گردن کے قریب فزاک میں چاہے ایک بل یا ایک چٹ بھی نہ ہو۔ مگر میڈم اپنا فزاک ضرور ٹھیک کرے گی۔ یہ اعلان ہوتا تھا کہ میڈم کو غصہ آیا ہے یا سنبل کے شیو نیا داؤں آیا ہے۔

مگر میڈم نے اس وقت کچھ نہ کہا۔ اس نے اپنے پتلے باریک سُرخ بونٹ ایک دوسرے کے نیچے زور سے دبا لئے اور غصے کو تپتی ہوئی راج دا اور شمشاد کو لے کر اپنی کین میں چلی گئی کیوں کہ

اسے اپنی اگلی دونوں کچھروں کے لئے راج دا اور شاد سے فیصلہ کرنا تھا۔ اُن کے اندر چلے جانے کے بعد اکرم نے ایک گھونٹ بہت آہستہ آہستہ سے پیا۔ جیسے شراب کی تلخی ہر قطرے میں سے کشید ہو کے منظر اور مصفا ہونے کے اس کی زبان پر آ رہی ہو۔

واہ! واہ! کیا تلخی ہے! میڈم کے موڈ کی طرح اس وقت اس میں کتنا غصہ ہے۔ جیسے یہ اس کی اپنے دانتوں سے میری زبان کو کاٹ رہی ہو۔

بھٹا چار یہ چُپ تھا وہ ابھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ اس نے اپنے سے بڑوں کے سامنے شراب بھی نہیں پی سکتا تھا۔

اپنے سے بڑوں سے بہت اچھیل پر دواو عشرت بھی نہ دے سکتا تھا۔ کوئی کیسی ہی غلط بات کیوں نہ کہہ دے اس کا فرض تھا کہ وہ ہر ایک کی اہل میں اہل ملائے اسسٹنٹ کا بھلا اور کام بھی کیا ہوتا ہے۔ یوں کہنے اور کرنے کو تو کام بہت سے ہیں۔ لیکن اگر اسسٹنٹ ڈائریکٹر یہ کام نہیں کر سکتا تو پھر بھوہو کسی کام کا نہیں۔

”بھٹا! اکرم نے اپنی آنکھیں بھٹا چار یہ کی سینک پر جلتے ہوئے کہا
 ”یہ جو سُرخ و سپید عورت اس کیسین کے اندر گئی ہے۔ جس کے بال سنبلے ہیں۔ جس کی دو ٹوٹیاں ہیں
 جو ہمیشہ تنگ فراک پہنتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں میرے کی دو انگوٹھیاں چمک رہی ہیں۔ یہ مسامی
 میڈم ہے۔“

بھٹا نے کہا ”میں جانتا ہوں۔“

”تم شک نہیں جانتے۔ کچھ نہیں جانتے۔“ اکرم نے انکار میں نیوے سے سر ہلکے کہا ”یہ ہماری میڈم
 ہے۔ اس کا نام میں نہیں جانتا۔ مگر برسوں سے لوگ اسے میڈم کہتے ہیں۔ اس نے ہم بھی گراؤ میڈم
 کہیں تو کیا ہرج ہے۔ یہ میڈم جو ہے نا۔ اصل میں اس فلم کمپنی کی ڈیپٹی مینجنگ ہے۔ اس دفتر کی

ہر پرائیڈ ہے۔ اس کی باہمی خوب صورتی پر نہ بلاؤ۔ اوپر سے یہ جتنی نرم دکھائی دیتی ہے۔ اندر سے اتنی ہی سخت ہے۔ اس نے سپر سوتوں کے سے واسوں کی چلتی ہوئی سکراہٹ میرے کی کئی کی طرف سے سخت ہے۔ اس سکراہٹ کو آج تک کوئی نہیں کاٹ سکا ہے۔ بڑے بڑے بلند ہانگ لہجے والے ہلاک بچائی۔ سنڈی گرنج۔ گرانی پاکٹ مار اور مارڈاڑی خانوں غپ تے مگر خود کٹ کر چلے گئے۔ دراصل اس سکراہٹ میں میڈم کا کوئی تصور نہیں۔ کبھی یہ سکراہٹ بڑی مصلحتی۔ نرم تھی۔ بھولی بھائی تھی۔ کبھی اس میں پھول کی پتیوں کی سی نرمی اور پیار کی کوئلوں کی سی ناز کی تھی مگر آہستہ آہستہ یہ سکراہٹ سخت ہوتی گئی۔ جس روز میڈم کے ماں باپ مر گئے اور اس کے چلنے لگنے دھڑکنے پٹیاں اس کی سکراہٹ نے اوپر سے نرم رہنا اور اندر سے سخت ہو جانا سیکھ لیا۔ اور جس روز اس کے چلنے لگنے سے چھ سو روپے میں ایک سکھ ڈرائیو کے ہاتھ فروخت کر دیا اس روز اس کی سکراہٹ کے اوپر آنسوؤں کے ہیرے پڑنے لگے لیکن اندر سے یہ سکراہٹ اب بے کی طرح سخت ہوتی گئی۔ پھر جب وہ سکھ ڈرائیو روس کی عیاشی میں اس سے اپنی رقم وصول کر چکا تو اس نے اسے اپنی کے ایک ٹپے بانکے پاس آٹھ سو روپے فروخت کر دیا۔ تو — تو — تو اس سکراہٹ میں میرے کی کئی کئی جگہ پر بھٹا:

تبی! بٹا بڑی نرمی سے اور آہستہ سے بڑا "کھین کھین میں میڈم نہ سن لے"

"اب اس سکراہٹ کو کوئی نہیں کاٹ سکتا: اکرم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے انکار میں شرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف جھلا کر کہا "اپنی چھوٹی سی زندگی میں میڈم نے نہ کر نہیں سکا اگر دنیا سیکھ لیا ہے۔ اسے جلد معلوم ہو گیا۔ کبھی میں نرم دل خورتوں کے لئے کئی جگہ نہیں ہے خصوصاً ایسی خورتوں کے لئے جن کا کوئی گھر نہ ہو۔ میڈم کا کوئی گھر نہیں ہے: اکرم نے زور زور سے ہلکے کہہ کر تم کیا کہتے ہو بٹا۔ مگر کیا مکان سے ہوتا ہے۔ کروں سے۔ نیلی فون سے۔ ریلوے گرام اور ریلوے پٹر سے ہوتا ہے۔ مگر کیا غلوں، گبنوں، روشنی کے فیتوں اور مٹی کی پلیٹوں سے ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں آپ

کو ایک ہی بازار میں مل سکتی ہیں۔ مگر اگر وہ بازار میں فرق ہے بھائی !

بھائی نے کہا - آہستہ پورے۔ میڈم کہیں سن لیں گی :

”ٹیسے۔ میں اسے سنانا چاہتا ہوں۔ ساری دنیا کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ میڈم کا کوئی گھر نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے کبھی کوئی گھر نہیں بنایا۔ کیونکہ گھر بنانے کا حق اُس سے شروع میں ہی سے چھین دیا گیا تھا اب وہ کیا کرے۔ میڈم۔ میڈم بڑی چالاک ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ ایک گھر نہیں بنا سکتی تو ایک آفس تو بنا سکتی ہے۔ اُس نے سوچا کیا ہوا۔ اگر اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس کی پاس پیسے جیسے تخت۔ لیکن تاباں اور درخشاں سکراہٹ تو ہے۔ پیسے کی کتنی تو فواد کو بھی کاٹ سکتی ہے دماغ کا دل کیا چیز ہے۔ اس نے تو میڈم نے اس تہم کو ایک تہیہ کی طرح استعمال کر کے دھیرے دھیرے آگے بڑھنا شروع کیا۔ آں۔ مگر اس کا دھیان نہ ہو۔ شروع شروع میں اُسے ناکامیاں بھی ہوئیں مگر آگے بڑھنا کوئی خالی کام نہیں ہے۔ مگر میڈم نے سب کو کاٹ کے پسینہ دیا۔ اور آخر میں سونہ بانکڑا سے محبت کرانے میں کامیاب ہو گئی :

”محبت کرانا کیا ہوتا ہے“ بھائی کو ذرا دل چسپی محسوس ہوئی کیوں کہ اُسے اپنی رضیہ یاد آ رہی تھی۔

اکرم خود ہنسا۔ بولا : ”ہنسو نہیں۔ محبت کرانے پر ہنسو نہیں۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آدمی اگر خود کسی سے محبت نہ کرے۔ بلکہ اپنی چالاکی سے اپنے سے محبت کرنے پر مجبور کرے تو اسے محبت کرانا نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ سونہ بانکڑا کا خیال تھا کہ انہوں نے خود میڈم سے محبت کی ہے۔ حالانکہ سونہ بانکڑا بھی کہ کس جنم سے اس نے بانکڑا سے محبت کرانی تھی۔ اس پورے معاملے میں وہ بالکل ٹھنڈی رہی۔ وہ پہلے آگ۔۔۔۔۔ اندر سے ہرقت۔۔۔۔۔ ایک روز سونہ بانکڑا نے گھٹے ٹیکہ ڈنے اور پھر فکری۔۔۔

چراغ و خیر تین شواہد کا ایسا کامکان۔ بہت ہڑ باغ۔ باغ سے پرے جے شہر پہنچوں میرا جیل ہوئی زمین سب میڈم کے جتنے میں آئی۔ اور وہ چراغوں کی رہنے والی تھی اور شواہد اور زمین پہنچی تھی اب موند لگ

پہننے کی اور وقت بے وقت انگریزی بولنے پر اصرار کرنے لگی۔

دیکھو بٹلر میڈم سے سختی کیجو۔ میڈم خود اس قدر بصورت ہے کہ چاہے تو آج سرخ بن سکتی ہے مگر میڈم کو سرخ بننے کا شوق نہیں ہے۔ اسے صرف روپیا کھانے کا شوق ہے۔ اپنی چھٹی سی ٹرس ہی دیکھو۔ لاکھوں روپہ اکٹھا کر لیا ہے۔ روپے کے معاملے میں میڈم بہت محتاط ہے اور کیوں نہ ہو وہ میسری طرح چند ہیں۔ جس نے دس لاکھ روپے بے کار ملک اور عوام کی خدمت کرنے والی تصویروں میں گورڈیا۔ کون چاہتا ہے ملک اور قوم کی خدمت کرنے والی تصویروں کو دیکھنا؟ نعمت ہے میسری عقل پر میڈم بہت سمجھ دار ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ زندگی نے خود جوتے مار کر اسے سمجھا دیا ہے۔ وہ وقت وہ کیسے بھول سکتی ہے۔ جب اُسے ایک بار اور دو بار نہیں بلکہ سہ بار اور چار بار رد پور کے عوض بھاگایا۔ پھر وہ چیز جو اس کی شخصیت سے اس کی ذات سے اُس کے فن سے۔ اس کی عصمت سے اس کے اس باپ اور خاندان والوں کے پیار سے اُس کے پہلے اور آخری معاشقے سے زیادہ قیمتی ہو۔ وہ کیوں اسے خریداں نہ سمجھے۔ وہ کیوں اس روپے کی ایک ایک پائی کو اپنے سینے سے نہ لٹکے رکھے۔ میڈم کی بخوشی دہاں ایک طرح اس کی ممانعت ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ وہ دن واپس آئیں جب کوئی اُسے ترازو میں تول لے سکے۔ جیسے وہ پروڈیوسر اور فنانسر لوگ آج بھے ترازو میں تول لے رہے ہیں۔ ناکام بچروں کا ڈاکٹر کی طرح وہ نہیں چاہتی کہ اب پھر کوئی اس کی عزت اس نگاہ سے دیکھے جیسے قصاب کسی بھی موٹی ہڈی بکری کی کمر دیکھ کے اندازہ لگا کہ ہے کہ اس میں سے کتنا گوشت نکالے گا جیسے یہ لوگ میسری طنز دیکھ کے اندازہ لگاتے ہیں کہ اب اس کی عقل کی ہڈی پر کتنا گوشت باقی رہ گیا ہے۔ اور کیا اب یہ کامیاب بکری نہ لے سکے گا یا نہیں اس لئے تو آج بالکل لپٹنے جی جی کو چیک دے دیا۔ اس لئے تو میڈم اب خود اندازے لگاتی ہے۔ خود تولتی ہے۔ اور پھر ٹری اصیاط سے چیک لگتی ہے۔ جی تو لوگ کہتے ہیں کہ میڈم کی محابوں میں اس کے جسم میں میرے ٹی ٹی کی کاٹ ہے۔ اور کوئی اُسے دھکی نہیں دے سکتا۔ اور کوئی اس کے

جذبات سے نہیں کھیل سکتا۔ مگر اس میں بھی میڈم کا کوئی تصور نہیں۔ اکرم ذرا جگ گیا۔ اوپر دیکھنے لگا ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر ایک عجیب نئی سی آگئی۔ اور وہ دھیرے دھیرے کہنے لگا۔۔۔ ”بھئی میڈم کے پاس بھی خواب تھے۔ خوابوں میں کھٹے ملا پھل تھے۔ ترم و حیا کی طرح سٹھنے والے جذبات تھے۔ مگر زندگی نے آہستہ آہستہ پیٹ پیٹ کر اس کے سارے جذبات کا پانی نکال دیا۔ اب میڈم کی روح ایک کھائے ہوئے چڑے کا ٹکڑا ہے جس کے اندر پانی کی ایک بوند بھی نہیں کہیں سے بچے اور باؤ آنسوؤں کا ایک قطرہ نہ کھٹکے گا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ بھلا۔ کہ ایک عورت۔ ایک خوب صورت عورت کی آنکھ کا پانی مرجائے!.... مگر کس کے لئے ٹھہری ہے؟ سہلج کا پٹھر بچے والوں کے لئے تو نہیں ہے؟“

میڈم نے بیک ایک اندر آ کے کہا ”کیا بات ہو رہی ہے؟“
 ”آپ کے کردار پر اس بے چارے کو کچھ دے رہا تھا میڈم! اکرم نے وہی کی کا آخری قطرہ لپٹے مطلق میں اُتار کے مخلص مانی کر دیا۔“

”اور سچو گے؟“ میڈم بغیر کسی تہمت کے بولی۔

”نہیں۔ اکرم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔“

میڈم نے بھٹا سے کہا ”انہیں مگر چھوڑ آؤ میری جیکر لے جاؤ۔“ اور آپ۔“ بھٹا چار دیوے پر چھا۔

”میں ششاد کی ننگن میں چلی جاؤں گی۔“

اکرم نے کہا ”یہ کہیں نہیں جائیں گی۔ رات بھر میں میچہ کر کر اڑھیں گی۔ جب تک اُن کے میٹھ نہیں آتے

.... ڈم فو.... ڈم فو.... بہت عمدہ نام ہے۔ میڈم۔۔۔ جوشی جی کے کچر کا نام ہے۔ اب میں بھی

ایسی ہی کچر بناؤں گا؟

”حرام زادہ، حرام زادہ۔ کیسا نام رہے گا یہ میڈم....؟“

میڈم اس لئے باہر نہیں آئی تھی کہ وہ اکرم کا تجربہ سننے کے لئے بے قرار تھی یا لے کر مے کسی طرح کی ہمدردی تھی۔ دراصل اپنے کہیں کے اندر وہ جو معاملہ ان دو بیرونیوں سے طے کر رہی تھی۔ اس میں ایک اڑچن آڑی تھی۔ وہ دونوں بیرونیوں اس کی اگلی پچھلی کام کر رہی تھیں وہ چاہتی تھیں کہ وہ دونوں کو الگ بلا کے معاملہ کر سکتی تھی۔ مگر چونکہ دونوں کا کام ایک ہی تصویر میں تھا۔ ان کا تھا اور وہ دونوں سہیلیاں تھیں۔ اول درجے میں شمار ہوتی تھیں۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ معاملے کی رقم ایک دوسرے سے چھپی رہیں۔ اگر وہ ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم پورا مٹنی کر لیتی۔ تو ایک نہ ایک دن یہ بھید کھل جاتا۔ اور پھر کم رقم لینے والی بیرونی پچھلے بیچ ہی میں وہ فساد شروع کرتی۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ میڈم نے کچھ سوچ کے ہی دونوں کو اکٹھے بلا کے دونوں سے ایک ہی وقت میں فیصلہ کرنے کا اقدام کیا تھا۔ اب نصیب یہ آڑی تھی کہ دونوں بیرونیوں پچاس پچاس ہزار سے کم لینے پر تیار نہ تھیں۔ اور یہ رقم میڈم کے بجٹ میں نہ آتی تھی۔ اس لئے میڈم اٹھ کے اپنی کہیں سے جوتی بھی کے کہیں میں لگتی تھی۔

اکرم کے جانے کے بعد ہی میڈم کچھ دیر اس خالی کہیں میں کھڑی سوچتی رہی۔ پہلے تو اس کی بیویوں کی

ہر ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ پھر دھڑ ہو گئے۔ مطلقاً ملات ہو گیا۔ میڈم مسکرائی۔ اُس نے گردن کے قریب اپنے ڈراگ کو ایک جھکا دیا۔ جوشی جی کے میز سے تان اٹھائی، اور اپنی کبیریں میں دھکی گئی۔ میڈم نے شکار لے لیا تھا۔

میڈم نے اندھا جاکر ناش کے پتے میز پر پھینک لکھا، "میں ایک رات ٹوٹا تان کا ہوا جائے شرانگور سے کہ اگر میں جیت جاؤں تو تم دونوں کو میری کچڑی میں ایک ہڑتو دیر بعد پر کام کرنا پڑے گا۔ اور اگر تم دونوں میں سے کوئی جیت جائے تو میں تم دونوں کو ایک ایک کچڑی پر کام دے دوں گی۔ طے؟"

"طے؟" راج نے شکار کے پتے لے کر کہا۔

"طے؟" شکار نے بھی کہا۔

راج نے سچا جوشی جی کی کچڑی پر ایک سون سے کم میں دو کچڑی نہیں بناتے۔ ابھی ایک سونوں میں پچاس مل تو اپنے ٹھیس لگے گی اور اگر نہ ملے تو وہ سب رگرب جاتی ہے۔ یہاں دو شاٹ سے زیادہ نہیں چرکتے۔ اور میڈم نے سچا میری تو تم جو کس خیال میں تھیں گے کہ پچیس دانوں میں تم کہہ دوں تو میرا ہم میڈم نہیں۔ پچاس کے ٹھیس میں گے۔ میڈم نے تان سبکی شکار لے کر کیا۔ میڈم نے تین تین پتے ہر ایک کو پھینکے پتے اٹھاتے وقت راج اس نے تین کو چم لیا۔ شکار جلد ہی تینوں کو چم سا بھول گئی تھی اس نے اب وہ بوائے کہہ کے مسکرائی اس کے تینوں میں غلام علی اور سٹیجی تھی۔ راج کے تینوں میں وہاں شادو تھے پیچھے شکار نے جلدی سے اپنے پتے کھول کے سامنے رکھ دیئے۔ پھر راج نے۔

ابھی تک میڈم غماز اپنے پتے کھولے نہ تھے۔ راج نے دونوں ہاتھوں سے تکی بکا کے کہا: ہار گئیں

میڈم۔ تم ہار گئیں۔ لاؤ پاس ہزار کا کنٹریکٹ بناؤ۔ میڈم نے وہیں میز پر رکھے ہوئے تھوں کو باری باری سیدھا کیا۔

پہلا جو کر تھا!

دوسرا کیجئے!!

تیسرا بھی کیجئے!!!

”ہائے!“ ایک دم راج اور شمشاد دونوں کے منہ سے نکلا۔ حالانکہ ایک صبح بنارس تھی۔ دوسری شام دکن۔ مگر ہائے دونوں میں تھی۔ ہائے کے بغیر کوئی عورت تھکن نہیں ہوتی۔

میڈم نے کہا۔ ”چلو۔ ایک ہزار دسپیر روز میں۔ ٹھیک ہے؟“

ابھی تک راج اور شمشاد اس تھیں۔ دونوں کچھ نہیں بولیں۔ میڈم اپنی جگہ سے اٹھی اپنے پرے کو کھول کر اس نے چابیوں کا گچھا نکالا۔ چابی لگا کر سیف کھولا۔ دو ہزار کے نوٹ نکالے۔ اور دونوں کو ایک ایک ہزار دسے کے بولی۔

”ابھٹ ٹھیک ہے؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اب کی دونوں نے سر ہلا کے کہا۔

اس کے بعد راج بولی شمشاد سے ”چل تاج چلے گی؟“

”چلوں گی۔“

”اور آپ میڈم؟“

”تم جاؤ۔“ میڈم نے کہا۔ ”میں میٹھ کا انتظار کروں گی۔“

میڈم کی آواز میں لگی سی ٹھکن تھی۔ لگی سی آواز سی۔ جیسے کسی نے ذرا سی راکھ کرید لی تھی۔ اور اس کے نیچے ذرا سی چنگاری اور اس کی سرخ زبان دکتی ہوئی، تڑپتی ہوئی دیکھ لی تھی۔

راج نے اپنا پنچلا ہونٹ ذرا سا نیچے لٹکایا۔ اور اپنی آنکھوں کو بڑے معصوم انداز میں میڈم سے شمشاد کی طرف گھما کر اپنی آنکھوں کو اس طرح بنایا جیسے وہ اپنے دماغ سے نہیں اپنی آنکھوں سے سوچ رہا ہو۔ اور یہ واقعی سچ تھا۔ وہ جب بات کرتی تھی تو اس کا چہرہ اس قدر بھولا اور معصوم معلوم ہوتا تھا۔ اور آنکھیاں اس طرح جلدی جلدی حرکت کرتی تھیں۔ جیسے وہ واقعی صرف اپنی آنکھوں سے سوچنا جانتی ہو۔ اس وقت بھی اس نے یہی حرکت کی۔ آہستہ آہستہ بولی: "میڈم تو اپنے میڈم ————— کا انتظار کریں گی۔ ہم کس کا انتظار کریں؟ چلو پہنا کج میں"

راج نے شمشاد کا بازو اپنے بازو میں ڈال لیا۔ اور لیکن میں میڈم کرتاج میں چلی گئی۔

"کھانا کھاؤ گی؟ شمشاد نے پوچھا۔

"ہاں ہوں؟" راج نے جواب دیا۔

"تمناج دیکھو گی؟"

"ہاں ہوں؟" راج نے جواب دیا۔

"پھر؟" ————— چوکی؟ "شمشاد نے دھیرے سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہوں؟" راج نے اسی بلند لہجے میں کہا۔

"پھر؟" شمشاد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پھر؟" راج نے شمشاد کے گلے میں باہیں ڈال کے بولی "ہائے شمشاد تو کس قدر خوب صورت

ہے۔ جی چاہتا ہے۔ تجھ سے شادی کروں؟"

"شادی کر کے کیا کرے گی؟" شمشاد نے پوچھا۔

"اسی لئے تو کرتی نہیں؟"

"اتھا بول راجو۔ کیا ہے گی؟" شمشاد نے پوچھا۔

”ٹما ٹو جوس“

”ٹما ٹو جوس؟ شمشاد نے حیرت سے پوچھا۔ تو یہاں ٹما ٹو جوس پینے آئی تھی؟“

”اور کیا؟“ راج نے ایک سرے کو آواز نہ دی۔ اور اس سے ٹما ٹو جوس لانے کو کہا۔ اور جب وہ دونوں ٹما ٹو جوس پنی پکیں تو راج نے۔ دو روپے کے بل کے اور پر سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ اور جب بیرو اٹھانے دوپے لے کے آیا تو راج نے بڑے بھو۔ بھو۔ بھو سے کہا ”KEEP THE CHANGE“ ”یہ پکرا گیا۔ بولا“ حضور..... یہ اٹھانے دوپے؟“

”رکھو“ راج اُٹھتے ہوئے بولی؟ ”ہل بیٹا“

اور وہ شمشاد کو لے کر تاج سے باہر چلی گئی۔ ورنہ حیرت سے راج نتائی لڑت دیکھتا رہ گیا۔ اتنے میں ایک اور بیرو پہلے میرے کے قریب آئے کھڑا ہو گیا۔ ”کیا ہوا؟“ پہلے میرے نے زیر لب سنی ہی ہلکے کہا ”میاؤں میاؤں۔ فیش فیش؟“

فلک میں بیڑ کر شمشاد سوچنے لگی۔ راج بھو پر عرب کا ٹھنسی ہے۔ اس کے پاس تو بھو کا ٹھنسی ہیں۔ اور میرے پاس آٹھ ہیں۔ میں اس کو دکھا دوں گی۔ میں اگلی دفعہ اسے کے تاج میں آؤں گی لا موت سوٹاپیوں گی۔ اور بیرو کو دو سو روپے بخشش میں دے دوں گی۔ بیرو جب میرے پاس ہلے کر آئے گا۔ میں اس پر سو روپے کے دوہرے نوٹ ڈال کے کہوں گی! KEEP THE CHANGE یہ راج کیا اپنے آپ کو مجھ سے بڑی ہیروئن سمجھتی ہے۔ اور نہ مکالمے تو ٹھیک سے بول نہیں سکتی فیصل دین کہ کب کب دین کہہ رہی تھی اس روز شوٹنگ میں۔ اور یہاں تاج میں آئے دن کی جتنی ہے KEEP THE CHANGE شمشاد اندر ہی اندر فٹے سے کھول گئی۔

پھر شمشاد نے مسکرا کر اپنا سر راج کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور بولی۔ ”ہائے تو کتنی میری کتنی اچھی سیل ہے راج۔ تیرے بالوں سے کتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے جی چاہتا ہے تیرے کندھے سے گی لگی

سو جاؤں؟

”سونا اپنے گھر جا کر نہیں تو وہ تیری دادی اماں چلا سکی۔ بولے گی۔ جلنے یہ راج میری شہزادی کو کس مسٹڈے کے پاس لے گئی؟“

شہزادہ سی! لکے مسٹڈے کا قتل بہت عمدہ معلوم ہوا جیسے مضبوط مضبوط باہیں اور دھاروں کو چھڑتی ہوئی منجھیں۔ اسی کیا یہ سچ ہے؟ تیری دادی اماں ہر ایک پروڈیوسر سے کہتی ہے۔ میری شہزادی۔ تو جب سے پیدا ہوئی ہے۔ آج تک ویسی کی ویسی ہے۔ کیا یہ سچ ہے بتا! راج نے پلٹ کے شہزادہ کو چیلنج کرتے ہوئے بولی۔ جواب میں شہزادہ نے راج کے گدگدی کی امدادوں ہیلیاں فاختاؤں کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔

امیر علی ڈرامیور کے جسم میں ایک عجیب سی جھرمجری سی آئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر سے جیسے جیلے سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک لبا تڑکھا نمونہ مند چٹان تھا۔ اوداسے عورتوں کا یہ پیار پسند نہیں آیا تھا اس نے بڑی شکل سے اپنے جذبات پر قابو پا کے کہا۔ ”بائی کدھر ملیں؟“

”مگر“ شہزادہ نے جواب دیا۔

شہزادہ دارڈون روڈ پر رہتی تھی۔ مگر جب دارڈون روڈ کے گھر میں شہزادہ نے دادی اماں کے کمرے میں روشنی دیکھی تو راج سے کہنے لگی ”دادی اماں جاگ رہی ہیں۔ ابھی نہیں جاؤں گی؟“

”پھر کہاں جے گی؟“

شہزادہ نے امیر علی سے کہا۔ ”امیر علی گاڑی بیٹنگک گاڑڈون کی طرف گھمے؟“

جنگل گاؤں کے سامنے دل آرام ستوریاں تھا۔ سترہاں باہل ٹھوڑی۔ دلچھڑا
 وہاں قسری منزل کے کھلے فرش پر چلی گئیں۔ انہوں نے پرے سے کہہ کر ایک چھوٹی سی تیز جھڑکیاں
 لوہے کے جھکے کے قریب سرکائیں۔ یہاں سے کئی کاٹھر چاروں طرف پھیلے ہوئے آتا تھا۔ چاروں طرف
 پھیلی ہوئی روشنیاں۔ اور آسمان پر چاروں طرف ٹپکتے ہوئے ستارے۔ اور سر پر ڈالے ہوئے
 میں ٹیڈی ڈشٹیوں کے قوس کسی دو شیزہ کے گنگن کی طرح بھولتی ہوئی وہ ٹکیس کے درختوں کی کئی
 ٹکڑے لٹے والی چڑیا لگی تک اپنے محبوب کو جادوئی تھی وہ ہوا کے ہر سانس میں رات کی رات کی خوش بو
 تھی اور چپاٹی ریت پر ایک گوانی مندر کی جڑت منہ کے گیتا ریجا رہا تھا۔

اس خوبصورت شہر کے اوپر کھلے خوب صورت آسمان اور روشنیوں کی جھالوں سے تھیں
 و ستابی نیلے سمندر کو دیکھ کر کیا کچھ یاد نہیں آتا۔۔۔۔۔ یہ کائنات!۔۔۔۔۔ یہ منہاں کے ہاتھوں
 کی محنت کی تار کی خوبصورتی میں کیا شہر رکھوئے سکر شہر ہے۔ وہ پھول جیسا شہر پیدا
 ہوئی تھی۔ راج کی وہ پہلی محبت۔ جو اب کتنی دور رہ گئی تھی۔ وہ ابلی کے جب طبع پہلی دھڑکی طرح
 دھڑکا تھا۔۔۔ وہ محبت شہر پہلی بار سکون لگی تھی کتنی ہی تار کی سی پیاری باتیں عرفیت کا
 قدس تھے۔ طلسم ایک عجیب سی پاکیزگی ایک عجیب سی بنیاد کی کہ احساس کو چھانے والی تھی
 ایسے لوگوں میں یاد آتی ہیں۔

شہر کو نے کہ آج بھر کے اپنی ٹھوڑی رنگ پر چکائی۔

مجھ کو کچھ یاد رہا ہے؟ راج نے پوچھا۔ خدا؟

”نہیں میں شہر کا شہر آباد رہنے کے بولی۔۔۔۔۔ اور تیس؟“

”ہائے میرا ایلن ڈاؤن تار کا باہل بے قرار ہو کر شہر کے کتبے سے لگ گئی۔ شہر کا کچھ نہیں بڑا

اور راج کا کچھ ڈاؤن پند تھا۔ دونوں اپنی جگہ کے کھاتے۔ یہ دونوں بندہ سناں ہو کر نہیں آئے

ابھی مشترک کوئی مکان اس کا نہیں تھا کہ کوئی انہیں اپنی دڈ بلا کے انہیں جس منوارٹ یا لین لائٹ کے ساتھ کام دے سکے۔ اس لئے بادل نا خواستہ ان دونوں نے اپنے اپنے محبوب کی تصویر اپنے ٹیبلنگ ٹیبل پر رکھ لی تھیں یہ بات نہیں تھی کہ ہندوستان میں خوب صورت مردوں کی کمی تھی۔ مگر ہندوستان کی چوٹی اداکارہ اگر ہالی وڈ کے چوٹی کے اداکار سے محبت نہ کرنے تو کس سے کرے۔ ذرا اس سے کم سچا کرے محبت کرنا کچھ گھنیا سا معلوم ہوتا ہے۔

اور اب تو این لائٹ کی ایک عرصے سے شہر میں کوئی تصویر بھی نہیں آئی راج تقریباً سو کر بولی۔
شمشاد نے پھراک آہ بھری۔ یہ آہ جو صاف اور صریحاً کہہ رہی تھی۔ تمہارا لین لائٹ جلنے بھاڑ میں
مجھے تو اس وقت اپنا پیارا تھی یاد آکر ہے۔

بہرے لے آئے پوچھا حضور کیا پیسے گی؟

راج بولی "اٹھ ہینا۔ یہاں تمہیں کوئی جیسے نہیں دے گا۔ پھر وہ میرے سے مخاطب ہو کے بولی۔
"ہم اپنا غم پیسے گے؟"

بیرہ چران رہ گیا۔ راج لٹا شمشاد کو لے کے بیڑیوں سے نیچے اتر گئی۔ اُترتے اُترتے اُسے خیال آیا۔ اس نے کتنا عمدہ فقرہ کہا تھا۔ وہ خود ہی اپنے خیال کی عظمت سے مرعوب ہو گئی کتنی بڑی بات ہم اپنا غم پیسے گے؟ فلسفے میں ڈوبی ہوئی بات! ہائے میں نے کتنی اچھی بات کہہ دی۔ پھر اسی نے فیصلہ کیا۔ کل جب وہ سنت گمن گمن گمن گمن کے سیٹ پر شوٹنگ کرنے جلنے لگی۔ تو سنٹی جبر و س جبر ناوی مکالمہ انہیں کو ضرور فقرہ بتائے گی تاہر اس سے اصرار کرے گی کہ وہ یہ فقرہ ضرور اس کے کسی ڈائلاگ میں ڈال دے۔ راج لٹا ادب اور شاعری کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے نشی بہا گیر حورام بھوجوری کے سامنے ناول اور مزاد گھنوی کے سارے دیوان پڑھ ڈالنے تھے۔ جب کہ دوسری بیرونیس بڑی شکل سے مرنے کا مینو پڑھ سکتی تھیں۔

لوٹے ہوئے ششاد نے بڑے اُداں لہجے میں کہا: راج! بھاری بھی کوئی زندگی ہے یوں
 دیکھو تو سب کچھ ہے غلیٹ، گاڑی، شہرت، دولت، مگر یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جتنی کے بغیر
 سب سونا معلق ہوتا ہے۔

”نہ جتنی ہے تو! راج آہستہ سے بولی: اے میرا لاڈ.....!.....!“
 ششاد کچھ دیر خاموش رہی کچھ دیر گاڑی خاموشی سے دارٹون روڈ کی طرف چلتی رہی۔ پھر ایک نوکری
 آہ بھر کے ششاد نے کہا۔

”راج! مجھے وہ مائی بلا خاعر۔ کیا نام ہے.... کم فات کی غزل سناوے؟“
 ”کم ذات نہیں ہزارو“

”ہاں ہاں ہزارو کی غزل ہی سناوے۔ بہنا بھی بہت اُداں ہے۔“

ششاد کو دارٹون روڈ پر چھوڑ کر راج اس کی ٹکن لے کر اپنے بھگے کوٹھی گئی جو باندھ میں
 تھا۔ پالی ہاں پر۔ پالی ہاں کی طرف ٹٹے ٹٹے میرٹلی ڈھلے پورے سوچا۔ میں اسے پالی ہاں، کیوں
 لے جاؤں۔ اسے باندھ کے ساحل پر کیوں نہ لے جاؤں۔ اس وقت وہاں باندھ کے ساحل پر کوئی
 نہ ہوگا۔

پھر اس نے سوچا۔ اگر اُسے تین سال کی جیل ہوگئی۔ تو اس کی بیوی زبیدہ اور اس کا چار سال کا بچہ
 شہباز کیا کرے گا؟ میں ٹکن ہے۔ اس کے جیل کے دنوں میں کوئی اس کی بیوی کو باندھ کے ساحل
 پر لے جائے۔ غریب میں کیا کچھ ٹکن نہیں ہے۔

”ٹکن اس وقت موقع اچھا ہے۔“ امیر علی پٹھان نے امیر علی ڈورائیور سے کہا۔

”ہاں مگر اس موقع کو حاصل کر لینے کے بعد زندگی بھر کوئی مجھے ڈرائیور نہیں رکھے گا۔“
امیر علی ڈرائیور نے امیر علی پٹھان سے کہا۔

”خو...“ پٹھان اصرار کرنے لگا۔

”چپ رہو، ڈرائیور نے بڑی سختی سے کہا۔ اور پھر گاڑی کا مندرجہ پالی بل کی طرف موڑ دیا۔

راج کو پتہ نہیں چل سکا کہ امیر علی نے اپنے دل میں کیا باتیں کیں۔ کیونکہ وہ اپنے دل کی باتوں میں مصروف تھی۔ اتنے میں اس کا جھگڑا گیا۔ جیوں ہی گاڑی پوربچ میں رُکی ایک ٹبلے پتے سوکھے گھاٹے قوی نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ جلدی سے کھول کے راج کی طرف مشتتبہ جھکا ہوا دیکھا۔ جیسے وہ جھکا ہیں کہہ رہی ہوں؟ کہاں گئی تھیں؟“

یہ راج کا خاوند مشتکر تھا۔ راج اس وقت تک چپ رہی۔ جب تک امیر علی گاڑی کو جھکے سے باہر جمال کے نہیں لے گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاوند کی طرف غری اور گرج کے ہولی ”جہنم میں گئی تھی!“

اُس کا خاوند گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔ مگر میں نے تو کچھ نہیں کہا راج!“

راج اس کی بات کا جواب دئے بغیر آگے بڑھ گئی۔ آگے برآمدے میں اُس کے چچا کھڑے تھے چوڑی دھڑ پاجامہ، سر پر دوپٹی۔ چہرے پر ٹھنڈیاں۔ آنکھوں میں وہی مشہور اور عجیب ڈر سا....

راج نے ڈپٹ کے پوچھا۔ ”آپ ابھی تک سوئے نہیں“

”تہہ دار انتظار کر رہا تھا!“

راج نے بڑی سختی سے کہا۔ ”میں نے کب کہا ہے میرا انتظار کیجئے۔ میرا انتظار کبھی نہ کیجئے گا۔ دس حرف کہہ چکی ہوں۔ کوئی بھی نہیں ہوں۔ اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ خبردار جو آئندہ سے کسی نے میرا انتظار کیا۔ راج اوجڑا دھڑکھڑا کر گئی۔ مگر وہاں برآمدے میں چچا کے سوا کوئی نہ تھا خاوند چپکے کان پیٹ کے گراج میں چلا گیا۔ کیونکہ وہ گاڑی چلاتا تھا اور باہر دنیا میں اُسے صرف ڈرائیور ہی سمجھا جاتا

تھا۔ یہ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ راج کا خاوند تھا۔

راج چچا کو دیں برآمدے میں ٹھہرا جو دروازے پر ہال میں چلی گئی۔ ہال میں اس کا بھائی ابھینو بیٹھ چکے تھے۔
 مٹھیاں پیچھے بٹھایا تھا۔ اس نے آتے ہی راج کو ہالوں سے پھلایا "کہاں گئی تھی سالی"
 راج نے اس کے منہ پر زور کا ایک ملا پھڑک دیا۔

بھائی نے ایک گھونسا مارا۔ راج رونے لگی۔ مگر رونے روئے لڑائی بھی گئی۔ اس نے آنکھوں سے اپنے
 بھائی کا چہرہ جگ جگ سے ہوا بھان کر دیا۔ چلا چلا کر کہنے لگی۔ "سور کا بھڑا"
 "مسو کی بچی؟" بھینا ابھینو غصے میں غرتے "سالی سو ذرات کو دیر سے آتی ہے مگر یہ کہہ کر بھئی کا کوٹھا ہے"
 "حرام نامہ بہن کا کھلتے ہو۔ اُپر سے اُگرتے ہو۔" راج اس کے ایک ملا پھڑکے ہوئی۔

ابھینو کو طیش آیا۔ اس نے راج کے اتنے زور سے ہالوں کو کپڑے گھسیٹا کہ راج صوفے
 سے نیچے فزق کے خالیچے پر گر پڑی۔ اور تپائی پر رکھا ہوا اچھل ان گر کر لوٹ گیا۔

اتنے میں چچا دامودر۔ ابھینو کی بیوی گوری اور چچی گیشی اور موسیٰ ڈلاری اور موسیٰ کی بیٹی رام پیاری اور اس کا
 خاوند اجیت سنگھ اور دس بارہ لڑکے لڑکیاں۔ جانے کہاں کہاں بچکے کے کہنے کو فوں سے بھل کر ہال یا
 جمع ہو گئے۔ اور ایک ہی وقت میں ایک دوسرے پر زور زور سے جھینے پھانے چٹھانے اور رونے پٹنے لگے۔

آس پاس کے بچکوں کی روشنیاں جو گلی ہو چکی تھیں۔ باری باری سے پھر چمکنے لگیں۔ ساتھ
 والے بچکے کے انہیں کمال داس نے اپنی بیوی سے کہا "اے دیوڑ کا کٹا ہے۔ دیوڑ راج دیر سے
 آئی ہے۔ تھوڑی دیر تک ٹل خپلا رہے گا۔ پھر سب سو جائیں گے۔۔۔۔۔ چلو اندر۔۔۔۔۔ کمال داس
 نے اپنی بیوی کی کمر پر ہاتھ رکھا "ابھی ان کی شادی ہوئے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے مگر۔۔۔۔۔"
 بیوی تھک کے ہوئی "نہیں میں تو ذرا یہ جھگڑا سنوں گی۔"

"دو تو سنتی ہو۔ کمال داس نے جھپائی لے کر کہا "اس میں کیا کھلے جاہل بہت بڑی فلی فٹ ہے۔۔۔۔۔"

”تم کیا جانو۔ ہر روز کوئی مذکوئی تھی بات ہوتی ہے؟ کمال داس کی بیوی بولی ”تم کیا جانو عورتوں کی باتیں۔ تم ہلکے سوردھو، میں ابھی آتی ہوں“

کمال داس کو خوب معلوم تھا کہ ابھی آتی ہوں کا مطلب ایک گھنٹے سے ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح صبر کرتے ہوئے کہا: ”اچھا ایک پیار تو دے دو“

”نو“ کمال داس کی بیوی نے پیچھے سے دونوں ہونٹ جلدی سے اُس کے آگے کر دیئے۔ بڑی بے دلی سے۔۔۔۔۔ کمال داس کو بوسہ لیتے ہوئے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ بوسہ نہیں لے رہا۔ تیلی زمین میں پھاڑا پھلا رہا ہے۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اپنے کمرے میں رنجیدہ ہو کے چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ہوں ’سالی کا دل اس وقت جھگڑے میں ہے۔

کمال داس نے ٹیکہ پی کیا تھا۔ کئی گنٹے بھر میں جھگڑا رفع دفع ہوا۔ آہستہ آہستہ چاروں طرف سنا جھا گیا۔ اب صرف راج کے کمرے میں روشنی تھی۔

اب راج اور بھینیا میں صلح ہو گئی تھی۔ راج اپنے بھائی کے چہرے پر جہاں جہاں ناخون کے نشان تھے کرم لگا رہی تھی اور سسکیاں لے لے کے کہہ رہی تھی ”بھینیا تم بھنگ کیوں پیتے ہو؟“

”تو کیا کروں۔ راجو۔ تم دوسکی کے پیسے جو نہیں دیتی ہو؟“

”کیسے دوں؟ تم خود ہی مگر کی حالت تو دیکھتے ہو۔ بھینیا جی۔ جو رشتے دار ہے۔ جو بے کار کا دس دھڑ ہے جس موٹے سے کبھی بھین کی ایک دلی کی جان پہچان تھی۔ وہ سید عایاں باندرے میں راج کے بچلے پر چڑا آ رہا ہے۔ لگ بھگ کوئی پچاس آدمیوں کا کھانا صبح دشام تیار ہوتا ہے؟“

اور یہ بات بااصل صحیح تھی۔ مگر اس میں راج کا خود اپنا قصور تھا۔ جب اس کے اچھے دن آئے

اور اس کا شمار ہندوستان کی گہنی چنی اور اکالوں میں ہونے لگا۔ اور اسے پچاس پچاس ہزار کے کاٹھنیا
 ملنے لگے۔ تو اس نے بھی اپنا خرچ بے تحاشا بڑھا لیا، گاڑیاں، مکان، غیٹ، کپڑے، کتے تو تھے
 ہی۔ اب اس نے ایک ایک کر کے اپنے سب رشتہ داروں کو اپنے پاس بلانا شروع کیا پہلے چھاپائے
 پھر اس کا خاندان۔ پھر کھوپچا آئے۔ پھر ان کا خاندان۔ پھر بہت سے بے کار لوگ۔ مگر وہ پار کے
 رشتے دار بھی بنا بلائے چل پڑے۔ راج کو اپنے پیچھے کے ساتھ ایک اور جٹو کر کے پرے کران سب
 لوگوں کو دکھنا پڑا۔ ان کے علاوہ اس کا اپنا خاوند تھا۔ جو چلے کچھ نہیں کہتا تھا۔ مگر زندہ تو تھا۔ اور ہر
 روز مدینا کا انجکشن لیتا تھا۔ پھر اس کے چھاپے۔ جو اپنی بیوی کے علاوہ ایک رنڈی رکھے ہوئے تھے
 اس کا خرچ پانی بھی راج کو دینا پڑتا تھا۔ ابھینو بھنگ پیتا تھا۔ اور شر کہتا تھا شر تو نہیں کہتا تھا۔
 لیکن اُردو کے سائے دیوان اُس کے پاس تھے۔ اُن میں سے شعر چڑا چڑا کے فلم کے رسالوں کو بھیجتا تھا
 اور وہ لوگ اس نے چھاپتے تھے کہ وہ راج کا بھائی تھا۔ کبھی کبھی اس کے سہارے راج کا۔ یا تو تو یا اس کا
 کوئی انٹرویو ان رسالے والوں کو مل جاتا تھا کبھی کبھی کوئی چٹنی مزے دار خبر۔ کیوں کہ جب راج اور بھینا
 کی زور کی لڑائی ہوتی۔ تو راج کئی کئی روز اپنے بھائی کو سنا نہیں لگاتی اور اسے پیسے نہیں دیتی تھی۔ ان
 دنوں ابھینو بے چارہ کیا کرے بھنگ کیسے پئے۔ اپنی بیوی بچوں کا خرچ کیسے پورا کرے۔ چنانچہ وہ ان
 دنوں اپنی بہن کے معاشقوں کے حالات رسالے والوں کو اونٹنے پونے میں بیچ دیتا کئی بار ایسا ہی ہوا کہ
 راج سے لڑائی ہو گئی۔ مگر کوئی معاشقہ نہیں ملا اور بھنگ کی ٹوٹ جو رہی ہے اس نے ابھینو کو ایسے
 موقعوں کے لئے نئے معاشقے بھی خود ہی گھڑنے پڑتے تھے۔ گروادہ ایک خلاق فن کار بھی تھا۔ مگر اس
 وقت ابھینو اور راج کی صلہ ہو گئی تھی۔ وہ اُسے بھینا کہہ رہی تھی اور وہ اُسے راج کہہ رہا تھا۔ اور دونوں
 بہن بھائی ایک ہی صوفے پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔

راج نے ڈبے پیار سے کہا: "میں آج اپنے بھینا کو وہی پلاؤں گی۔"

یہ کہہ کر راج صوفے سے اٹھی۔ اور اس نے الماری کھول کر وہ سکی کی بوتل نکالی۔ تپائی پر وہ نکلا س رکھے
 دھڑکیٹیرے سوڈے کی بوتلیں لائی پھر وہ دونوں دہکی پینے لگے۔

دو پیگ پینے کے بعد ابھینو نے کہا : ”راجو تم سب کو نکال دو۔ میں سب رشتے داروں کو“
 ”ہاں بھتیجا تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں کل ہی ان سب کو چٹا کر دوں گی“

”صرت ہم اور تم رہیں گے“

”ہاں بھتیجا صرت ہم اور تم....“

دو پیگ اور پینے کے بعد ابھینو نے کہا ”راجو۔ تم شکر کو بھی نکال دو“
 ”شکر تو میرا شوہر ہے“ راج بولی۔

”تو کیا ہوا۔ ابھینو بڑے غصے میں بولا ”سالا۔ بالکل تمہارے لائق نہیں ہے۔ سوکھا ٹٹرا۔ دھما۔ تمہارے
 ماں باپ نے اس سے تمہاری شادی کر کے تم سے بڑا ظلم کیا ہے۔ میں تمہارا بھائی ہوں میں تم سے انصاف
 کروں گا۔ تم شانتا رام سے شادی کرو“

”مگر شانتا رام تو شادی شدہ ہے“

”اچھا تو محبوب سے کرو“

”وہ بھی شادی شدہ ہے“

”اچھا تو کاردار سے کرو“

”وہ بھی شادی شدہ ہے“ راج بولی۔

یہاں آ کے ابھینو کا داغ ٹوک گیا۔ اور دو پیگ پینے کے بعد اس نے سب سوچ کے کہا ”اچھا تو جو
 سے شادی کرو“

”مگر تم تو مجھے بھائی ہو“ راج بولی۔

”ہاں ٹیک ہے“ بنیا نے سر ہلا کے کہا: ”اچھا تو پھر مجھے اندو کی دو“

پیشہ اس کے کہ راج اس کے محاس میں اور وہ کی اندو ملتی۔ ابھینو نے آنکھیں بند کر لیں۔ اندو صوفے پر اندھا بکر قرالے لینے لگا۔ راج نے اسے ٹانگ ہے گھسیٹ کر فرش کے غایہ پے پر سُلا دیا۔ پھر اس نے ندر سے گھنٹی بجائی۔ باہر پھر روشنی ہوئی۔ ایک ٹوکر آیا۔ راج نے ابھینو کی طرف اشارہ کیا۔ وہ قرالے لینے ہوئے ابھینو کو اپنے بازو میں اٹھا کے لے گیا۔ راج نے چٹنی چڑھا دی اور جی محل کے مسبری پر لیٹ گئی۔

راج نے کروٹ لے کے مسبری کے قریب تپائی پر رکھی ہوئی ایلن لاڈ کی تصویر کی طرف دیکھا۔ جو ریڑم کے فریم میں جڑی ہوئی اندو میرے میں بھی جگ جگ جگ کر رہی تھی۔ ریڑم راج کی طرح

”ڈرنگ“ راج لاڈ کی طرف دیکھ کر دیر سے سے مسکرائی، اندو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رئیس گنج کا عشرت بہت خوب صورت تھا۔ اس کی خوب صورتی میں اس کی تخلیق میں اس کی انزائش میں۔ اُسے عشرت کی ذات میں تخلیق کر لے میں عشرت کے لب باپ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اور انہوں نے عشرت کو ایک جیسہ پر وقار خوب صورت تعلیم یافتہ مستمن فوجان بنانے میں بے دریغ دیا۔ فرق کیا۔ کوئی تاج محل بناتا ہے، کوئی عشرت بناتا ہے۔ خوب صورتی کی تخلیق کا جذبہ ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔

ہر باپ اپنے بیٹے کے آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ عشرت کے والدین کا رشتہ نجی تھے۔ اس نے عشرت کو کم از کم اپنی کورٹ کا جج تو ہونا چاہئے تھا۔ اس نے وہ چاہتے تھے کہ عشرت اپنی اس کے بعد لالچ میں داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے اثر اور رسوخ سے آہستہ آہستہ ایک نئی — ایک دن جو کبھی نہیں آیا۔ اور عشرت کے والدین کی حسرت کو اپنے دل میں لے گئے۔ انسان آئینہ سار کیوں ہوتا ہے۔ وہ انسان مگر کیوں نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بیٹے کی شبیہ میں ماضی کا عکس کیوں دیکھتا ہے۔ مستقبل کی تھوہر کیوں نہیں دیکھتا ہے؟

عشرت کے باپ نے کالج کی سطح پر جو عکس دیکھتے تھے وہ ان خواہوں سے بہت مختلف تھے جو

عشرت کے دل و دماغ پر چھارے تھے۔ ہر شاعر کا دل۔ اس کا اپنا دل ایک ذاتی آئینہ ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا اپنی تصویر نہیں دیکھ سکتا۔ بہت سے باپ بھی نکلی کر جاتے ہیں اور پھر ساری زندگی اُسے بھگتتے رہتے ہیں۔ عشرت کے باپ اور ان کے مرے کے بعد اس کی ماں اگر عشرت کے دل کے آئینے میں بھانک سکتی تو وہ ملک سے رہ جاتی۔ کیونکہ اس آئینے میں ان خوابوں کی تعبیر موجود نہ تھی جنہوں نے اپنی رنگارنگ برقعوں کی غیتوں سے اُن کے غائب دل کو بھار رکھا تھا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ عشرت اکثر سوچتا تھا۔ میرا آئینہ کسی کے آئینے سے کیوں لمے۔ میں انسان ہوں۔ کالج کی سطح نہیں ہوں شروع شروع میں عشرت کے خواب مختلف تھے۔ اسے ورزش کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑا ہو کر جتنا شک کا اُٹاؤ بنانا چاہتا تھا۔ جب وہ اور بڑا ہوا تو فوج میں جنرل بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ جب وہ اور بڑا ہوا۔ اور جب اسے دُور دیدہ بھگاہوں شرمائی ہوئی نظروں اور عرق عرق حسینوں اور کانپتی ہوئی نیم مہریش انگلوں کے پیام ملنے لگے۔ تو وہ ظلم میں بیرو بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ جشت!۔ وہ جتنا شک کا اُٹاؤ کیوں بے گما۔ ہادی رنٹل بار پور ویش کرتے کرتے اس کا تو دم بھل جائے گا۔ اور فوج میں جنرل پہلے تو وہ سپاہی میں بھرتی ہوگا اور لفٹ رائٹ کرتے پر یہ کرتے فٹیک کھاتے کھاتے جلتے کب جنرل بنے گا۔ کہ کسی دن کورٹ مارشل ہو کے پھر سپاہی رہ جائے گا۔ لیکن یہ ظلم کا میرا دنیا کس قدر اچھا اُو آسان کام معلوم ہوتا ہے جس طرح وہ چاہا گیا تھا۔ جس طرح رئیس گنج میں اس کی خوب صورتی کے چرچے تھے۔ جس طرح انجان بے بھم۔ نامعلوم لڑکیوں نے چپ چپ کر اس سے محبت کی تھی جس طرح کی انجان۔ بے بھم۔ نامعلوم ہندوستانی فلمیں اس نے دیکھی تھیں۔ اس سے عشرت کو یہی انداز ہوتا تھا کہ وہ قطعی طور پر ظلم میں بیرو بننے کے قابل ہے اور میرا دکا کام کس قدر آسان ہوتا ہے۔ ظلم میں شروع سے آخر تک محبت ہی محبت کئے جانا۔ محبت کے گیت گانا۔ محبت کے خط لکھنا۔ محبت کے اُٹاؤ بھانا۔ محبت کی موت مرنا۔ یا محبت کی شادی کرنا۔ گویا نرے ہی نرے ہیں۔ ہر طرف سے اس کے

مکتبہ پر ہونے والی اسٹاویلیج کا جہز۔ یہی ساری عمارتیں دگر دگر کر کے گداور۔ عشرت کار شہم میں
لبوں جہم اس خیال کے آتے ہی کانپ گیا اور اس نے فہم میں بیرو بننے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

اس نے عشرت بنی لے پاس کرتے ہی پہنچا گیا اور اپنی بیوی کو اکیلا چھوڑ گیا۔
وہیں گنج کا شہر اس کے لئے بہت چھوٹا تھا۔ یہاں کی کامیابیاں بہت خیر تھیں۔ سکندر وغیرہ میں کہے
رو سکتا تھا۔ اتنی بڑی دنیا فتح پانی کے لئے اُسے چاروں طرف سے بھاری تھی۔ اس نے سکندر وں گنج
سے پہنچا لیا۔

ہر سال ملک کے اطراف و اکنات سے ہزاروں لوگ یہی کام کی تلاش میں آتے ہیں اور
یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے۔ جسے روکا جاسکے۔ یہی ہندوستان کا سب
سے بڑا صنعتی شہر ہے اور کام کاذ کے سلسلے میں ایک بڑا صنعتی شہر ایک بہت بڑا مقام طیس ہوتا ہے جو
بے در دگر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہر ملک میں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کیونکہ یہاں تجارت ہوگی
اور صنعت و حرفت ہوگی۔ وہاں باہر سے لوگ کھینچے ہوئے آئیں گے اور گھر والے کو چھوڑ کر آئیں گے اور بیویوں کو
چھوڑ کر آئیں گے اور ماں باپ کی خواہشوں کو روند کر آئیں گے اور دوستوں اور محبوباؤں کے آسودوں میں
بیٹھے ہوئے آئیں گے جس طرح وہاں کے فرقے مقام طیس کی طرف کھینچتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہاں منتر
بھی آئیں گے اور ڈونڈ بھی آئیں گے۔ اور کرپاں سٹھ بھی آئیں گے۔ یہاں خدرا بھی آئیں گی۔ سوسٹیلو بھی
آئیں گی۔ اناہیل بھی آئیں گی اور سادتری بھی آئے گی۔ کوئی قانون کے ساتھ آئیں گی تو کوئی ڈھائی سو
روپے کے آئیں گی۔ کوئی زیور چڑھائے آئے گی۔ تو کوئی کسی کی آنکھوں کی نیند چرائے آئے گی۔ مگر
آئے گی ضرور، کیونکہ یہی ایک بہت بڑا مقام طیس ہے۔ جہاں راسخ رہتی ہے۔ مہلے چاری بیسویہ
واسختی براہیے گاؤں میں بہت مری تھی۔ پر یہاں پہنچنے میں ایک بل میں ساٹھ روپے پانی ہے۔ یہاں
راتی بالا ہے۔ جو سنا ہے ایک فلم میں کام کرنے کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے لیتی ہے۔ پھر یہاں اپنے

کر پال کا ہستیہ گر نش ہے۔ اسے دی گرنش جو اپنے تھیں مارا مارا پھرتا تھا۔ یہاں سنا ہے اُس کے پاس چھرنکیاں ہیں۔ اور بچے کمار کو تو دیکھا ہوگا۔ یہاں کادسہ چھندہ بھی اس کے اُٹانے نہیں چھاپتا آج وہ بچی کا سب سے بڑا اعلیٰ ادیب ہے۔ اور عشرت نے سوچا وہ تو راج کمار سے کہیں خوب صورت ہے۔ وجہ کدے کہیں تعلیم یافتہ۔ اس نے اس نے اپنے سوٹ کس میں تین اپنے بچے ہوئے سوٹ کے یکو تھیں، انگریزی جڑا ہیں، جوتے، اور تین سو روپے ساتھیوں نے ہوئے۔ وہ جھاگ کر بچی آگیا اور اُس کے سی سائیڈ ہوٹل میں ٹھہر گیا۔

سی سائیڈ ہوٹل کی غلام گردش میں ٹہرتے ہوئے کھٹے نے عشرت کو دیکھ لیا۔ کھٹے راج محل اسٹوڈیو میں کیرہ مین تھا۔ اور بظاہر بہت تعلیم۔ برادر اور تین قسم کا انسان نظر آتا تھا۔ گول گول چہرہ، گول گول سینک، گول گول سکراہٹ کچھ کچھ بھی ہے۔ کچھ کچھ بھی نہیں۔ پان کتے میں دہانے ہوئے ایک نیلے رنگ کی چوڑی مہری والی پتلون۔ اور پتلون کے اوپر ڈھیلّا ڈھالا براؤن رنگ کا بیش خرش پہنے ہوئے کھٹتے ہوئے چلے آئے ہیں۔ کھٹے بظاہر کھٹے لہنے لہنے میں کام کرتا تھا۔ سوئی ہوئی رفتار سے چلتا تھا۔ سوئی ہوئی آواز مندی آنکھوں سے اس طرح دیکھتا تھا۔ جیسے وہ زنیاد باقیہا سے غافل ہے۔

مگر دراصل اُس کی غفلت اک بظاہر سونے ہوئے کنڈلی مارے ہوئے، دھوپ سینگے ہوئے سانپ کی غفلت تھی۔ آپ خدا اس کے قریب گئے اور اس نے ڈنک مارا۔ کھٹے نے عشرت کو غلام گردش میں ٹھپتے ہوئے تازہ لیا۔ کتنی آسانی ہے، فلم کے جگر میں ہے۔ اس لئے معاملہ پٹ جلے گا۔ چنانچہ اُس نے عشرت سے دوستی کرنی۔ اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اُسے سیٹو ہسپتال بمائی باکڑیا کے راج محل اسٹوڈیو میں لے جائے گا۔ اور اسے اپنے دوست جوشی ڈائریکٹر سے ملا دے گا۔ مگر تمہارے پاس کیا سنبھل ہیں؟ کھٹے نے کہا۔

مثیل کیا ہونے ہیں " عشرت نے گہرا کے پوچھا۔

"تمہاری تصویریں میک آپ کے ساتھ روشنی اور ذائقے کے دلچسپ امتزاج انسان کی صورت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں اور تم تو یوں بھی اچھے خاصے بیرو نظر آتے ہو۔ پوری نظم انداز میں تمہاری ایسی شخصیت مجھے تو کسی دوسرے بیرو کی نظر نہیں آتی۔ مثیل کھڑے ہونے میں چپاس روپے لگیں گے۔ میں خود کھینچوں گا۔"

عشرت کہہ تصویریں اپنے ساتھ لایا تھا کھڑے انہیں دیکھ کر سر رولتے ہوئے کہا یہ دوس گنج کے اتھر فوٹو گرافک بال کے فوٹو یہاں نہیں ملیں گے۔ جن میں تم چھپنے کی کمال پرکری رکھو گے یوں لگے کہ مجھے ہر جیسے نہیں پہچان بوا سیر ہے۔"

عشرت ہنسا اور اس نے جیب سے پاس روپے نکال کے کھڑے کو دئے۔ کھڑے نے گزشتہ تین مہینے سے بڑل کا بل نہیں دیا تھا۔ اس لئے۔ اور پھر کھڑے نے عشرت کو خوشی ہی سے ملا دیا۔ اور اس طرح ایک ہفتہ میں اس سے ڈیڑھ دو سو روپے اور کھینچ لئے۔ اس کا ایک سوٹ گروی لکھوایا دو قمیص مانگ لیں ایک جوتا پہن لیا۔ اور جب عشرت کے پاس کچھ نہ رہا۔ اور جب فیروز نے عشرت کا سامان بڑل سے باہر کھینک دیا تو کھڑے صاحب عشرت کی طرف سے یوں داخل ہو گئے کہ اس طرف اُدھ مندی آنکھوں سے عشرت کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہیں موتیابند کی شکایت ہو۔

جب عشرت بڑل سے باہر نکلا۔ تو اسے ایک جھکسا لگا زندگی میں پہلی بار اسے کوئی آدمی ایسا بھی ملا تھا جس نے اس کی خوب صورتی کی رتی بھر پرواہ نہیں کی تھی جس نے ایک شائقِ جیب کترے کی نگاہوں سے اسے چاروں طرف سے ٹٹول ٹٹول کر اسے اچھی طرح سے اٹا پٹا کے چمان پھٹک کے خالی کر دیا تھا۔۔۔۔۔

یہ ایک عشرت کو مسلم ہو کر نہ اس شہر میں باطل اکیلا ہے۔ اس کی جیبیں آستینوں سے

باہر فلک رہی ہیں اور ساری دنیا اسے مشتہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

وہ رات اس نے باپے سینٹرل ٹیشن کے سینٹر کلاس وینگ روم میں بلگئے گزاری۔ صبح ہوتے ہی اس نے راج محل سٹوڈیو کا رخ کیا کیونکہ جوشی ڈائریکٹر نے اس کا فلم ٹسٹ لینے کا وعدہ کیا تھا۔

اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوا، تو.... وہ عشرت سوچنے لگا کہ پھر وہ اپنا نام کیا رکھے گا۔ انہیں پھر اس کے ذہن میں ایک باہمی رنگ کی ہرک کارزنگالے سے گزرتی۔ یہ ہرک وہ خود چلا رہا تھا۔ تاج میں بلور کا فانوس روشن تھے۔ اور وہ ایک شفاف شٹان کی ساری میں حمزہ قرانی ہوئی تھی کے ساتھ دوس کر رہا تھا جوشی نے کہا: عشرت مسکراؤ؟

عشرت صبح سے بھوکا تھا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی چنے کے بعد مسکرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اسے بھائی تمہارے سامنے ایک خوب صورت لڑکی لگ رہی ہے۔ بتاؤ کیسے مسکراؤ گے؟" جوشی نے پوچھا۔

عشرت نے ہر مسکرانے کی کوشش کی۔

"باپ دے؟" جوشی بڑے زور سے غصے میں چلایا۔ پھر اس نے کہا۔

"اچھا جنس۔"

"ہی۔ ہی۔ ہی۔" عشرت ہنسا۔

اُسے اپنی ہنسی بڑی کمزور معلوم ہوئی۔

"گدھا! جوشی پھر حیا! اچھا! پوچھو کہ وہ کبھی دکھائے۔ میرا مطلب ہے۔ چہرہ اور اس، آنکھوں میں آنسو نہ پڑے۔ چہرہ محبت کی حواں۔ طبیعت کی زندہ تصویر۔"

عشرت نے پھر کوشش کی۔ اُسے خود معلوم ہوا کہ اس کا کوشش میں اس کا چہرہ بہت بے باک

مسلم ہوتا ہوگا۔

یہ ایک وہ کمپانی بنی ہوئی تھی۔

مٹ ایک خوشی نے غصے میں کہا "آج آج ہی ریس گجے سے بھر رہے ہیں۔ کم بہت ایکٹنگ کی کم سے کم نہیں گیٹ آؤٹ!"

گیٹ آؤٹ۔ ہرے عشرت جی بے دین سے راج محل کی شیخ نبرہ کے باہر پڑے فریج پر پٹے ہوئے پردوں، ٹائٹ کے بورلوں، کلوری کی کچھڑوں مولڈنگ کے ٹکڑوں اور پلاٹر کے پڑے قسمتہ جوں کے درمیان چٹا تھا۔ اس کے سامنے ٹ راج کا ٹوٹا ہوا عتبر تھا۔ ایک کا ہندو گیش کی سوئر پر پڑا تھا۔ اور تندی بیل کا بت ایک مراچی سے اپنا منہ لگائے ہوئے تھا عشرت نے سوجا اب وہ کیا کرے۔ سکندر واپس مقدونیہ چلا جائے۔ کو خود کشی کرے۔ کہ ان کو تاروے کے رہے چھلانے کی کوشش کرے۔ کہ فائدہ سستی میں کوشش کرتا رہے عشرت زندگی میں آج تک بھوکا نہ رہا تھا۔ اس نے آج اس کا جی دے لے کو چاہ رہا تھا۔ یہ ایک اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"اباڑیاں کیوں بیٹھے ہو جی؟"

عشرت نے سر اٹھا کے دیکھا۔ سامنے امدادی رقامہ کا لباس پہنے عہدہ سیک آپ کے ہوئے ایک جوان لڑکی اپنے ہونٹوں کو بڑی غور سے سیکوڑتے ہوئے کسی سے کہہ رہی تھی۔ یہ رفیقہ تھی "ساری عہدہ کے وہاں سے عشرت اٹھ کھڑا ہوا، اور چلنے لگا۔

"وہ رفیقہ جی جی سے ہوں" میں نے ذرا دھکیا تو اٹھ کے چلنے لگے۔ اگلے ہی میں تھا اگلے گزر ہوگا۔ نئے مسلم ہوتے ہوئے رفیقہ کھیلنے کے بس پڑی۔

عشرت بھی جیسا۔

وہ دونوں پلاسٹک کے جوں پر بیٹھے گئے۔ رفیقہ نے اپنا نام بتایا۔ وہ آج چوتھی

منو بھائی کی شوٹنگ میں آئی تھی۔ ڈانس کسے لئے۔ اس کی ایک ماں ہے۔ ایک بہن تھی سورجی پانچ بچے چھوڑ گئی۔ وہ ان پانچ بچوں کو پالتی ہے۔ بھنڈی بازار میں ایک چھوٹی کھولی میں رہتی ہے۔

”تم کہاں رہتے ہو کیا کام کرتے ہو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟“

عشرت نے سب بتایا۔ بتاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اباڑا مرد جو کروٹے ہو۔ رفیعہ غصے سے بولی ”پلو میرے ساتھ گھر پر...“

عشرت اٹھا۔

”لو ابھی سے چلنے لگے؟ ارے ابھی نہیں شوٹنگ کے بعد چلیں گے۔ ساڑھے چھ بجے بیٹھو میں ابھی جانی ہوں۔ شاٹ ہونے والا ہے۔“

رفیعہ کی کھولی میں روشنی بہت کم تھی۔ کالونج بہت زیادہ تھی۔ رفیعہ کی ماں کے خاکسری اہل چہرے پر دکھوں کے ان گنت نشان تھے۔ اس کی ٹھوڑی ایک پیٹڈ لم کی طرح بڑبڑاتے آہستہ آہستہ حرکت کرتی رہتی تھی۔ اُس نے ایسی سچی ہوئی ٹھکانا ہوں سے عشرت کی طرف دیکھا۔ جیسے دنیا میں کوئی انہی نہیں ہے۔ اور کوئی دوست نہیں ہے۔ کوئی نیا نہیں ہے۔ کوئی پڑانا نہیں ہے۔ کسی کے آنے کی خوشی نہیں ہے۔ کسی کے جانے کا غم نہیں ہے۔ جتنے آنسو تھے وہ سب خشک ہو چکے۔ اہد جتنے قہم تھے وہ ب مرچے بس ایک پنڈلم ہے جو ایک ہی مقبرہ دفنا ہے جھوٹا رہتا ہے۔ موت سے زندگی کی طرف اور زندگی سے موت کی طرف ایسی گھبری، رُکی ہوئی، جامد ساکت منہ نہ تھی۔ اس بڑی عمر کی کمرعشرت کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی گھر میں نہیں کسی برف غلے میں چلا آیا ہے۔ اس کے سارے جسم میں ایک جُمر جُمری سی آئی اہد اسے ایک لمحے کے لئے کانچا چھوڑ گئی۔

رفیعہ عشرت کو ہاتھ سے چمکے رہے گئی۔ ”کیا چپ کھڑے ہو۔ شرابی ہوئی ہوئی (لڑکی) کی طرف اب بیٹھ جاؤ۔ یہیں زمین پر بیٹھ جاؤ۔ ہم لوگ یہیں زمین پر بیٹھتے ہیں۔ یہیں زمین پر سوتے ہیں۔ کھولی

کے ایک کونے میں نل تھا۔ روضہ کمال کی چٹکراتا کر وہاں دھونے کے لئے چلی گئی۔ بڑی ماں نے ہڈیاں میں چاول ڈالے، عشرت کرسی پر بیٹھ گیا۔ زمین پر سیاڑے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ ایک چمکا اٹھا کہ - میں نے عشرت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا - تم فلم میں کام کرتے ہو ۛ

”ہاں - عشرت نے کہا۔

عشرت رات سے بھوکا تھا۔ اسی لئے بار بار ابلتی ہوئی ہانڈی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی ماں نے آؤں کے مٹھوے کاٹ کے ہانڈی میں ڈال دیئے۔ پہلے چاول ڈالے جا چکے تھے۔ جب ٹھک کے بعد ہلدی ڈالی گئی۔ تو ہانڈی میں بڑا مزے دار اُبال آیا۔ سوندھا سوندھا۔ پیلا پیلا۔ جھاگوں والا سوں سوں کرتا ہوا اُبال، عشرت کی آنکھیں اندھے سے کھینچنے لگیں۔ اس کی نگاہیں ہانڈی پر جم گئی تھیں۔ یکایک اُس نے دیکھا۔ اُن پانچ پتھوں کی نگاہیں بھی اس ہانڈی پر جمی تھیں، نگاہیں گرسندہ منہ میں پانی گردن کا حلقوں نیچے سے اوپر اُڑا رہی تھیں جیسے جاتا ہوا اسٹری ہو رہا تھا۔ موت سے زندگی کی طرف، زندگی سے موت کی طرف۔

ہانڈی کب تیار ہو گئی۔ کب چاول پلٹے گئے۔ کس طرح ہاتھ بچھے۔ کس طرح جبرے پلے اور ڈالے اُترے۔ عشرت کو اور دوسرے بچوں کو کوئی علم نہ تھا۔ بس ایک بھوک تھی جو ایک خون آشام چمکاؤ کی طرح رات کے تاریک سایوں کی طرح ان کی روح پر اُن کے جوش و احساس پر سیلی ہوئی تھی۔ اور جب چمکا ڈالنے اپنا خون پی لیا تو وہ سب نڈھال ہو کر وہیں فرش پر جانوروں کی طرح سو گئے۔ اُردو آٹھوں اور بیاز کے چمکوں اور ناک میں سے ہوئے چاول کے چند دانوں کو اٹھا کر روضہ نے کمر کی کے باہر بھینکتے ہوئے دیکھا کہ باہر بازار میں دوکانوں پر خوب صورت کتابیں رکھی ہیں۔ اور ڈور یوں پر اٹھو کے گتھے ٹھک رہے ہیں۔ کپڑے دانے کی دوکان پر خوش پوش عورتیں رشیم کی ساڑیاں خرید رہی ہیں۔ اور دستوران سے مٹھائے دار شاہی کبابوں کی خوش بو اُٹھ رہی ہے اور روضہ نے سوچا کہ بازار

میں کتابیں پک رہی ہیں۔ لیکن اس کی بہن کے بچے اُن پڑھیں۔ وہ اخبار سچے ہیں پڑھ نہیں سکتے۔ اور
 دوروں پر نکلے جوئے اٹھار کھائے ہیں اور ریشم بہت جھگڑے۔ اور شامی کبابوں کی خوشبو بہت قہر ہے
 ایک آدھ کے ساتھ اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور فرش پر پاؤں پھیل کے لیٹ گئی۔ فرش ٹھنڈا تھا
 اور اس کے جسم کا ہر انگ دن بھر کی شوٹنگ کی مشقت سے ٹوٹ رہا تھا۔

رفیع نے کہا ”میری بہن کا خاندان کبھی تمہاری طرح آیا تھا، بیرو بٹنے کے لئے آخر غور کشی کے مرگیا
 اس کے غم میں میری بہن تپ دق سے مر گئی۔ آج تم جب سٹوڈیو میں کوڑے کے ڈیسر پر بیٹھے تھے
 تو مجھے تمہارا ارادہ نیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔“

عشرت نے اس پر کہا: ”کیسی کیسی امیدیں نے کے آیا تھا۔“

”کوئی اُمید ایک دم پوری نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر تم محنت کے لئے تیار
 نہیں ہو تو واپس اپنی ماں کی گود میں لوٹ جاؤ۔“ رفیع نے طنز کیا۔

”میں واپس نہیں جاؤں گا۔“ عشرت نے جواب دیا۔

”تو پھر کیا کرو گے؟“

”تمہاری طرح ایجنٹر بن کر کام کروں گا۔ تمہاری ایجنٹر انجمن کا ممبر بن جاؤں گا۔ کل بے ایک کھڑے
 سٹوڈیو، ممبری کا۔ سنا ہے اس کا ڈاکے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

”اور بیرو دھپکے ہو گے؟“ رفیع نے پوچھا۔

عشرت چُپ ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کروٹ بدل کے سو گیا۔

دوسرے دن رفیع عشرت کو لے کر رفیع کے گھر گئی۔ جہاں پردہ کی ایک لگی میں ایک لڑکی

دستوران کے اور پڑا تو تھا۔ رضیہ کی ماں اپنا چچی کوٹ گھٹنوں سے اُپر کے سو رہی تھی رضیہ کا جانی
جوا یک موٹر ورک شاپ میں کینک کا کام سیکر رہا تھا۔ ایک کمرہ کی میں بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ رضیہ
دانت صاف کر رہی تھی۔

رضیہ نے عشرت کو رضیہ سے بلایا۔ رضیہ اُسے دیکھ کر مسکرائی۔ پھر خنسی۔ پھر خوب زور سے خنسی۔ آخر
کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

رضیہ نے رضیہ کو گلے لے جاکے کہا "ہائے کس قدر سوٹ ہے۔ باطل گذر سا معلوم ہوتا ہے۔ میں تو
اگر اپنے دلدار کو نہ چاہتی۔ تو اُسے چلبنے لگتی۔ فنا ہو جاتی۔ بلکہ ..."

وہی عشرت کی حویلی میں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ پہلی ہی نظر میں اکثر لڑکیاں اُس پر فریفتہ
ہو جاتی تھیں۔ اس کی خوب صورتی میں مردانہ وقار کے علاوہ ایک عجیب طرح کا بھولپن مصورت سی
تھی۔ یہی نہیں مگر معلوم ہوتی تھی۔ اور جب وہ اپنی موٹی موٹی پگلیں اٹھا کر ترچھی کھابوں سے کسی لڑکی کی
طوت ایک عجیب بے بس کی اداسے دیکھتا تھا تو وہ لڑکی بقول رضیہ وہیں "فنا" ہو جاتی تھی اس وقت
بھی عشرت نے کچھ ایسی ہی نگاہ سے رضیہ کی طوت دیکھا تھا۔ اس کی نگاہ عورت میں ماسکائے ایسے شہ
جذبات پیدا کر دیتی تھی کہ اکثر لڑکیاں اُسے بیک وقت محبوب کے اور ماسکائے بے چلے جذبات سے
چلبنے لگتیں اور اس قسم کی چاہت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ رضیہ کو نہیں معلوم تھا، مگر رضیہ جانتی تھی
اسد ایک ہی نگاہ میں اس نے جان لیا تھا کہ عشرت کا من کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"ای ا تو کہاں پھنس گئی؟" اس نے رضیہ سے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں؟" رضیہ اس کے شلنے پر ہاتھ مار کے سرگوشی میں دلی "موٹی، اچلا، مانی بی۔ بات
نہیں سنائی۔ اپنی کہے جاتی ہے سبے چارہ۔"

رضیہ نے عشرت کی طوت اشارہ کیا "شریف خاندان کا ہے۔ ۷۴ ہے۔ گھر سے بھاگ کے یہی ہیں

میر دہنے کے لئے آیا تھا اب اس کا داغ ٹھکانے آ گیا ہے۔ ظلم و کجسازوں میں تم اسے میر بنو اور
ٹھاکر گجراج تمہاری بات سن لیتے ہیں۔“

ہاں مگر یونین میں پہلے ہی سے پانچ ہزار ممبر ہیں۔ رضیہ نے اعتراض کیا۔

”ایک اور سچی اور تو اس کی ماویٰ زبان ہے۔ بہت ابھی باتیں کرتا ہے۔ درجہ اول کا کارڈ اسے
مل جائے گا۔ اپنی روٹی کما کھائے گا۔“

”اور کارڈ کی فیس پندرہ روپے؟“

رضیہ بولی ”پانچ سو روپے پاس ہیں۔ دس تو ڈال دے۔“

”خدا ہو گئی تو“ رضیہ مسکرا کے بولی۔ ”اے بیٹی! اگر اس طرح سے تو اس پر خرچ کرے گی۔ تو بالکل مر جائے
گی۔ یہ تو مجھے کچا کھا جائے گا۔ اس کی خوب صورتی پر نہ جا۔ رُو۔“

”ہل ہٹ کہینی۔۔۔۔“ رضیہ جھنجھلا کے بولن ”مجھے تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں سونگتی ہیں۔ انسانیت
بھی کوئی چیز ہے۔“

”میں بھی تو ازراہ انسانیت کہہ رہی ہوں۔“

”تو بس بھٹک ہے۔ انسانیت تک رہنا کیسے محبت تک نہ پہنچ جاتا۔ درجہ انجام برا ہو گا۔ رضیہ
لے بھایا۔“

”اچھا اب پٹے گی بھی کہ باتیں سنائے گی؟“

”فردا تیار ہوں۔“ رضیہ بولی۔

کوئی ڈیرہ دو گھنٹے میں رضیہ تیار ہوئی۔ اس کا سنہارا رنگ سبز ساڑی میں اور بھی ٹھکرایا تھا
ہاں کے تپے جو سر کے اوپر سے سینے آئے تھے۔ اس کے شانوں پر کچا کر سنہرے جموروں میں تبدیل
ہو جاتے تھے۔ پاپاٹنگ کی چھاپ بہت گہری تھی۔ یا قوت سے بھی گہری۔ سرخ۔ کچھ کچھ کاسنی رنگ

اس میں جھلکا تھا جس سے رضیہ کے لب بڑے زہریلے معلوم ہوتے تھے۔ رضیہ اپنے لبوں کی وجہ سے
 ۵۱ خطرناک جنگ دل کش بھی جاتی تھی۔

فلم ایکسٹرا یونین کے دفتر میں پہنچ کر جو داروین روڈ پر واقع تھا۔ رضیہ عشرت اور رضیہ کو لے کر سیٹی یونین
 کے صوبہ کے دفتر میں کھس گئی۔

ایکسٹرا یونین کا صوبہ مندر گوراج سنگھ تھا۔ گوراج سنگھ کا محلی تھا اور کھدو پھنسا تھا۔ اور سماجی
 فلموں کا ہیرو بھی رہ چکا تھا۔ مگر کھدو پہنچنے والے باغیانہ سیاسی خیالات رکھنے والے ہیرو کی قدر اس
 ماحول میں کہاں ہوتی۔ جو اپنے دھڑکھڑاہٹ میں، فرزند معاشرت میں، لباس میں، فرخندہ میں، پہنچ میں،
 زندگی کے ہر شعبے میں اپنی دوڑ کی نقل کرتا تھا۔ تیو یہ بوا کہ گوراج سنگھ آہستہ آہستہ سماجی فلموں میں خیر مقبول
 ہوتا گیا۔ شراب سے، رندی بازی سے، نیت سے، سڑن سے یعنی ان تمام باتوں سے گوراج سنگھ کو
 نفرت تھی جن سے فلم انڈسٹری کا ماحول متاثر تھا۔ مجبور ہو کر گوراج سنگھ کو دھارمک تفسیروں میں آنا پڑا۔

جہاں پیسے بہت کم ملتے تھے۔ یہاں بھی اپنی افادہ طبع سے مجبور ہو کر وہ زیادہ دیر تک ایک سماجی
 دھیرے دھیرے بے کار ہوتا گیا۔ اب گزشتہ تین چار سال سے اسے کسی فلم میں ہیرو کا کام نہیں مل رہا تھا
 اس سے پہلے تو نہیں۔ لیکن اپنی بے کاری کے دنوں میں اسے ایکسٹرا لوگوں کی یونین بنانے کا

خیال آیا۔ جب وہ غم و ملالت سے مجبور ہو کر تقریباً ایکسٹرا ساہوکر رہ گیا۔ تو اسے ان لوگوں کو قریب
 سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ جو تعداد میں ہزاروں تھے۔ مگر غیر منظم بلکہ قطعی طور پر زراعی حالت میں تھے
 یہ لوگ شوڈو یور شوڈو ریگموتے تھے۔ اور ایکسٹرا سپلائر لوگوں کے گھروں پر چکر لگاتے تھے۔ کام کے
 لئے۔ نہ ان کا کوئی ریٹ بندھا ہوا تھا نہ ان کی کوئی عزت مقرر تھی۔ ایک ایکسٹرا سپلائر کو ایک طرح

ان کی جان و مال اور عزت کا شیکہ دار تھا۔ ایک فلم کمپنی ایک ایکسٹرا سپلائر کو فلم کے دوران میں
 ایکسٹرا لوگوں کو سپلائی کرنے کا شیکہ دے دیتی اور پھر سپلائر اپنی مرضی سے اپنا ریٹ لگے کہ ان لوگوں

کھام دیتا۔ کہنی سے پندرہ روپے فی ایکسٹر الٹیا۔ اور سات روپے اوپر باندھتا۔ کسی کو سات دیتا۔ کسی کو پانچ۔ کسی کو دو روپے پر ہی ٹرغا دیتا۔ اور ایکسٹر سورتوں کی تو وہ بھی بڑی مالت تھی۔ انہیں کام کرنے کے علاوہ اپنی عزت بھی سپلائی کرنی پڑتی تھی۔ ایک ایک ایکسٹر سپلائر نے درجنوں آخائیں پال رکھی تھیں جیسے ڈوبے خانے میں مرغیاں پالی جاتی ہیں۔ کبھی ایک کی آکشتنا غلطی سے یا غصے میں کڑا کڑائی ہوئی گئی دوسرے ایکسٹر سپلائر کے پاس چلی جاتی۔ تو دار میں دھڑ بڑ دنگا شروع ہو جاتا۔ چھریاں اور چاقو پلٹنے لگتے۔ جس میں ایک ایکسٹر سپلائر کا گروہ دوسرے سپلائر کے گروہ پر شیش ہو کر حملہ کر دیتا۔ پولیس آجاتی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوتا۔

دار میں سود کی بہار ان ایکسٹر لوگوں سے تھی۔ اس سڑک پر چار سو ڈلو تھے۔ ایک چھوٹے چھوٹے کینوں والا قوی بوتل تھا۔ ایک مسجد تھی ایک شراب خانہ تھا، مگر مسجد کے زیر سایہ تھا۔ کچھ پان کی دکانیں تھیں کچھ لاندڑیاں، دھڑیوں کی دکانیں تھیں۔ باقی سب دستوران تھے اور پنجابی سندھ تھے۔ اور سب کے سب میلے کھیلے گندے غلیظ۔ ہر دکان دار ایکسٹر لوگوں کو اُدھار دیتا تھا اور یہاں بڑا دھندا اُدھار پر چلتا تھا۔ پان کے بیڑے سے شراب کی بوتل تک ہر چیز کو پان سے ملتی تھی۔ اور اکثر اوقات جب کوئی ایکسٹر ابھا جاتا۔ یا ایکسٹر سپلائر ڈیوالیہ ہو جاتا۔ تو دکان دار کے ہاتھ میں صرف کپن ہی کو پان رہ جاتے۔ ان دکانوں کے اوپر کے کمروں میں مختلف فلم کمپنیوں کی عکاسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دی گریٹ لوجیا د فلم کمپنی۔ سردار جگت سنگھ الہودالہ کی کمپنی تھی۔ جنہوں نے جنگ کے دوران میں بھارت کو گئی سپلائی کر کے ایک چھوٹے سے ٹیکے میں پالیس ہزار کمائے تھے۔ اور اب وہ پالیس ہزار سے ایک فلم کمپنی کھولے ہوئے تھے۔

”دھپ پسترا“ فلموں کے کوئی تراسی جی کھولے ہوئے تھے۔ جن کا باپ مولے شے کھان کے لئے ایک بھلان چھوڑ گیا تھا۔ تیروی ہی اس مکان کو جس بڑوں میں ٹھکانے لگا کے بیٹے لگے تھے۔ اب یہ

ہیں ہزاروں ٹھکانے لگ گیا تھا۔ لیکن اس دہائی میں انہوں نے ایک فنی مقامہ کنول سے آٹھ لاکھ پیدل کر لی تھی۔ کنول کے پاس دس ہزار نقد تھا۔ جسے اب وہ ٹھکانے لگانے کی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے کہنی کے لئے ایک تھی گھٹی پر لکھنے کو دیا تھا۔ "کنول چتر" دادو میں سوڈ پختیاں بدلتی رہتی ہیں۔ اور جس چیز سے فلم کہنی کی تختیاں بدلتی ہیں۔ اس سے فدا کم تیری پہنچے۔ کانول کی تختیاں بدلتی نہیں۔ مگر بدلتی ضرور تھیں۔ کیوں کہ پورے کا پورا بازار فلم انڈسٹری پر زندہ تھا۔ اس لئے اس کی تھی معاشرت اس کے صحیح سماجی نقطہ نگاہ۔ اور اس کے پورے سماجی، مالی اور منشی احوال کی عکاسی کرتا تھا۔ دادو میں روڈ پر کھڑے ہو کر آپ آدھے گھنٹے میں دیکھ سکتے تھے کہ ہڈتانی فلم انڈسٹری کی کیا حالت ہے۔ حالانکہ اس لئے شوز روڈی۔ دادو اور لاہور پہلے سے لے کر ملاؤنگ میلوں اور تک پہلے ہونے تھے۔ مگر دادو میں روڈ کے اس آدھے فروگ کے فاصلے میں آپ اس میلوں اور پہلی ہوئی حقیقت کو ایک جگہ دیکھ سکتے تھے۔

بہت آہستہ۔۔۔ بہت ہی دھیرے دھیرے۔۔۔ بڑے مبرا اور استقلال سے اور کئی ایک ناکامیوں کے بعد گجرات لے ایجنٹر لوگوں کی یونین بنائی تھی۔ شروع شروع میں اسے بہت سی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایجنٹر سپلائر لوگوں کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی۔ کئی لوگوں نے اُسے جان سے مار دینے کی دھمکی دی۔ اس پر وہ ایک بار چاقو سے حملہ بھی کیا گیا۔ مگر گجرات بڑی خندہ خیزانی ہے۔ سب کچھ سہتا گیا۔ ٹھیک ہے، اپنے کام میں اُسے مفاہمت کرنا پڑی۔ اپنے اصولوں سے بہت ہٹ کے یہ یونین بنائی پڑی۔ کیوں کہ یہ وہ کرنل کی صحیح یونین نہ تھی۔ اس میں ایجنٹر سپلائر لوگ بھی شریک تھے۔ اس طرح سے کہ گوا ایجنٹر لوگ یونین کے کارڈ پر فلم کہنیوں میں جلتے تھے۔ گوان کے ریٹ بھی بند ہو گئے تھے۔ مگر اب بھی وہ ایجنٹر سپلائر کی عزت ہی جلتے تھے۔ اور شوز روڈ لے اور فلم کہنیوں والے اب بھی ایجنٹر لوگوں کا معاوضہ سپلائر ہی کو ادا کرتے تھے۔ ٹھیک ہے۔ سپلائر لوگوں کا کیشن اب بھی اُن کے ریٹ کی طرح بند ہو گیا تھا۔ مگر چونکہ رقم کہنی سے سپلائر کو ادا ہوتی تھی۔ اس کا پتہ ہمیشہ

بھاری رہتا۔ وہ کبھی کہتا۔ رقم نہیں ملی۔ کبھی کہتا کم ملی ہے۔ کبھی کہتا اسنے لے جاؤ۔ اسنے گئے رہتے ہوئے لے جاؤ۔ نہیں تو یہ بھی گئے۔ اور عورتیں، جو نو ذرا نظر تھیں۔ وہ تو کچھ بہتر حالت میں تھیں اور جو رفیق کی طرح رہنے کے کاڈ پر بھروسہ کرتی تھیں وہ دھٹکے کھاتی تھیں۔

اور سپلاؤ لوگ اور کمپنی کے لوگ اور سٹوڈیو کے لوگ یعنی سب لوگ اُن سے ناخوش رہتے تھے۔ اور کبھی ٹھیک بھی ہے۔ بعض اے داغ، بے وقوف بھری جیسے لوگ عورت کہتے ہیں۔ آخر کس لئے ہے؟ گجرانج سنگھ کو ان تمام غلامیوں کا پتہ تھا۔ مگر وہ کہتا۔ "دیکھو، اسنا تو ہوا، اب ہولے ہولے اس سے آگے بھی کچھ ہو جائے گا۔ ایک دن میں آرمی نہیں ہی تھی۔ ایک دن میں تو رام نے بھی سیتا کو۔" ان سے نہیں جیت لیا تھا۔ پھر — میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔"

گجرانج نے رضیہ کو دفتر کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا۔ اور اُسے کاغذ کا ایک پردہ دکھانے کہنے لگا۔ ایک اور کمپنی تیرے ہاتھ سے گئی۔
"کیا ہوا؟" رضیہ بڑے مطمئن لہجے میں بولی۔

"یہ چند اہلکار پروڈکشن والوں کی طرف سے فزٹس آیا ہے۔ انہوں نے کھا ہے کہ اُن کی کمپنی میں ایکسٹرا لوگوں کو سمیجے وقت رضیہ کو کبھی بھرتی نہ کیا جائے۔"

رضیہ سُکرائی۔ اب تک کوئی پسندہ کمپنیاں اُسے اپنی بلیک لسٹ پر رکھ چکی تھیں۔ گجرانج نے رضیہ کو بھالتے ہوئے کہا: "تو ایسا کیوں کرتی ہے رضیہ؟"

مگر رضیہ کیا بُرا کرتی تھی۔ وہ بھی کتنی تھی نا۔ کہ جب کبھی اُسے کسی فلم کمپنی میں کام ملتا اور چونکہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس لئے اُسے جلدی کام مل جاتا۔ اور پھر ڈائریکٹر اُسے انتخاب کرتے چونکہ اُنک سے اپنے کمرے میں بلا کر اُسے ایک بہت عمدہ۔ بہت انچائنی میں ہیروئن سے کچھ ہی کم دے گا۔ وہل دینے کا وعدہ کرتے۔ اگر! اور اب اس "اگر" کے تو وہی جواب ہو سکتے تھے۔ یعنی ایک تو جوتا

بہرہ کج سکر سے مخاطب ہو کے بولی: لو اپنے پندرہ روپے۔ لاکا خوب صورت ہے۔ مگر جو بیٹ
ہے۔ اورو اس کی مادری زبان ہے۔ اقول وہ جے کا کارڈ بنا دو۔ تمہیں زندگی بھر دعا دے گا:

کارڈ لے کے عشرت باہر نکلا۔ تو رضیہ نے اس کا تعارف دو چارہ دوسرے ایکٹر بائیں
سے کرا دیا۔ اور پھر ٹرکے رضیہ سے کہنے لگی: "وہ تو بہار پر و دشمن والوں نے بلایا ہے۔ انہیں ڈانس
کی کچھ لوگیاں چاہئیں۔ چلو:"

رضیہ نے عشرت سے کہا: "میں جلتی ہوں۔ اب تم خود گھرا جاؤ گے نا؟"
"ہاں!"

رضیہ جب چلنے لگی۔ تو عشرت اس کے پیچے دوڑا دوڑا گیا۔ رضیہ نے پوچھا "کیا بات
ہے؟" یکایک عشرت خاموش کھڑا رہ گیا۔ رضیہ نے پھر پوچھا "کیوں بولو۔ کیا بات ہے؟" تخری
شعل سے عشرت نے کہا: "وہ میں کا کراہی:"

رضیہ نے عشرت کو ایک اٹھتی دی تھنی دیتے ہوئے رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "بے چارہ!"
بعد میں میں میں میٹھ کر فوہار پر و دشمن کی طرف جاتے ہوئے رضیہ نے رضیہ سے کہا
'کم نجت ہر زیادہ ترس نہ کھایا کر۔ مرجائے گی:"

"کیا کروں" رضیہ بولی: "مجھے بے چارے پر ہمارا رحم آتا ہے:"

رات کو جب رضیہ ڈانس کی رہبریل کے بعد گھر لوٹی تو عشرت ابھی تک آیا نہ تھا۔ مالک
لیارہ بچ چکے تھے۔ رضیہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ کہاں گیا۔ یہی میں فورا دہے۔

لیا ہو۔ مگر دیا بچ بھی نہیں۔ پھر اس کے دل میں رضیہ کی باتیں گونسنے لگیں عجیب عجیب طرح۔

دوسرے اور شیعہ دل میں آنے لگے۔ رضیہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ ان مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ رضیہ فرش پر لیٹی اپنے کمرے میں انتظار کرتی رہی۔ ایک کونے میں اس نے حضرت کے لئے سجی اور چادر بچا دی تھی۔ فرش کو خوب جھاڑ دے صاف کیا تھا۔ ٹبے میں اس کا کھانا بند کر کے رکھ دیا تھا۔ آٹا کو روشنی میں خیند نہیں آتی۔ اس لئے اس نے بجی گل کردی تھی۔ مگر رضیہ کی آنکھوں میں خیند نہ تھی۔ بھلا خیند کیوں نہیں آتی۔ وہ کیوں ایک اجنبی کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ کون ہوتا ہے اس کا۔ وہ تو کونجی نہیں جانتی اس کے متعلق۔ جلنے سے کیا ہوتا ہے۔ اسے اپنے متعلق اتنا کچھ معلوم تھا۔ ایک شریف مسلم گھرانے کی بیٹی۔ باپ چھوٹا سا جاگیر دار۔ مگر میں ایک موثر۔ آبا کے ہاں لڑکا کوئی نہ تھا۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی جو بیاہ دی گئی۔ پھر بہت مدت کے بعد رضیہ ہوئی۔ مگر آبا نے مجھے لڑکا ہی سمجھا۔ ہمیشہ لڑکوں کی طرح ہی دکھا۔ فیص میں اور پاجلے میں اور تکی ٹالیا میں۔ مجھ سے مردوں کی طرح باتیں کرائیں۔ پھر آبا مر گئے۔ وہ موثر بھی مٹی گئی۔ وہ مکان بھی چلا گیا پھر بڑی بہن کا شہر مر گیا اور آٹا رضیہ کو اور بڑی بہن کے پانچ بچوں کو لے کر حیدر گورہ کے ایک چھوٹے سے نخلستان مکان میں ہٹی آئیں جس کے آگے میں جام کا ایک پیڑ تھا۔ آٹا نے ایک بہت ہی خوب صورت مرد سے رضیہ کی شادی کر دی۔ اسلم آنکھیں خیل تھا۔ اور ایک بڑے جاگیر دار کا لڑکا تھا۔ اچھا ہے، شادی اپنے خاندان میں ہوئی۔ لڑکا اپنے خاندان کا ہے، گوا اور دے۔ بڑا بن ہے۔ اور بے کار ہے۔ مگر بے تو اپنے خاندان کا۔ خاندان کی عزت رہ گئی۔ آٹا نے بڑا شکر ادا کیا اور کسی کسی ڈنگا کی ہے۔ اللہ اس جوڑے کو خوش رکھے۔ چند دن تو یہ جوڑا خوش ہی رہا۔ مگر پھر پولیس ایجنٹ ہو گیا۔ اور اسلم کے پاس چونکہ کوئی کام نہ تھا۔ اور اس لئے وہ رضا کاروں میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اس لئے پولیس ایجنٹ ہی وہ شہر سے باہر بھیجا گیا۔ تندو چٹو میں۔ مگر تندو چٹو میں بھی پولیس ایجنٹ ہوا۔ چنانچہ اسلم مار گیا۔ مگر والوں کو اس کی لاش نہیں ملی، مگر موت کی خبر مل گئی۔ رضیہ

بہت روئی دھوئی۔ حالانکہ مرنے سے چند ماہ قبل اسلم نے اُسے ایک بہت ہی بڑی "خفیہ" بیماری عطا کی تھی۔ جو وہ کسی "باہر والی" سے لے کے آیا تھا۔ رُفیعہ تو مکمل شرکے کو نہ کہ ہو گئی ہوتی۔ اگر اتناں کو بروقت پتہ نہ چل جاتا۔ اور حیدر کو ٹوٹے کے حکیم سلطان صاحب انداؤ بھدروی اس کا شافی علاج نہ کرتے۔

پھر کبھی اتنے علاج کے بعد بھی رُفیعہ کی رِجحت جو پہلے گندی تھی، اب سادلی سی ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر اکثر دانے سے نکل آیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ پھر کبھی "۔۔۔ رُفیعہ اپنے خاوند کے مرنے پر روئی تھی۔ کچھ بھی ہوا اس کا خاوند جو تھا۔ اور لوگ کہتے تھے کہ اسے روزنا چاہئے۔ حالانکہ اندے سے اسے اپنے خاوند سے سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ وہ روئی، اور پھر اسے فالتے بھی کرنے پڑے۔ کیوں کہ وہ لوگ عزت دار تھے۔ اور پولیس انجیشن کے دنوں میں اور اس کے بعد بھی کئی دنوں تک گھر سے باہر نہ نکلے۔ آنگن میں جام کا پیر تھا۔ رُفیعہ کو یاد ہے۔ کئی بار سالن نہ ہونے سے اس نے خشک روئی کے ساتھ جام کے پھل کھائے تھے۔ پھر مام بھی ختم ہو گئے۔ اور گھر میں کچھ نہ رہا تو۔۔۔۔۔ ایک دن۔۔۔۔۔ بلکہ ایک شب رُفیعہ گھر سے نکل بھاگی۔ اور سیدھی ایک طوائف کے پاس پہنچی۔ کیوں کہ وہ ایک شریف عورت دار گھر لے کر گئی تھی۔ اور اس نے اُسے کوئی کام نہیں آتا تھا۔ نہ وہ چاول کوٹ سکتی تھی۔ نہ برتن صاف کر سکتی تھی۔ اس نے وہ سیدھی طوائف کے پاس گئی۔ اور پھر جب اُس نے ٹاکہ کو دیکھا تو لوٹ آئی۔ جانے کیا ہوا۔ کیوں اس کی مدد سے اس کے جسم نے اس کی ہستی کے ذرے ذرے لے اس کام سے ایسی بغاوت اختیار کر لی کہ رُفیعہ مجبور ہو کر روئی ہوئی وہاں سے واپس آ گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ یہ پیشہ اختیار نہیں کر سکتی۔ اور جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ کتنی عورتوں کا یہ دھند ابھی نہیں کر سکتی تو پھر وہ اپنی امان کے صلح شدہ کے خلاف پردے سے باہر آ گئی۔

بابر کی دنیا میں! اس نے سوچا۔ وہ مردوں کی دنیا میں مردوں کے لئے جگہ بنائے گی۔ اس لئے کہ اسے زندہ رہنا ہے۔ اور چونکہ اب وہ طواغیت بھی نہیں بن سکتی تو اسے لامحالہ ایک شرین عورت کی طرح رہنا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی کام کرنا ہوگا۔ مگر حیدر آباد میں وہ کراچی برادری کے اصولوں کو توڑ کر۔ وہ برادری جو اس کے لئے کچھ کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ رہ کیسے سکتی تھی۔ کام کیسے کر سکتی تھی پھر بھی ریڈیو پر اسے کچھ کام مل گیا۔ اور ریڈیو پر اس کی واقفیت پرمیں ایجنٹ کے دنوں میں ہوئی تھی جب اس نے اپنے خاندان کی تعلیم میں ریڈیو پر ایک ڈرامے میں کام کیا تھا۔ اور حیدر آبادی زبان میں مردار پیشیل کے خلاف ایک فیچر بھی لکھا تھا۔ غصیت ہے کہ اب ریڈیو والوں کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کیوں کہ بہت سے پُرانے لوگ چلے گئے تھے۔ اور نئے لوگ آگئے تھے۔ اور یہ نئے لوگ کہتے تھے: خدا جانے خوشامد تھی کہ حقیقت کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ اس لئے اس نے چند ماہ ریڈیو پر کام کیا۔ اور جب یہاں بھی ایک ماسٹرب نے اُس سے محبت ظاہر کی۔ جین کا مشعل ہی محبت ظاہر کرنا تھا۔ اور جو محبت سے اپنا ہی اس طرح بھلاتے تھے۔ جیسے لوگ فرصت کے اوقات میں باکی۔ فٹ بال۔ گیند یا چورسے اپنا ہی بھلاتے ہیں تو رُفیعہ کو اس محبت کے لحاظ سے ایک عجیب کہاسیت سی پیدا ہوئی اس کی رگوں میں بھی محبت محبت کا زہر پاتی تھا۔ جو اس کے شوم نامدار نے اُسے دیا تھا۔ اتنی جلدی وہ کسی دوسری جگہ کیسے محبت کر سکتی تھی۔ ناچار رُفیعہ کو حیدر آباد چھوڑ کر کوئی آنا پڑا۔ اور فلم کمپنیوں کا سہارا لینا پڑا۔

جاگتے جاگتے صبح ہو گئی۔ اس رات رُفیعہ نے اپنی ساری زندگی بھر سے چڑھ ڈالی جسے وہ کئی بار بڑھ چکی تھی۔ وقتی طور پر اس کے دل میں جو لورزش پیدا ہوئی تھی اُچھ کے کونے میں جو ایک آنسو سا جھللا یا تھا اندھیرے میں کہیں سے جو روشنی کی ایک کرن آتی تھی۔ اس کے بازوؤں میں جو ایک اُمید سی کسمائی تھی۔ یہ ایک وہ اس کے اعصاب میں ٹوٹ ٹوٹ سی گئی۔ وہ اپنے جسم کے بند بند میں اُسے لٹٹا ہوا دھجکھ سکتی تھی۔ ٹس سکتی تھی، جھک سکتی تھی۔ ہائے کتنا تلخ ذائقہ تھا۔ مگر زندگی تو ہوتی

ایسی ہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کی زندگی۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی زندگی۔ خوب صورت سپنا تو ایک اعترافاتی کی طرح ہوتا ہے۔ اور سر سے پاؤں تک سارے اعضاء کو گھنچوڑا ہوا چلا جاتا ہے مگر چلا جاتا ہے۔ اور پھر کبھی نہیں آتا۔ عشرت کی طرح۔
 رفیعہ کا جسم گندھے لٹے کی طرح کچا کچا سا ہو رہا تھا۔
 یکایک دروازے پر دستک ہوئی۔
 آٹاں نے دروازہ کھولا۔

عشرت دروازے پر کھڑا تھا۔۔۔۔۔ مسکرانا ہوا۔ جھجکتا ہوا۔ اندر آیا۔ سیدھا رفیعہ کے پاس۔ اس کے چہرے پر بیک آپ کے نشان تھے۔
 عشرت نے کہا ”مجھے رات کے لئے ایک بیک آپ ل گیا تھا بولنے کا پارٹ تھا بہت سی بیجے کا۔ پہلا ترنے پانچ روپے کھانے کے لئے ایڈوانس دئے۔۔۔۔۔“ عشرت ٹرک گیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی میں سے ٹٹول ٹٹول کر پانچ روپے کا ایک پڑانا بوسیدہ سافٹ نکالا۔ اور اسے رفیعہ کے ہاتھ میں نظریں نمی کر کے دے دیا۔

رفیعہ کا دل کانپنے لگا۔ اس ہلکے سے کمزور فوٹ کی طرح۔ جو اس کی انھیلیوں میں کانپ رہا تھا۔ اس کے دونوں مددیں میں خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس کا جی چاہا۔ کہ وہ عشرت کا سر جھکائے اپنے سینے پر رکھے۔ جواب اس طرح ایک گناہ گار کی طرح اس کے سامنے آئیں۔ نیچے کئے کھڑا تھا۔ مگر اس نے اپنے آپ پر ضبط کر لیا۔ اور بڑے تحمل سے بولی ”تمہارے لئے کھانا رات بھر سے رکھا ہے“ اس کے بعد چو لھے کی طرف کھانا گرم کرنے کے لئے چلی گئی۔

جب اکرم کے دن اپنے تھے۔ وہ کہاں رہتا تھا۔ کہاں اس کے پاس چارکرے کا ایک عمدہ فلیٹ تھا۔ فلیٹ میں غلیچے تھے۔ عمدہ فرنیچر تھا۔ ریڈیو گرام، ریفریجریٹر، ٹیلی فون، چاندی کے برتن، کتابوں کی لائبریری، سبھی کچھ موجود تھا۔ اس کی باہمی رنگ کی ڈائجسٹ سے اپنی جان سے بھی پیاری تھی۔ مگر جب اس کی تصویریں، کام ہوئیں۔ اور جب پروڈیوسروں، ڈسٹری بیوٹروں اور فنانسروں نے اس کی سماجی مقصدیت کو روپے کے ترازو میں تولی۔ اور اس میں بہت کم وزن پایا۔ تو انڈسٹری نے دو صبرے دو صبرے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ دو صبرے دو صبرے اس کی فلیٹ کی چیزیں جنہیں اس نے انتہائی شوق سے خریدا تھا۔ ترے سے اٹھنے لگیں۔ ریڈیو گرام گیا۔ ریفریجریٹر گیا۔ چاندی کے برتن گئے۔ آخر میں ڈائجسٹ کا ٹی بلی گئی۔ کتابیں اس نے آخر تک پچا کے رکھیں، مگر جب وہ فلیٹ کا کرایہ دس ہفتے مسلسل نہ دے سکا تو ہفتے مکان نے جو غیر معمولی طور پر شریعت تھا۔ اس کی کتابوں کی لائبریری اپنے قبضے میں کر لی، اور اسے فلیٹ سے نکال دیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ جب بھی وہ فلیٹ کا کرایہ ادا کر دے گا۔ اُسے اُس کی کتابوں کی لائبریری واپس مل جائے گی۔

اس بات کو آج دو سال ہونے کو آئے۔ اکرم ابھی تک اپنی کتابوں کی لائبریری نہ چھڑا سکا

تھا۔ اپنی کتابوں کے چھپ جانے کا اُسے انتہائی غم تھا۔ اب وہ کھارے پرل میں آگیا تھا۔ جہاں اس کی بڑی بہن رشیدہ جو یہودی تھی اور مسلم گرل اسکول بائی کھلم میں اسی روپے میں شجر تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتی تھی۔ جگہ بہت کم تھی۔ کیوں کہ اسی کمرے میں بچے سوتے تھے راتے بجاڑتے اور پڑھتے تھے۔ اسی کمرے میں رشیدہ کھانا پکاتی تھی۔ اپنے بچوں کے کپڑے سیتی تھی۔ کپڑے دھوتی تھی۔ کمرے کے کونے میں ایک ٹی تھا جس کے گرد و فٹ اپنی دیوار تھی جو پرے کے لئے لٹا ہوا تھا۔ ہمارے رشیدہ نے پرودہ ٹانگ کر کچھ تھوڑا سا انتظام کیا تھا۔ کمرے سے لگی ہوئی ایک بالکونی تھی۔ اگر وہ اسی بالکونی میں سوتا تھا۔ میں پر اس نے اپنے کپڑوں کا ٹرنک اور چند کتابیں ایک ریک پر رکھ لی تھیں بالکونی میں کھلی ہوا آتی تھی۔ اور سونے کے لئے بہت عمدہ جگہ تھی۔ اور اس کے سامنے کی بلڈنگ کی دو جنوں ایسی بالکونیاں تھیں۔ جہاں زندگی۔ اس کی اپنی زندگی کی طرح دھڑے اور پنگی یا سرنٹ ایک بنیان پہنے ہوئے نظر آتی تھی۔ آدمی کپڑے پہن کر کھڑا ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُس کے احساسات اور خیالات اور جذبات نے بھی ایک نفاذ پہن لیا ہو۔ لیکن بالکونی میں آدمی کپڑے اُٹار کر خالی ایک بنیان اور تہہ پہنے یا ایک باڑی یا بچی کوٹ پہنے۔ گرمیوں میں پتھلا جھلٹے ہوئے یا برسات کے دنوں میں ٹاٹ کا بوریا باندھتے ہوئے کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے اس قدر قریب سے قدم بے شکم طور پر ساری کو اُسے حیرت ہوتی تھی کہ آج تک کسی مصطلح کو انسانی مساوات کا ثبوت دینے کے لئے بالکونی کی مثال دینے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ چہ نہر کی بالکونی میں ایک فلسفی رہتا تھا۔ پانچ نمبر میں ایک مل مزدور رہتا تھا۔ چار نمبر میں وہ خود ایک فلم ڈائریکٹر رہتا تھا۔ تین نمبر میں ایک بڑھئی رہتا تھا۔ دو نمبر میں ایک اخبار بچے والا رہتا تھا۔ ایک نمبر میں ریلوے کا ایک ٹی رہتا تھا۔ لیکن جب یہ لوگ بالکونی میں تہہ یا دھوتی پہنے۔ بنیان یا بنیان کے بغیر کھڑے ہوئے تھے یا اپنے بچوں بچوں سے بات کرتے تھے یا ادانت لگتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تو اس قدر ایک ہی صف میں

اُٹھ رہے ہوئے دکھائی دیتے تھے کہ امتیازِ سن تو ٹوٹ جاتا تھا۔ چہ نہیں سیاست دانوں نے جنگ کے بجائے مزاج سے فاسزم کو ختم کرنے کا طریقہ کیوں نہیں سوچا۔

بالکونی کے مناظر دیکھتے دیکھتے اکرم کا پختہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ اگر کسی طرح جملہ کونج کر کے یا اُسے صرف ایک بیاض اور ایک لنگوٹ یا تہہ پہنا کے ایک بالکونی میں کھڑا کر کے لاکھوں آدمیوں کے سامنے تقریر کرنے کے لئے کہا جاتا۔ تو فاسزم اسی دن ختم ہو جاتا۔ لوگ ہنستے ہنستے دھڑے ہو جاتے۔ اور جب وہ اپنے سینے کے اُلجھے ہوئے بالوں پر اپنا ہاتھ رکھ کے اپنی ہڈیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہتا جرمِ آریائی نسل دنیا کے انسانوں کی بہترین نسل ہے۔ تو خود جرمین لوگ ٹھٹھا اور گندے اٹلے پھینک پھینک کے اس کا بُرا حال کر دیتے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں جیسے ٹرے جیسے چوڑے پلیٹ فارموں پر بیان کی روشنیوں میں۔ درجنوں ایگرو فون کے سامنے تھے کلکے ہوئے فوجی مردوں سے لباس سینوں سے نکلتی ہیں۔ پھر جیلد کھینچے ہیں۔ مارچ ہوتے ہیں۔ ٹینک چلتے ہیں۔ لاکھوں آدمی قتل ہوتے ہیں۔ پھر کہیں جا کے رفتہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کام کے لئے صرف ایک بالکونی کافی ہے خدا جانے انسانوں کو کب عقل آئے گی؟

مگر آج تو وہ خود یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ آج تو وہ خود بالکونی میں اوندھا نہ کئے بیٹھا تھا۔ اور رشیدہ اُسے دوسرے آگے جگائی تھی۔ وہ اول، آل کر کے پھر اوندھا ہو جاتا تھا۔ رشیدہ ایک ڈبلی ڈبلی عورت تھی۔ رنگت بے حد زرد، لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ، اُن آنکھوں کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کی عجیدہ فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ ہونٹوں کے کنارے ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ مگر کوئی بے فکر مسکراہٹ نہ تھی یہ تو ایسی مسکراہٹ تھی جس نے دنیا کے سارے غم دیکھ کر اس پر رونے کے بجائے ہنسا سیکو لیا ہو۔ یا شکر کرنا سیکو لیا ہو۔ رشیدہ کا لہجہ بڑا ملائم تھا۔ اور غلیظ تھا۔ لیکن اس لہجے کے اندر کتنے تیز کاٹے چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا احساس بہت ہی ذہین لوگ

کر سکتے ہیں۔ اور کبھی کسی وہ بھی آئے کہ کہہ کے رہ جاتے، کیوں کہ انہیں بعد میں پتہ چلتا کہ رشید چلے
 ملائم اور نرم لہجے میں کسی تیز بات کہہ گئی۔

رشید نے پوچھا: ”دور تر جگہ چکی ہوں آگے اٹھو گے نہیں؟“
 ”نہیں!“ اکرم دہیں بالکونی میں اندھھا پڑا ہوا۔

”جوشی جی کی کچر کا مہورت ہے اس لئے؟“

”کیا مطلب؟ کیا مطلب؟“ اکرم جلدی سے اٹھ کر بولا: ”مگر رشید نے کئی جواب نہ دیا وہ اس
 وقت اپنی دلی ہوئی شلوار اور قمیض لٹکی پر ٹانگ رہی تھی، اور اب نئے جمیل کوئی پر نہ ملنے کے لئے
 جاری تھی۔“

رشید نے کچھ نہیں کہا۔ مگر یوں تو اس نے سب کچھ دیا تھا۔ وہ واقعی آج بستر سے اٹھنا نہیں چاہتا
 تھا آج جوشی جی کی کچر کا مہورت تھا۔ گو سیٹھ ہاتھ ملنے اس کی کچر کا مہورت کرنے کا وعدہ کیا تھا
 مگر۔ وعدہ جلتے کب سے ملتا آ رہا تھا۔

”اور جلتے کب تک ملے؟“ رشید غل پر چیل کو نہلاتے ہوئے بولی ”کیا؟ کیا؟“ اکرم نے خوفزدہ
 ہو کے کہا۔ رشید کبھی کبھی اس کے اٹھے ہوئے خیالات کو یوں پڑھ لیتی تھی۔ جیسے وہ اوری نہ ہوں ایک
 کھلی ہوئی کتاب ہو۔

اکرم نے کہا: ”تم چلتے بناؤ۔ میں ضرور جاؤں گا۔“

رشید کبھی بھی چاہتی تھی۔ مگر نہیں چاہتی تھی کہ اسے یوں سات سات کہنا پڑے۔ اس
 نے جلدی سے چلے تیار کی۔ اتنے میں اکرم بھی ہاتھ منہ دھو کر قمیض اور پتلون پہن کر تیار ہو گیا۔
 جب اُس نے چلے پائی۔ تو رشید نے ایک ٹخنوں اس کی تہلی پر رکھ دی۔

ٹخنوں کو دیکھتے ہی اُسے یاد آیا کہ کتنے دنوں سے وہ رشید سے وعدہ کر رہا تھا کہ وہ بیٹھے

اپنے گھر کے لئے کچھ رقم مانگے گا۔ مگر وہ کیا کرے۔ اس کی بچہری شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور جب تک کچھ شروع نہ ہو جائے۔ وہ سیٹھ سے رقم مانگتے ہوئے دوتا تھا۔ شروع شروع کے تین چار ماہ تو اس نے تنخواہ مانگ لی تھی۔ لیکن اب گزشتہ پانچ ماہ سے اس نے سیٹھ سے ایک پائی طلب نہیں کی تھی۔ پہلے تو یہ خیال رہا کہ سیٹھ خور سے دیئے گا۔ اور جب سیٹھ نے تنخواہ نہ دی تو اکرم نے سوچا اچھا ہے۔ سیٹھ میری بچہری کسی طرح شروع کر دے۔ پھر کتنی رقم مانگ لوں گا۔ اب بچہری بھی شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ رشیدہ کی نگاہ کہہ رہی تھی۔ تو کب تک بہن کے آسرے پر رہے؟ نہیں نہیں۔ "اکرم بولا۔ میں آج مہورت کے بعد ضرور سیٹھ سے بات کروں گا۔"

رشیدہ کچھ نہ بولی۔ کئی بار اکرم نے ہتھ کیا تھا وہ سیٹھ سے بات کرے گا۔ مگر بات کو وہ اس طرح نہ نکلائے ہوئے واپس آجائے گا کہ رشیدہ پھر کچھ نہ کہہ سکتی۔ کاشش! کچھ کہہ سکتی۔ کاشش! اس نے زندگی کو اس طرح نہ سمجھا ہوتا۔

کسی خنزیر مسکراہٹ تھی رشیدہ آپاں! جیسے کسی نے زندگی کے سارے دکھوں اور محنتوں مصیبتوں اور مصرتوں کو شدید کر کے اُن کا خطرہ نکال لیا ہو۔ اور اُسے ایک دلکش قسم کی صورت میں رشیدہ کے ہونٹوں پر پھیلا دیا ہو۔ اسی کی بھلا کیا مسکراہٹ ہوئی۔ اکرم بھی کبھی تو اس سے پریشان ہو جاتا۔ مجھے یہ مسکراہٹ قلعی پسند نہیں۔ اس قدر سوچو بوجھ رکھنے والی۔ ہر بات فوراً سمجھ جالے والی مجھے تو دشمن کی مسکراہٹ پسند ہے۔ اٹھلی، فردی، سلی، بے فکر مسکراہٹ، فضا میں اڑتی ہوئی تھی کی طرح شبنم اور خوش رنگ۔ یہ مسکراہٹ۔ جو کچھ سوچتی ہی نہیں۔

رشیدہ نے کہا "مہورت میں ضرور جاؤ۔ ششاونگی دہاں ہوگی؟"

اکرم نے پھر چونک کر اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ رشیدہ پلٹ کر اپنے قہقہے جیسے مصحوم کوکھات اور علانی کی مصحوم کے دونوں پھیپھڑوں میں خورنہ سراسیمہ کر چکا تھا۔ وہ بڑی شخص سے کھانسی رہا تھا اکرم سر جھکا کے

کرے سے بائیں گیا۔

”وہ کیوں بدل نہیں سکتا؟ وہ کیوں ”لڑکا یا لڑکی؟“ دنیا گول ٹول ہے، ملت مسخرے ایک ہی نہیں بنا سکتا۔ وہ کیوں ”پہلی ملاقات ہے۔ دوسری کرامات ہے“ ایسے معرے نہیں سوچتا۔ وہ کیوں انسان کی بھلائی کے پیچھے ٹوٹے گم رہا ہے۔ وہ کیوں اپنی بھلائی کی نہیں سنا وہ کیوں لڑکیوں کو لے کے جوہر نہیں جاتا۔ وہ کیوں اس قدر خشک، متین اور خفیہ بنا رہتا ہے کہ لوگ اُسے سوکھا ہوا آلو کہنے لگے ہیں، وہ نیاں کیا وہی ایک انٹ کپوٹل رہ گیا ہے۔ ٹھٹھے ٹھٹھے گنچے سروں والے اوندھے داغوں والے۔ انہی کپوٹیوں نے انسان یہاں بستے ہیں۔ جن کی تجزیوں میں بھی لاکھوں دوسرے ہیں وہ کیوں سماج کی بھلائی کے لئے تصویریں نہیں بناتے، صرف اٹھلی چھوڑی بنے بیچا ہنس کر کہہ نکلنے والی موسیقی اور کوٹے مشکلانے والی کلاوے کر اپنا گھر بھر رہے ہیں۔ اور ایک تم جو میاں اکرم کہ سانسے جہاں کا وہ اپنے دل میں لئے نکلے کر رہے ہو۔ میاں کچھ عقل کے ناخن لو....

وہ سانسے میں ایک راہ گیر سے ٹکرا گیا۔ راہ گیر گھور کے اُسے دیکھنے لگا۔ اکرم نے جلدی سے کہا ”ساری کا کچھ!“ راہ گیر غصے سے چلایا۔ مگر اکرم آگے بڑھ گیا۔ بات یہ ہے کہ اس سماج میں روکے اُسے اس سماج کے اصول کے مطابق کام کرنا ہو گا۔ اس قسم کی باتوں کے لئے جس قسم کی سیاسی ضرورت ہے وہ اس انڈسٹری میں قطعی نہیں۔ پھر خالی تھنوں سے دودھ کیا کوشش کیوں کر رہا ہے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ جوشی جی کی طرٹ ویکوڈم فوڈ شروع ہو چکی۔ اب ڈومو کا مہور ست کر رہے ہیں۔ تین تین ہیروئنیں کو ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ اور ایک جناب اکرم ہیں۔ کہ قوم کے غم میں مجرم بنے جا رہے ہیں.... چکر.... چکر.... اکرم نے سوچا چکر کیا نام ہے؟ عمدہ ڈر گیا۔ ایک دم ہٹ! اکرم خوشی سے اُجھل پڑا۔ اور اچھلتے ہی کبلی کے کعبے سے ٹکرایا۔ اس پاس کے راہ چلتے ہوئے لوگ اس پر ہنس پڑے۔ وہ تو خیر رہی ہوئی۔ دلچیت ٹوڈو قریب آگیا تھا۔ اکرم جلدی سے اپنی خت چھپائے ہوئے

اتھ سے اچھے کو گرٹا لے ہوئے دلچیت شوڈیو کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

اکرم کو سرخا کر کے چلنے کی بہت بُری عادت تھی چلتے ہوئے آگے بچھے کچھ نہیں دیکھتا تھا۔ بس اپنی دُھن میں غرق چلا جا رہا ہے۔ اکرم نے سوچا اب اسے اپنی زندگی کا سارا دُعا قرابیل دینا پڑے گا۔ آج سے وہ سرخٹھا کے چلے گا۔ بڑھ بڑھ کے باتیں کرے گا۔ منہ پر گھونسا مار کے گالیاں بک کے ہرڈیوسروں کو دُعا کرے گا۔ یہ لوگ شرافت سے دُبنے والے نہیں ہیں۔ ان کے سلسلے تو اسے دوسرا جی بھی جہنا پڑے گا۔

شیخ نیرت میں مہورت تھا۔ مہورت میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ مگر شیخ فلم ڈائریکٹروں، ہرڈیوسروں، انٹرنسوں، ڈوٹری بیوٹروں، دُعاؤں، ایکٹر کام کرنے والوں اور چھٹے منٹے رول کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ فلم انڈسٹری میں ہر روز کہیں نہ کہیں مہورت ہوتا رہتا تھا۔ اس نے بہت سے بے کار لوگوں نے یہی مشغلہ اختیار کر رکھا تھا کہ صبح کا ناشتہ مہورت پر جا کے کریں گے۔ لڈو تو کھانے کو مل ہی جائیں گے۔ یہ لوگ مہورتیہ کہلاتے ہیں۔ اور کوئی بھی مہورت جو کہیں بھی مہورت جو کہیں کارڈٹس نہ ملے۔ وہاں ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تعداد انہیں مہورتیوں کی ہوتی ہے۔ مہورت کی رونق انہیں کے دم سے ہے۔ دُعا کام کے آدمی تو دس بارہ ہی ہوتے ہیں۔

مہورتیوں کی ٹولیوں میں گزرتے ہوئے سیٹھ باجھو یا اکرم کی طرف آ رہا تھا۔ اکرم کو بچہ داکر ایک کرنے میں لے گیا۔ اور جلدی جلدی سرگوشی کرتے ہوئے بولا

”تھانسی پچھو کا بھی آج ہی مہورت ہوگا“

”کی؟“

”ابھی اسی دم۔ ایک ڈوٹری بیوٹرایڈوانس دینے پر راضی ہو گیا ہے۔ ابھی چیک ملتا ہے۔ تصویر کا

ہم بناؤ“

”چکر م کیا؟“

”چکر م کیا؟“ باخو یا قریباً غش کھاتے ہوئے بولا ”کئی قوی تصور ہے؟“

”قوی تصویر کی ایسی قسمی“ اکرم گھونسا اٹھتے ہوئے بولا۔ اُس نے اُس پاس دیکھا۔ لیکن اُسے میٹر نظر نہ آئی۔ جس پر گھونسا مار کے وہ چیخا اور تاشیر پیدا کر سکتا۔ ایک لمحہ کے لئے اکرم کے داغ میں خیال آیا کہ کہیں نہ وہ یہ گھونسا سیٹھ کے چیلروں میں گھسا دے۔ مگر پھر اُسے تہذیب کے خلاف بھوکے اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور گھونسنے والا ہاتھ بادل خواستہ نیچے کر کے بولا ”ارے سیٹھ وہ کامیڈی دون کا۔ وہ کامیڈی دون کا کہ سالہ چار ملی بیسٹین بھی دیکھے تو غش کھا کے گر پڑے۔۔۔۔۔“

سیٹھ نے فدا اور دل چسپی محسوس کی۔ وہ ایک نئی نظر سے اکرم کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا ”مگر اکرم بھائی۔ یہ چکر م نام کچھ۔۔۔۔۔؟“

اکرم جلدی سے بات کاٹ کے بولا ”تو جانے دو۔ اور نام لوں۔ ہمیں کی اپنے پاس کیا کی بے خبر غوش“

کیسا نام رہے گا؟

”غیر غوش کیا؟“ سیٹھ حیرانی سے بولا۔

”غیر غوش صرف تھکن ٹوش“

”غیر غوش؟۔۔۔۔۔ مگر اس کا مطلب کیا ہے؟“

”تم مطلب چھوڑ دو سیٹھ۔ سوچو۔ ہم بولنے سے منہ بھرتا ہے کہ نہیں؟“

”ہاں۔“ باخو یا نے سر ہل کے کہا ”منہ تو بھرتا ہے۔“

”منہ بھرتا ہے۔ تو ایک دن تجوری بھی بھرے گی سیٹھ۔ جلدی سے اعلان کرو۔ غیر غوش کا“

اعلان کیا ابھی کرتا ہوں۔ ڈوسٹری بیوٹر سے چیک لیتا ہوں۔“ باخو یا اُسکرتے ہوئے بولا ”کیا

م بتایا؟“

تقریر غرض؟

”غیر غرض... کیا پھینکنا سی! (PHANTASY) ہے“

”اے پھینکنا سی کی ماسی ہے۔ سیٹھ، تم جا کے ڈھڑی بیوٹ سے بات تو کرو۔ وہ کہانی دوں گا کہ دماغ گھوٹ جائے گا۔“

سیٹھ نے غرض ہو کے اکرم کی طرف دیکھا۔ اس کے شلنے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ایسی بات تم مجھ سے پہلے بولنا۔ تو اب تک تمہارا کچر شروع ہو کے ختم ہو گیا ہوتا۔ پھر فوٹو لگ کر ماند دارانہ لہجے میں اکرم کی منیجمنٹ کے بولا ”ہدوت کے بعد پانچ سو کا چیک لے کے جانا مجھ سے“

”بہت اچھا سیٹھ؟“

جوشی جی، راج D شمشاور۔ ایسا نیچرہ رنجنل کے درمیان کھڑے منس منس کے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کا ہاتھ بار بار رنجنل کی پٹی کر کی طرف چلا جاتا تھا۔ سلور سکرین، مودی ٹیوڈ کے کیرور مین فوٹو لے رہے تھے۔ اکرم نے سوچا۔ باآؤب، با ملاحظہ ہوشیار۔ اب میری باری آئی ہے! بیٹا جوشی میں اپنی نظم میں پچاس لکھوں کا فانس رکھوں گا۔ ڈیڑھ لاکھ کا ایک ہی سیٹ خزاؤں گا۔ دیکھے جاؤ... ایسا نیا چہرہ۔ ایسا نیا چہرہ لاؤں گا کہ دیکھتے ہی غش غش کر اٹھو گے۔ اور جب اکرم کو نئے چہرے کا خیال آیا تو اس کے ذہن میں ولایت علی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

جب ولایت عجم کو اکرم نے پہلی بار دیکھا۔ وہ گلزاری رنگ کے پیراشوٹ سلک کی قمیض اور سفید سائن کی شلوار پہنے اور سیاہ سلک کے برقعے کا نقاب ٹھٹھائے گرانٹ روڈ میشن پر گاڑی کا استعارہ کر رہی تھی۔ دو پہلی تلواریں بجانپ گیا کہ یہ پنجابی لڑکی ہے اور بمبئی میں نئی آئی ہے۔ اور نہ اس کے رخساروں پر یہ صیب کی سی جھک نہ ہوئی۔ اور وہ اپنے برقعے کو یوں لٹے دئے نہ پھرتی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی جس کا رنگ بے حد گورا تھا لبتش سیٹھتھے تھے۔ لیکن بے حد نامزدوں۔ بھونٹیں کمان کی طرح۔ آنکھیں باورم کی سی۔ ہرٹھ چٹکے۔ ناک تلوار کی دھار کی طرح۔ تمام نقوش اپنی جگہ انفرادی حیثیت سے خوب صورت تھے لیکن اس کے چہرے پر لکھا کہ عجیب غیر مناسب تخریب کا اظہار کر رہے تھے۔ ولایت عجم کے ساتھ کھڑی ہو کے وہ اپنا برصورتی کو نمایاں اور ولایت عجم کے ٹخن کو مد چند کر رہی تھی۔ جب تک گلزاری نہیں آئی وہ ان دونوں کے قریب کھڑا ہوا ان کے جسمانی تضاد کا اندازہ ایسا رہا۔ یکایک کسی بات پر ولایت عجم ہنس پڑی۔ اور اُس کے بے حد سفید اور مناسب و انت دیر تک اکرم کے ذہن میں چٹکتے رہے۔ اور اس کی حاکم شہوانی تو از دیر تک اس کے دل کے گوشوں میں گونجتی رہی۔ پھر گلزاری آئی اور وہ دونوں لڑکیاں تڑپنے لگیں۔ اور اکرم پلٹ کر کتابوں کے شال پر چلا آیا۔ کیوں کہ اب اُسی گاڑی میں ایک

الگ ڈبے میں بیٹھ کر جانے سے اُسے بڑی کوفت ہوتی۔

غیر غرض کے بہت کے کچھ دنوں بعد اکرم نے ولایت بیچ کر اسی گلابی پیرا شوٹ بسکٹ کی قبض اور سفید ساٹن کی شلوار میں دلچیت شوڈیو کے باہر کھڑے دیکھا۔ اکرم گاڑی میں تھا۔ اس نے صرف اسے ہی بھر کے لئے دیکھ سکا۔ پھر وہ شوڈیو میں چلا گیا۔ اور دفتر میں آئے ہی اُس نے اپنے ہاں کے ایکسٹرا پہنائی کرنے والے دارا کو بلایا اور اُس سے کہا کہ دلچیت شوڈیو کے باہر اس دشت قلع کی لڑکی کھڑی ہے اور ہیشتر اس کے کردہ کہیں اور جانے اور یا اگر وہ راج محل شوڈیو میں چلی گئی ہو تو تم اسے کسی طرح گھر گھر کے بھلا پھسلا کے اپنے ہاں لے آؤ۔ دارا اس مسئلے میں بڑا تیز تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اس کے چہرے پر چمپ کے داغ تھے۔ اس کا سر آگے سے چھوٹا اور پیچھے سے بڑا تھا۔ اور اپنے چھوٹے تھک دی وجہ سے وہ قد سے دیکھنے میں بالکل ٹی جہ نظر آتا تھا۔ مگر لڑکیاں بھانسنے میں بے حد مشاقی تھا۔ وہ چند منٹوں میں ہی ولایت بیچ کر اکرم کے پاس لے آیا۔

ولایت بیچ کے ساتھ وہی گورے رنگ کی بد صورت لڑکی تھی۔ اور زمانہ اطوار والا ایک لڑکا جو شکل و صورت سے ولایت بیچ کا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ ایک بار عجب بھاری بھر کم، تن آسان عورت تھی جس کی گھر لوبو داد سکر اسٹ میں خستہ خستہ کئی پہلو تھے۔ یہ عورت ولایت بیچ کی ماں تھی۔ جوانی میں ولایت بیچ سے کہیں زیادہ حسین ہوگی۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو بڑی بڑی مونچھیں رکھے ہوئے تھا۔ اور کلاہ اور مچھری پہنے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر سیم اللہ کھدار کھا تھا۔ اُس کا نام جلال الدین تھا۔ لڑکے کا نام شفیع اور ادھیڑ عمر کی عورت کو وہ سب لوگ بے بے کہتے تھے۔ گورے رنگ کی بد صورت عورت کا نام۔ حلوم نہیں ہو سکا۔ شیشا اے "جان بھتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شفیع کی بیوی ہے۔ لیکن شفیع سے کہیں بہتر مردانہ اوصاف رکھتی تھی۔

بات چیت جان لے شروع کی۔ بولی "سلام اے" پھر ذکر ولایت سے کہنے لگی "ڈانر کیر بھی

انہیں سلام کرو“ ولایت جگہ نے اپنی کھلائی ہوئی آنکھوں سے اکرم کو ایک بار دیکھا۔ پھر نہیں کر سکا۔ پھر سیریا
لیکن اکرم اب بھی اس کا رخ دیکھ سکتا تھا۔ وہ تیز چکیا سر پی وں ہار، وہ چکوں کی گھنٹی صفت اور اس کے
نیچے وہ سنہری سنہری رنگت۔ رخساروں کی جہاں نئی نازہ نہ تھا۔ موت شبنی شفات چمک تھی۔ اس کی
جھکی گھاہیں جھکی پیروں پر پڑیں۔ اور پھر ولایت نے جلدی سے اپنے خوب صورت ٹخنے جھپٹائے۔

جان بولی ”آپ نے ہم کو بلایا ہے نا؟“

”جی“

”پھر میں کام کرنے کے لئے“

”جی“

”رول کیا ہوگا؟“

”ایک چھوٹا سا رول ہے۔ مگر بہت اچھا ہے“ اکرم نے جواب دیا۔

تو چلو چلیں ”جان کرمی سے اٹھے ہوئے بولی“ ہماری ولایت جگہ تو صرف بیرون کا رول کے گز
”پہلے کہیں کام کیا ہے“ اکرم نے وجہا

جان بولی ”لاہور میں گئی یہاں مرہم روٹن کا کام کیا تھا بعد میں ڈائریکٹر سے جھگڑا ہو گیا وہ ملا اس
سے تعلق چاہتا تھا۔“

ولایت جگہ نے سیاہ برقعے کی بوٹ کا سہارا لیا۔

جان بولی ”چلو چلیں“

کوئی نہیں چلا۔

اکرم نے کہا ”بیٹھے۔ بیٹھے“ جان بیٹھ گئی۔ شلیٹ ایک شرح رولان نکال کر اپنا منہ پونچھنے لگا۔

بے اکرم کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اکرم نے کہا ”رول چھوٹا سا ہے۔ مگر بہت اچھا ہے“

کر بیس گئے مگر ڈائریکٹر ہوں۔ بیرون کے ساتھ کھڑا کر دوں گا۔ پیلٹی کے محلے کا آدمی میرا دوست ہے وہ پہنچی کر اوں گا دلایت بیگ کی کہ دوسری پچر میں بیرون بننے کے لئے لوگ خود خوشام کرنے پھرین پیر دوسری پچر بھی میں خود ڈائریکٹ کر رہا ہوں ۛ

اکرم نے بے بے کی طرف دیکھا۔ اس کی پختہ سوچو جو جو رکھنے والے تنہم میں وہی غصہ ملتا تھا مگر بڑا بے ضرر تھا جہاں ملتا تھا جیسے اس اپنے ننھے سے کہے میں تیرے سامنے کر قوت جانتی ہوں، جان نے پوچھا ”تخوہ کیلے گی؟“

اکرم نے کہا ”ڈھائی سو روپے ماہوار۔“

جان پھر اٹھ کھڑی ہوئی ”تو چلو چلیں۔ ڈھائی سو روپے۔ وہ انگریز کے شوڈیروالے ہیں۔ ساٹھے چار سو جاتے تھے اور پھر وہ لوگ مجھے بھی کام دیتے تھے۔ چار سو روپے دے رہے تھے، مفت میں ہیں یہاں بلا کے خراب کیا؟“

شیخ بولا ”گئی بہار“ میں اُسے ہاں سول رہے تھے۔ سو روپے مجھے جیب خرچ ملتا تھا۔ سیگرٹوں کے لئے ۛ

بے بے ہوئی ”بیرون بھی نہ ہوگی۔ اور تخوہ بھی ٹھیک سے نفی تو مینا بتاؤ کام کیسے چلے گا؟“
بے بے نے لفظ کام پر ڈران زیادہ زور دیا۔ اس لئے اکرم کے لئے جواب دینا ضروری ہو گیا۔ اس نے کہا ”یہ تو دنیا میں کسی نہ کسی ڈھنگ سے چلتا ہی ہے۔ اور چلے گا بھی۔ تو لو اس سے زیادہ نہ ملے گی۔ سیمہ لوگ نہیں مائیں گے۔ اور یہ تو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ تمہیں ہے سیمہ کو یہ سب نہ سمجھو۔“

جان ہوئی ”یہ کنٹرول کا کنٹرول، ہم کو پسند نہیں ۛ
پھر ہمیں یہ فیصلہ بولا۔

”چلو“ بے بے نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے“ جلال الدین نے دھیمے سُرس کہا۔

ولایت گج دیا بیٹی کی بیٹی رہی۔

بے بے نے کہا ”اُٹھ دیتی ہے!“

ولایت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لوگ باہر چلے گئے۔ سڑک پر آگے نکل گئے۔ اکرم پھر دارا کو

بچھنے والا تھا۔ کہ ولایت بیکایک پٹلی۔ اس کے ساتھ کے لوگ اسے ہلاتے رہ گئے۔ لیکن وہ نہایت

تیزی سے چلی آ رہی تھی۔ وہ سٹوڈیو کے اندر داخل ہوئی۔ اکرم کے کمرے میں آگئی۔ اس کی میز کے سامنے

آکے ہوئی ”میں کام کروں گی“

اس کا چہرہ غصے سے تنہا رہا تھا۔

اکرم میز پر ہاتھ رکھا۔ بجائے بھلے رک گیا۔ بولا ”بہت اچھا۔ میں ابھی اگر میٹ تیار کر دے

دیتا ہوں۔ دستخط کر کے جاؤ“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ سڑک اگلی منٹ ٹائپ کرتے لگا۔ وہ بولی ”مجھے کچھ روپے ابھی چاہئیں سر“

کے پیسے دینے میں؟

”تم سر“ میں ٹھہری ہو؟

”اور کہاں ٹھہرتی۔ اپنے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے۔ اور آج وہ بھی ختم ہو گئے۔ سر“

کر رہا تھا سچ مجھے کہیں نہ کہیں اگلی منٹ کرنا ہی تھا؟ اس نے بڑے افسردہ محسوس کیے تھے تھوڑی لمبے میں

کہا۔ اس کے لمبے میں بڑھاپے کی تسکین تھی۔ اور بچپن کی مصیبت۔ اس کی عمر شکل سے چندہ برس ہوگی

اگلی منٹ ٹائپ ہو گیا۔ سیٹھ کے دستخط بھی ہوئے اور ولایت بیگم نے بھی جھٹ سے دستخط

کر دیے۔ اور اکرم نے ایک سو روپے کا نوٹ اس کی ٹھنڈی برقعاب انگریزوں میں تقسیم کیا۔

کے گھر کے لوگ بھی چلے آئے۔ ولایت نے لاہر واپسی سے نوٹ بے بے کے ہاتھ میں دے دیا۔ بے نے اپنے مہنے کے انٹل میں منسوبی سے باندھ دیا شیخ نے سگریٹ کا کش زور سے اندر کھینچا۔ اور جان نے گھور کے غصے بھری نگاہوں سے اکرم کی حرکت دیکھا۔ اور میرے لئے تو کام نہیں ہے۔
منہیں :-

”اچھا تو میں جانوں :- ولایت نے اکرم سے پوچھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اکرم نے کہا: ٹھہر جاؤ میں ایک ہوٹل کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔ آپ لوگوں کا سرائے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔“
بے نے انٹل پھیلانے اکرم کو دم میں دینے لگی۔ اور سرائے والے کو گایاں۔

اکرم نے ٹیلیفون پر بات کر کے کہا۔ بوری بندر ہوٹل میں سٹائیں نمبر کر دے آپ کے لئے طے کر دیا ہے۔
اپ لوگ سرائے سے وہاں چلے جائیے۔ چلتے چلتے جان لے کہا ”سلام لے!“

شام کو جب اکرم اپنے کام سے فارغ ہو کے بوری بندر ہوٹل پہنچا تو ولایت بیچم ایک گہری ہنر ساڑی میں ملبوس اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ بے نے اس کے بال بڑی خوب صورتی سے جھائے تھے۔ اکرم سٹوڈیو کی ایک گاڑی ساتھ لایا تھا۔ ولایت بیچم کو پرچے بغیر اس کے ساتھ ہوٹل کے نیچے سے نیچے اتر آئی۔ پیچھے پیچھے شفیع تھا۔

بے نے نہنے کے اوپر سے بلند آواز میں کھٹا شیخ کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ باہر بیٹھا رہے گا :-
اکرم گاڑی جو ہو کے ایک خوب صورت ہوٹل کے کشادہ ٹاگن میں لے گیا۔ رستے بھر اس نے ولایت سے کوئی بات نہیں کی۔ اور ولایت نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے دیکھا کہ اکرم بار بار دوندیرہ نگاہوں سے اس کے چہرے کے مجنوںوں کو دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کی کمر کے پھلے تم کو۔ کچھ بھی وہ مسکرائی نہیں سنجیدہ رو ہو کہ باہر نکلتی رہی۔ جہاں لوگ چلے جا رہے تھے، جہاں نوجوان بیویاں اپنے غامدوں سے سنسن نہیں کے باتیں کرتی ہوئی گزرتی جا رہی تھیں۔ ماؤں نے اپنے

پیادے پیادے بچے گودیں اٹھائے ہوئے تھے۔ جہاں کھڑک تھیلیوں میں کھلنے کا سامان پاش پاش کر کے پڑے جا رہے تھے۔ ایک جگہ ٹیماکان بن رہا تھا۔ موٹر پر پولیس کا سپاہی اطمینان سے آمدورفت کا بندوبست کر رہا تھا۔ جوتل میں چاروں طرف سمندر کے کنارے کنارے خوش نما کاشی بنے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ایک کاشی میں پھنس گئے۔

شیخ گاڑی میں بیٹھا رہا۔ اور سڑک رومال میں گرہیں لگاتا اور کھولتا رہا۔ اکرم نے جلتے وقت پاشی کا نوٹ اور سگریٹ کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھا دیا۔ شیخ نے سگریٹ سے اچھل کر اکرم کے گھٹنے چھوئے "تو کئی بادشاہ ہے۔ ایک پارٹ فیکٹریوں کو بھی دے دے۔ ولایت کو میں لاہور سے لایا ہوں کہ اس کو پارٹ مل جائے گا۔ توفیقوں کو بھی مل جائے گا۔ کیوں؟ سخی بادشاہ...."

اکرم نے کہا "عزیز سگریٹ پیو، اور سمندر پر ٹھلو۔ کل بات کریں گے۔"

شیخ نے اکرم کی طرف ہاتھ اونچا کر کے کہا "جیو چھیا!"

اندکاشی میں پہنچ کر اکرم نے دیکھا۔ پتنگ پرو لایت پر لٹی نیم وا انکھوں سے چپت کو تک رہا ہے۔ اس نے ساڑھی آٹا کے الگ رکھ دی ہے۔ ایک کرسی پر۔ اور چپت کے چپتے کے بلکے ہلکے جھوٹے گلے میں اس کا سبز راتن کا بیچی کوٹ لٹ رہا ہے۔

اکرم نے کہا "یہ کیا یہ ہو گئی ہے۔ ساڑھی پہنوا اور ادھر صوفے پر آؤ۔"

وہ بولی "بعض لوگ پہلے پتنگ پر آتے ہیں۔ بعد میں صوفے پر جاتے ہیں۔ خیر میرا تم کہو! اس نے ساڑھی پھر اپنی، اور اکرم کے قریب صوفے پر لٹ کے ٹھہر گئی۔ اس نے میز پر پڑے ڈبے سے ایک سگریٹ سبکایا اور دو گلاسوں میں خراب انڈل لی "تمہارے لئے سوڈا ڈالوں۔"

اکرم نے کہا "ہاں۔"

وہ بولی "میں سوڈا نہیں پیتی ہوں۔ اس نے سگریٹ کا ایک شس لگایا۔ اور پھر اپنا پیگ سوڈا ڈالے میز

ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ بولی "کتنا آج ذائقہ ہے۔ مگر گرواے مجھے کبھی شراب اور سگریٹ نہیں پینے دیتے چپ کرتی ہوں"۔
 "وہ یوں؟"

"پتہ نہیں۔ ایک بار میں نے آپ کے سامنے سگریٹ پی تھی آپ نے مجھے بہت مارا۔ ایک بار میں شراب کے نشے میں مدبوش گھر آئی تو پیپے تو سٹے میں شخص نے مجھے مارا۔ پھر گھر پر بلال آپ نے؟
 "اُدے بے نے کیا کہا؟" اکرم نے پوچھا۔

"بے بے مجھے بڑا بیمار کرتی ہیں۔ چوری چھپے ہم دونوں سگریٹ پی لیتی ہیں۔ مگر شراب کو وہ بھی منع کرتی ہیں۔
 "عجب چیز ہے۔ مگر کتنا آج ذائقہ ہے اس کا؟" اس نے دوسرا پیگ انڈیل لیا۔ "یہ کڑوا کڑوا ذائقہ ہے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس سے بھی اگر کڑوی مشراب مل جائے تو مجھے بے حد پسند آئے گا
 اکرم نے کیا "شیف نہیں پیتا ہے۔ اور تم اُسے کچھ نہیں کہتی ہو؟"

وہ بولی "مجھے اس کا پشٹنا اچھا لگتا ہے جیسے یہ سگریٹ اس وقت مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ وہ کرے کو ہماروں دونوں کو کچھ کے بولی "کتنا اچھا کر رہا ہے۔ خوب صورت چنگ۔ رنگین دیواریں۔ یہ پنکھا۔ یہ دم دم مٹی دھنی والے قہقہے۔ یہ سنہری شراب۔ یہ سفید سگریٹ۔ یہ چمکتے ہوئے تلور کے گلاس دان سے میرا نزل تو بہت بُرا ہے۔ اور وہ سرائے کتنی بری تھی۔ جہاں ہم آکے چند روز ٹھہرے تھے۔ اور لاہور میں میرا گھر کتنا بُرا تھا۔ یوں تو اچھا تھا۔ مگر اس کے مقابلے میں۔۔۔ اس نے چُپ ہو کر سر ہلایا۔
 "لوہور میں تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"شالامار باغ کے قریب ہے۔ باغبان پورے میں کچا گھر ہے۔ مگر ٹراپا اچھا لگتا ہے۔ یہ بھی میں ہمارے ہاں نہیں بھی تھی۔ بے بے اس کا دودھ اور کمین مجھے دیا کرتی تھی۔ چوری چھپے ایک دھن کیا ہوا؟ اُدہ اتنا کہہ کے کیکیکو کے ہنس پڑی اور اس کے سفید اور متناسب دانتوں کی لڑی بکلی کی طرح کوئد

گئی۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ بے بے نے میرے لئے کتنے ڈھیر سا رکھ دیا اور میری کی ڈولی الگ رکھ دی۔ اور گئی میں تلے ہوئے نرم نرم چار پرانے کچی رکھ دئے۔ اور ایک گلاس دودھ کا! اتنا کاڑھا دودھ ہوتا تھا وہ کہ کیا بتاؤں تمہیں۔ خیر قی جب میں سکول سے واپس آئی ۛ

”قوم سکول میں پڑھتی تھیں ۛ

”ہاں میں اُن دنوں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُس وقت میری عمر کوئی آٹھ سال کی ہوگی۔ خیر قی جب میں گھر آئی۔ اور بے بے تو یہ سب سامان چھپکے میں ڈال کے چلی گئی تھیں۔ اپنے کسی ہم سائے کو یہاں میں نے گھراتے ہی بستہ زمین پر پٹھا۔ اور اپک کر چھپا کر چھپا کر آ لیا۔ اور جلدی جلدی سے کھلنے لگی اتنے میں شفیقہ کہیں سے آگیا۔ میں نے اپنا کھانا پھینکا پھا پھا۔ مگر اس نے دیکھ لیا۔ بولا: ”بے بے تمہاری طرف داری کرتی ہیں۔ تمہیں اچھا اچھا کھانے کو دیتی ہیں۔ اور اتنا زیادہ کھلاتی ہیں۔ اور میں کوئی نہیں پچھتا رہی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ دوسروں کے گھر میں لڑکے دیکھتا ہوں۔ اُن کی خاطر سب سے زیادہ ہوتی ہے یہاں میں کوئی پوچھتا نہیں ہے۔ بس لڑکی کو کھلانے جاؤ۔ میں دیر تک میری اُس کی لڑائی ہوتی رہی۔ وہ چھین چھپٹ کے میرا ٹکٹن بھی کھا گیا، اور پرانے بھی۔ اور وہ گلاس بھی پنی گیا۔ اور میں خود زور سے رونے لگی۔ اتنے میں بے بے باہر سے آگئیں۔ اور انہوں نے شفیقہ کو خوب دھڑوا دھڑکوں لپٹوں لپٹوں سے پٹیا۔ رات کو جب وہ سویا تو میری طرف نچنے میں بیٹھ کر کے سویا۔ ہم اکتھے سوئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اس کے جسم کو دباتی رہی۔ اس دفعہ میں رات بھر اپنے بھائی کا ہم دباتی رہی۔ اور پھر آخر اس کے جسم کے اوپر سر رکھ کر سو گئی۔ صبح ہم دونوں کو اس طرح سوئے دیکھ کے بے بے بہت ہنسیں ۛ اور اتنا کہہ کے ولایت پھر کھن کھن کے ہنس پڑی۔ پھر یکایک افسردہ ہو کے بولی ”اُس وقت میری عمر آٹھ سال کی تھی اب چند سال کی ہوں۔ مگر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے آٹھ۔ سو سال گزر گئے ۛ

اس نے تیسرا پیگ انڈیل لیا۔ اگر م نے استفہامیہ نظروں سے دے دیکھا۔ وہ بولی ”آج بچے

کہو نہ کہو۔ جی بھر کے پیئے دو۔ خست کے بعد پی رہی ہوں :

اس نے تیرا لپک بھی جلدی سے ختم کر دیا۔ اکرم ابھی پہلے ہی میں تھا۔ جب وہ آگے چلنے لگی تو اکرم نے کہا "مر جاؤ گی" وہ بولی ؟ نہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو پوری قوتل پی جاؤں اور مجھے کچھ نہ ہو :
اکرم نے حیرت سے دیکھ کر کہا "کب سے پی رہی ہو ؟" وہ بولی : میں جب گیارہ سال کی تھی، جب میں بے پنی بار شراب پی تھی۔ اُن دنوں ہم لوگ نئے نئے کراچی آئے تھے :
"تو کیا تم کراچی کی رہے ہو پی ہو ؟"

"نہیں ہم تو لاہور کے ہیں۔ باغبان پورے کے۔ وہاں ہماری زمین ہے مکان ہیں۔ آبا کیتی باڑی کہتے تھے۔ اور ہم لوگ بڑے فزے میں بستے تھے۔ پھر آبا مقروض ہو گئے۔ اور ہمارے ہونے گھر سے سب ٹھٹھا گیا۔ یہاں دفن کی بات ہے۔ جب میں پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ بے بے ستا پی ہیں۔ کہ جب گھر میں کچھ نہ رہا اور نوبت خاقوں پر آگئی۔ تو بے بے نے پیشہ کر لیا۔ بے بے بڑی حسین تھی۔ سارے خاندان میں بھی اُن کے برابر کوئی حسین عورت نہ تھی۔ جلال آبا ان کو برقعہ پہنا کر باہر لے جانے لگے۔ ایک دفعہ کسی بٹول میں بے بے اور آبا پکڑے گئے۔ بے بے قویاں گئیں۔ لیکن آبا کو تین ماہ کی قید ہوئی۔ جب وہ تیسرے ماہ رہا جو کے آئے۔ تو بے بے نے لاہور چھوڑ دیا۔ اور کراچی چلی آئیں۔ وہیں پر شفیق اور سید پیدا ہوئے۔ ہم لوگ جلال آبا کی اولاد نہیں ہیں، ویسے وہ ہمارے آبا ہیں۔ مگر ہم ان کی اولاد نہیں ہیں : اکرم نے کہا "ہاں میں بھی خود کرد باغیا۔ کہ تم دونوں بہن بھائی کی صورت اُن سے باطن نہیں ملتی ہے :

دلایت نے سرگوشی سے اکرم سے کہا۔ حالانکہ اس وقت اُن کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جواسے مٹ کے "ہم دونوں شفیق اور میں چچا بنی بخش کی اولاد ہیں :
"چچا بنی بخش ؟"

”ہاں بچا بچا بخش کا کرتا ہے میں پرور کا چپ تھا، اور سینکڑوں کی آمدنی تھی وہ بچپن ہی سے ہماری بے بے کوچا چاہتے تھے۔ مگر بے بے شادی ماں باپ نے جلال آباد کو لے کر دیا۔ اور جلال آباد کو لے کر دیا۔ اور بھٹو میں جنہیں کام کرتا تو آتا نہیں۔ دن بھر حق پیتے رہتے ہیں۔ اسی کالی میں زمین بھی ہاتھ سے گئی۔ پھر سر پر چڑا باندھ کے اور لٹی لٹی کر نکلیں رکھ کے اپنی بیوی سے پیشہ کرنے لگے۔ میرا جی پاتا ہے مگر میں دونوں جلال آباد کا۔ مگر ڈر لگتا ہے“

”کسا ہے کوڑ لگتا ہے؟“

وہ بولی ”جب سے وہ قید سے رہا ہوئے ہیں۔ ان کا ڈھنگ بھی بدل گیا ہے۔ اب وہ ہمیشہ اپنے پاس ایک چاقو رکھتے ہیں۔ لمبا سا چاقو مگر میں ذرا دوسری بات پر چاقو نکال لیتے ہیں۔ ایک دفعہ تو شیخ کو جان سے مار دینے والے تھے کہ بے۔ نے بچا لیا۔ پھر کئی شیخ کی یاہوں پر کئی زخم آگئے۔ دو مہینے عرصہ چلتی ہوئی رہی۔ مُستی ہوں پہلے جلال آباد ایسے زخم تھے۔ جب اپنے ہاں زمین تھی۔ مکان تھے پر اب تو ————— خیر جی جالے دوان باتوں کو۔ تو تم دوسرا پیگ پیو۔ تم اتنے چپ چاپ جو رہتے ہو بگے جسے اچھے لگتے ہو“ ولایت بیگ نے کہا۔

اکرم باصل فریقہ جو کہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ہر لفظ حسین تر ہوتی جا رہی تھی۔ خراب کے ہر گونڈ کے ساتھ سب گوں رشتی میں پٹنگ پر تھی ہوئی پھر والی کسی پھر اسرار چار کا کہیں معلوم ہوئی تھی پٹنگ کے اور چنگھا تھا۔ جس کی نڈ سے پھر والی کی شفاف سطح پر کئی کئی موبیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اکرم نے ولایت بیگ کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور اس سے کہا ”یہ پٹنگ کتنا خوب صورت ہے۔ باصل کسی جہان کے کہیں کی طرح معلوم ہوتا ہے“

وہ اس کا بوسے کے بولی ”میں نے اس سے بھی خوب صورت پٹنگ دیکھے ہیں۔ ڈوٹی کشر کے ہاں پٹنگ کے پایوں پر چاندی کے پیرے جڑے ہوئے تھے“

اکرم نے چونک کر کہا ”ڈپٹی کمشنر کو جانتی ہو؟“

وہ بولی ”ہاں۔ اس کے پاس امیر ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔“

”امیر کون ہے؟“

”امیر میرا خاوند ہے۔“

”تمہارا خاوند ہے؟“

”ہاں۔“ ولایت بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈب اگیں۔ اس کی آواز لڑنے لگی۔ کانپتے ہوئے

لبے میں بولی ”وہ خبیث بھگے کبھی نہیں بھولتا۔ جب کبھی مشربا پی جاتی ہوں وہ کم بخت سامنے

آ کے کھڑا ہوتا ہے۔ یوں آنکھوں کے سامنے جیسے تم اس وقت میرے سامنے ہو۔ تم مسلمان ہوتا۔“

”ہاں۔“

”گیارہویں والے پیر کو مانتے ہو؟“

”مانتا ہوں۔“

”میں گیارہویں دابے کی قسم کھا کے کہتی ہوں بھے اگر کسی سے اس دنیا میں محبت ہوئی ہے۔ تو وہ

صرف امیر سے، باقی سب جھوٹے ہیں۔ اور ان سے میں بھی ٹھنڈی ہوں۔“

اکرم نے بڑے جانا باز عاشقوں کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا ”پرچ اب تمہیں کچھ عرصہ

نہیں ہوتا۔“

”کچھ نہیں۔ رتی بھر نہیں۔ میری چڑی مر گئی ہے۔ کچھ عرصہ نہیں ہوتا۔“

”حیرت ہے؟“ اکرم نے اپنے گلاس میں شراب کا آخری قطرہ پیتے ہوئے کہا۔

وہ بولی ”حیرت تو ہے، مگر امیر پر اب کبھی میرا اتنا ایمان ہے کہ وہ اس وقت بھی میرے سامنے

آ جائے تو میں تمہیں تو کیا ساری دنیا کو چھوڑ چھاؤں کے چلی جاؤں۔“

کہاں؟

”جہاں وہ کہے۔“

”ڈیوٹی کشنرز کے ہنگ پر۔“

”وہ نہیں۔ وہ قہجوری کی بات تھی۔“

اکرانے غصے میں آکے کہا: کیا مجبوری تھی۔ دوسرا بیک بناؤ۔

وہ بوٹی: ”جب امیر مجھے اغوا کر کے لے گیا۔ اس وقت میری عمر شکل سے چودہ سال کی تھی۔ چند ماہ ہی تھی۔ گویا کہ میں نابالغ تھی۔ لیکن میں گیارہویں سال ہی سے امیر سے محبت کرنے لگی تھی وہ ہمارے رشتے نلطے والوں ہی میں تھا۔ ایک دن۔ یہ میرے گیارہویں برس کی بات ہے۔ میں چٹنی جہالت میں پڑھتی تھی۔ اور سکول سے پڑھ کر واپس آرہی تھی کہ ہمارے کھیتوں کے پاس سے امیر نکلا۔ اور مجھے اپنی ہانہوں میں اٹھا کر لے گیا۔ میں نے امیر سے پوچھا کیا کرتے ہو۔ وہ بولا ابھی بتانا ہوں خیر جب میں گھر پہنچی تو آبا میری حالت دیکھ کے بہت پریشان ہوئے۔ بے بے بھی مجھے دھڑا دھڑپٹنے لگیں۔ کوئی فوادہ حرامی۔ میں نے کہا۔ اپنا چھپرا بھائی امیر میرے ساتھ تھا۔ پھر انہوں نے امیر کو وہ بے نقاد سنائی کہ کیا کہوں بے بے سرچٹنے لگیں۔ قبا جلال گڑا سا لے کر امیر کو جان سے مارنے کے لئے بھل پڑے۔ امیر چپ گیا۔ کہیں مائیں۔ میں تین چار دن کے بعد جب سکول گئی۔ تو رستے میں بے امیر میں گیا۔ میں نے کہا۔ مجھے پھر اٹھا کے لے جاؤ گے تو آبا تمہیں جان سے مار دیں گے۔ وہ مجھے پھر اٹھا کے لے گیا۔ میں جتنی چلاتی رہی۔ وہ اصل امیر پڑا خوب صورت جوان تھا، تم نے نہیں دیکھا۔ گول سا نولا چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی مونچیں۔ گھنگر لے بال جب وہ ان ہاتھوں کو جنگ کے ہانگ نکالتا تو دل پر لکیری کینچ بانی ہے۔ کرا اس کی کسی پتلی ہے۔ اور چھاتی اتنی چوڑی ہے۔ اور اس نے اپنی چھاتی پر میلا نام کندار رکھا ہے۔ وہ بھین ہی سے مجھے چاہتا ہے۔ اور میں ابھی اُسے چاہتی ہوں، مگر ہمارے

گمروا لے اس رشتے کے خلاف تھے =

”وہ کیوں؟“

”بے بے مجھ سے پیشہ کرنا چاہتی تھیں۔ مگر میں ایسے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ مجھ سے محبت تھی۔ اور پھر اس نے مجھ پر قح پائی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرا دل یوں ہونے لگا جس طرح شکاری کو دیکھ کر ہرنی چکر لڑیاں بھول جاتی ہے۔“

اکرم نے کہا ”سچی محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے =

وہ بولی ”تم مسلمان ہونا“

”ہاں“

”گیارہویں واسے پر یقین کرتے ہونا؟“

”کرتا ہوں =

”اس گیارہویں واسے پاک پر فیر کی قسم کھا کے کہتی ہوں۔ میں گمرواؤں کی مرضی کے خلاف گمرواؤں سے چھپ کر گمرواؤں کی مار پیٹ سہہ کر بھی۔ ایسے مٹی رہی۔ پہلے میں گیارہ برس کی تھی۔ پھر میں بارہ برس پورے کر کے تیرہویں میں آگئی۔ تب میں آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ اور ایسے برا بھلا تھی =

”وہ کیسے؟“

ولایت بولی ”دل ملنا چاہیے۔ تو کون روک سکتا ہے۔ دل تو کب سے لے ہوئے تھے۔ پھر میں ایک روز۔ ایسے کے ساتھ لائل پور۔ تم نے دیکھا ہے کہ نہیں۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

اکرم نے کہا ”میں یونی کا رہنے والا ہوں =

وہ بولی ”خیر لائل پور ڈراپٹا شہر ہے۔ سڑکیں چوکر۔ سیدی ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی اور شہر باہر گول ایک جگہ سے سیر کے لئے بچھو۔ گھوم کر پھر وہیں آجاؤ گے۔ لائل پور میں کوئی بچہ بھی کھو جائے تو

گم نہیں ہو سکتا۔

”خیر تم دونوں بچوں کا کیا بڑا“

”میں پختہ دقت کچھ زور لے کے آئی تھی کچھ روپے بھی امیر کے پاس تھے۔ پہلے تو امیر نے روپے خرچ کئے۔ ہم لوگ دن رات پتنگ پر پڑے رہتے۔ اور ایک دوسرے کو جوتے دیتے۔ اور جب چوتھے چھتے تھک جاتے۔ تو اٹھ کر سیر کرنے پٹے جاتے۔ مجھے امیر نے دو نئے سوٹ سلوا دیئے۔ اور خود بھی بوسکی کی قمیص سلوا لیں۔ اور کاجوں میں سونے کے بٹن لگائے، اور ریشمی شہر اور پپ شوہن کر جب وہ لوہ میں اپنے گھر سے پختے تو سارے بازار کی محالیں ہم دونوں پر موقوف۔ بڑے اچھے دن تھے وہ۔ ایسے اچھے دن اب نہیں آئیں گے“

”کیوں؟“

”اب میری چڑی مر چکی ہے۔“ دلا رستے ایک سانس میں گلاس ختم کرتے ہوئے اور دوسرا اٹھ بیٹے ہوئے کہا۔ ”اور پھر بیٹے تم ہو گئے۔ پھر امیر نے مجھے بیٹنا شروع کر دیا۔ پھر میں ہانڈی، کسے، چولے میں لگ گئی۔ اور امیر میرا زور بڑھانے بیچ کر شراب پینے لگا۔ پہلے وہ شراب نہیں پیتا تھا۔ مگر اب وہ بیوی دلا تھا، اور بے کار تھا۔ اسے سائیکلوں کی مرمت کا کام آتا تھا۔ اور وہ فٹ بال بڑا چھاکھینا تھا۔ مگر سائیکل مرمت کرنے والے خود سب کام کرتے تھے۔ انہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ فٹ بال تو ایک کھیل تھا۔ اب وہ بے چارہ کرے تو کیا کرے۔ جب زور بھی ختم ہو گئے اور ہم لوگ دونوں اور زور خالی سے رہے تو امیر مجھے برقعہ اور حاکے ڈپٹی کشنری کو کٹھی پرے گیا۔ اس کا بڑا امیر کا دوست بن گیا تھا۔ اور ڈپٹی کشنری کے ڈرائیور نے اسے ڈپٹی کشنری کوٹر پر جملے کے موٹر چلائے، بھی تھوڑا تھوڑا سکا دیا تھا۔ اور ڈپٹی کشنری کا بڑا اور ڈپٹی کشنری کا ڈرائیور دونوں کہتے تھے کہ اگر امیر مان جائے تو اس کی ساری خشکیں مل جو سکتی ہیں۔ میں بہت روٹی دھوٹی، چلائی، بین کئے۔ اسے کھنے دئے۔ اسے ننگی نگی

فٹس گھایاں دیں۔ اس کی ماں بہن کو اچھی طرح پٹنا۔ مگر جب دو رات اور دو دن قافے کرتے گزر گئے اور منہ میں اڈکے ایک کھیل بھی نہ گئی تو میرے بچے برقعہ اڑھال کے ڈپٹی کشنر کی کوٹھی پر لے گیا اور وہاں پر میں نے وہ پنگ دیکھا جس کے پاؤں پر چاندی کے پترے چڑھے ہوئے تھے۔

”بھمک رہا ہوا“ اکرم نے پوچھا۔

”بھمک رہتا،“ امیر موٹر کا کلینر ہی گیا۔ میرے لئے بڑے اچھے اچھے کپڑے بن کے آگئے۔ اور زیور بھی۔ اور مگر کاچولہا ویران ہو گیا۔ اور آگ بج گئی اور یہ اہل ہر وقت بجا بجا سا رہتے تھے۔ پھر میرے ماں باپ ایک روز مجھے لینے کے لئے آگئے۔ ان کے ساتھ پولیس بھی تھی۔

”پولیس کیوں تھی؟“

”میں نابالغ جو تھی نا۔ لاہور کی پولیس آئی تھی۔ انہوں نے میرے اور میرے امیر کے تنگڑی لگا دی اور ہمیں باندھ کے بے چلے۔ لاکھ پور کے ڈپٹی کشنر نے مجھے بچا ناپا بیا۔ مگر دارنٹ لاہور کے جھڑپٹ نے مٹا لے تھے۔ وہ دانت میں کے رہ گیا۔ چلتے چلتے میں نے سب اسپیکر کو جو مجھے گرفتار کرنے یا قتل کرنا چاہا وہیں وہ گالیاں دیں کہ بے چارہ اپنا سامنے لے کے رہ گیا۔ ہنس کے کہتے تھے اتنی خوب صورت لڑکی کے منہ سے اتنی بُری گالیاں میں نے آج تک نہیں سُنیں۔ مجھے پچھتہ بہت بُری بُری گالیاں یاد ہیں ایک دن تیس سناؤں گی؟“

”کب سناؤ گی؟“

”جس دن تم سے لڑائی ہو گی جس دن تم مجھے شادی کے لئے کہو گے۔ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“

”نہیں تو۔ مگر کیا تم شادی کے غلات ہو؟“

”ہاں یہ سارے مرد بڑے حرام زادے ہوتے ہیں۔ میرا بس چلے تو ان کی کہاں کیچ کر انہیں پھانسی پر لٹکا دوں؟“

اکرم نے کہا: "تم نے تو ابھی گایاں دینا شروع کر دیں۔ ابھی تو میں نے تم سے شادی نہیں کی۔"
وہ بولی: "تم مجھ سے کیا کھلے شادی کرو گے۔"

اکرم نے میز پر گونہ مار کے کہا: "میں تم سے ضرور شادی کروں گا۔ میں تمہاری زندگی سدھار دوں گا تم میری نیک طبیعت بیوی بنو گی۔ میں تمہارا فرماں بردار خاوند۔ اور ہمارے گھر کے آگن میں ہمارے پیارے پیارے بچے کیلیں گے۔ اور...."

اور وہ آہستہ سے بولی: "اور پھر تم مجھے کسی ڈپٹی کنسز کے پاس لے جاؤ گے۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اکرم بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر وہ چُپ ہو گئی۔ پھر اکرم بھی چُپ ہو گیا۔ پھر اکرم حکاہ اوپن کر کے اس پٹنگ کی طرف دیکھنے لگا۔ جو سرور کے عالم میں اور بھی مسین دکھائی دے رہا تھا۔ اکرم نے ولایت کی کرسیں ہاتھ ڈال کے کہا: "یہ پٹنگ کتنا حسین ہے۔"
وہ بولی: "میں نے اس سے بھی خوب صورت پٹنگ دیکھے ہیں۔" اور میں نواب میران شام کے پٹنگ میں سونے کے پائے لگے بھنے میں اور اس کی گلابی رنگ کی پتھروانی میں مونی اور جو ابرنگے ہوئے ہیں اور اس کے ارد گرد چاروں طرف تھوڑا آدم آئیے ہیں۔ اور آپارنگی عورتوں کی تصویریں ہیں۔ اور جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو پہلی بار اپنے آپ کو چاروں طرف آئینوں میں دیکھ کر گھبرا گئی۔ اور شرمائی لیکن نواب نے ہاتھ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کی عمر پچاس کے اوپر ہو گی۔ بال کچھڑی ہیں۔ ہونٹ اڑا دھار ٹکے ہوئے ہیں۔ اور سوتے وقت طاقت کی دوا کھاتے ہیں۔ ان کے پاس بے شمار دولت ہے بے شمار زمین ہے۔ بے شمار جائیداد ہے۔ سننے میں نواب میران شاد کی دولت کا کوئی حساب نہیں خود چھوٹے لٹ اُن کے گھر کھانا کھانے آتا ہے۔ اتنا بڑا آدمی مجھ پر عاشق ہو گیا۔"

"کیسے ہوا کیا اس نے تمہیں دیکھا تھا کبیں پہلے۔" اکرم نے پوچھا

"نہیں کبیں پہلے تو نہیں دیکھا تھا۔ لے کر تو مجھے میرے آباہی وہاں گئے تھے۔ وہاں پر سے جب میں

اور امیر گرفتار ہو کے آئے تو امیر مجھے درود کے سلام کرتا تھا۔ اور میں اُسے درود کے دہائی دیتی تھی۔ اور دنیا ہمارا تماشہ سمجھتی تھی۔ پھر حرم الہیکل تھا وہ شفیع کا بڑا دوست بن گیا۔ اور شفیع اس کے ساتھ حالات میں مجھے ملنے آتا تھا۔ اور میں اس کے سامنے سب الہیکل کو اور شفیع کو اور اپنے ماں باپ کو بے لفظ سناؤں تھی۔ بے چارہ الہیکل چپکے چپکے سب کچھ سُنا، میں نے اس سے کہا، میں امیر سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس نے کہا میں تمہیں امیر سے ملا دوں گا۔ مگر اس کا تمہیں سوا وضو دینا ہوگا۔ میں نے دیا۔ کیوں کہ میں امیر سے مانا چاہتی تھی۔ اور جب ہم ملے۔ تو خوب ایک دوسرے سے گلے مل کر روئے اور میں نے امیر سے وعدہ کیا کہ اگر میرے ماں باپ نے اس کے غلات مقدمہ چلایا تو میں صاف مان کہوں گی کہ میں اپنی مرضی سے امیر کے ساتھ گئی تھی۔ چنانچہ جب مقدمہ چلا تو میں نے صاف صاف ایسا ہی کہہ دیا اس پر جج بیٹھنے امیر کو ضمانت پر رہا کر دیا اور مجھے اپنے ماں باپ کے حوالے کر دیا۔ اور صحن میں مگر آئی ہوں اور ابھی جین سے بھی نہ جھنجھکی تھی کہ دوسرے روز آبا جی برقعہ اوڑھ کے نواب میران شاہ کے گھرے گئے۔ میں بہت روئی دھوئی۔ مگر بے بے لے کہا، مگر میں کچھ نہیں ہے۔ میرے جلتے کے بدیم لوگوں نے دس دس دن ملتے کئے ہیں۔ تو کچھ تو کھڑا۔ یاں کر۔ ہم بڑھے ہیں۔ شفیع نالایق ہے۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ تو جی اگر مگر باز نہیں سمجھ لے گی تو روئی بھی نصیب نہ ہو سکے گی۔ اتنا کہہ کے بے بے روئے لگیں۔ اور میں بھی اُن کے ساتھ رونے لگی اور پھر آہستہ پونچھ کر نواب میران شاہ کے محل میں چلی گئی۔ وہ دیکھ کر چپ رہی۔ پھر رنگ روک کے کہنے لگی: نواب کے منہ سے بڑی بدبو آتی تھی۔ جیسے اُس نے صرف کھائے ہوں۔ اور اب تو مجھے ہر روز کے منہ سے ایسی ہی بدبو آتی ہے گی مٹری لاشوں کی بو!

اکرم نے کہا: میں بدبو دھو کر دوں گا۔ میں تم سے بیاہ کر لوں گا۔ تم میری زندگی میں چاند کی کرن۔ مندر کی نور۔ پھر وہی کی تان میں کے آؤ گی اور کوئی تمہیں چھو نہ سکے گا۔ اور ایک چھڑا سا آئین ہوگا جس میں تمہاری تصویر ہوگا۔

اُس کی آنکھیں پکڑنے لگیں اور وہ اکرم سے پٹ گئی ہوئی۔ پہنچتے ہوئے کئی بار اس نے زب کوٹس پکڑ لی ہیں۔ پھر کئی بار بارہ چ سولہ ہوتا ہے۔ مگر اکرم کے پاس سسکیاں لے لے کے رونے لگی۔ اس کے دل کی آگ بجھ گئی تھی۔ اور اس کی چڑی مر گئی تھی۔ اور اس کے پنوں کے پھل نر جھاگے تھے۔ اور زندگی کے سارے غم اور فشیانی موت کے سارے آندہ خراب کے قلوں میں تحلیل ہو چکے تھے۔ اکرم نے پنگ کی طون دیکھا۔ اور اب اُسے وہ پنگ بیت بُرا نظر آیا۔ بُرا اور سیدہ پنگ تھا پاش جگہ جگہ سے اکڑا ہوا تھا۔ پھر دانی کی کئی کئی دھناتی سے بڑی تھی۔ اور نل گول قلوں کے ارد گرد نکھیاں بھینھاری تھیں۔

دلیت دوتے دوتے دینے صوفے پر سو گئی۔ اکرم حیرت سے اس کے چہرے کی طون دیکھنے لگا۔ خند میں اس کے اسی اندر حال اُبھر آئے تھے۔ اس کا نہ تھکا سا کٹا تھا۔ سوتے ہوئے پتھکی طرح خنداں پر تانہ صیب کی سی پتھکی تھی۔ اور کپکپ گھس سے اندر حال ہو کے گر پڑی تھیں۔ اور اس کی انجلی ہوئی آستین سے اس کی منہ کی کلائی کی گندہ کوئی نکل آ رہی تھی۔ اور اس میں ایک چوڑا سا گلاھاڑ تھا۔ ایک پتھکی کی کلائی کی طرح اور اس کی وہ انجلی ہوئی جھٹکے کی پتھکی سے کمر کا سر میں غم نمایاں ہو گیا تھا۔ اور ایک پاؤں صوفے پر اور دوسرا صوفے سے نیچے نکل رہا تھا۔ اور گول ٹخنے کے پاس ایک گڑا تھا۔ ایک پتھکی کی طرح۔ اور اس پتھکی کی غر خصل سے پندرہ برس کی ہو گئی۔ اور پھر جیسے یہ پتی غائب ہو گئی۔ اور دولت کے خنداں میں بے بے کا خندہ خندہ اور اس کی ناک کی تلاش میں حال بالکی خندہ تانہ پھر قن ٹکرائی۔ اور جڑے کی سانت میں شیخ کا شہدایں ایک ہی چہرے میں دو سانت جمع ہو گئے تھے۔ سو رہے تھے۔ گندہ ہو کر ایک دھڑکے سے فراغت کر رہے تھے۔ سوتے دھت بھی جیسے دھت کے چہرے پر جنگ ہو رہی ہو۔ سوچتے سوچتے اکرم بھی اونگھنے لگا۔ اور پھر اپنا کچھ کچھ کر باطل بیدار ہو گیا۔ اکرم نے دولت کو ایک

ٹھوکہ دے کر کہا: اٹھو آج کی رات سونے کے لئے نہیں ہے۔ جاگنے کے لئے ہے۔ اور ان تمام
 چنگوں کی کہانی سنانے کے لئے ہے جنہیں تم نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دیکھا ہے۔ اچھا یہ تو بڑا سونے
 چاندی اور جواہرات کے علاوہ کیا تم نے کبھی کسی لوہے کے چنگ کو بھی دیکھا ہے؟

وہ آئیں شے ملنے لگی۔ اس حوالہ میں: اور پھر سو گئی اور جکے جکے خزانے لینے لگی دراصل اس نے
 بہت پانی پی تھی۔ اکرم نے بوتل خالی کر کے اس میں عیاسی سلکے کے پھینک دی اور بوتل میں ایک نیلگوں
 شعلہ پیدا ہوا اور شعلے سے ایک ہلکی سی گونج پیدا ہوئی۔ اور پھر اکرم نے بوتل کے منہ پر اپنی ہتھیلی رکھ
 دی۔ اور نیلگوں شعلہ بجو گیا۔ اور گونج غائب ہو گئی۔ اور اکرم نے سوچا۔ ولایت بھی شراب کی غالی بوتل پر
 اس کے اندر نیلگوں شعلہ ہی ہے۔ دھماکے کی گونج بھی ہے۔ مگر یہ شعلہ اور گونج شیشے کی چار دیواری اور
 ظالم تھیل کے باہر نہیں جاسکتے۔ کیوں نہیں جاسکتے۔ بھلا کیوں نہیں جاسکتے۔ یہ ایک یہ سوال اکرم کے
 دل کے گوشوں میں پکرانے لگا جس طرح رات کی سیاہی میں تاریک کمرے میں کوئی بھولی بجلی چمکاؤ
 بالبابا پکڑ لگاتی ہے۔ اس طرح یہ سوال اس کے ذہن کے نہاں خانے میں پکڑ لگنے لگا۔ آخر سوچ سوچ کر اکرم
 نے فیصلہ کیا۔ باہر جا کر شعلے کی رائے طلب کی جائے۔ چنانچہ اکرم لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل کر شعلے
 کے پاس گیا۔

شعلے ہوتی کے بڑے کھلے آگ میں سوڑیں میٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

اکرم نے شعلے سے پوچھا: کیوں شعلے۔ یہ شعلہ کیوں بجتا ہے۔ یہ گونج کیوں دے جاتی ہے۔ شعلے میرے لئے
 شعلے تو بھلا رات کے بڑے "راہِ غنی" بادشاہ تیری شراب دے دے۔ ایک کھونٹا فیسروں کو بھی
 پکھا دے؟

گاڑی میں بیٹھ کر اکرم نے شفیع سے کہا: "اندر جاؤ۔ ولایت بیگ کو باہر لے آؤ۔"

"کیوں؟"

"مجھے خود معلوم نہیں۔ کیوں۔ ہم واپس چلیں گے۔"

واپسی میں اکرم گاڑی چلا رہا تھا۔ پیچھے کی سیٹ پر شفیع اور ولایت بیگ تھے۔ ولایت بیگ بار بار اٹھ کے فٹ کرتی۔ بار بار اکرم کو اپنی گاڑی دیکھتی پرتی۔ اک عجیب بے کلی، بے مینی ہی اُس کے دل و دماغ میں بڑھتی ہی جا رہی تھی، وہ الفاظ، اسٹیمیا، جنام کی کھلی خوب صورتی پر تاج کیوں نہیں ہو سکتا؟ جوشی جی بی طرح، اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ برقع کو گرید اور چھیل کے دیکھے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ ہر لباس اُسے بے قرار کیوں رکھتی ہے؟ وہ چیزوں اور رشتوں کو جیسی وہ ہیں کیوں منظور نہیں کرتا۔ پھر کئی کتنا خوش رہ سکتا ہے۔ ہر عذرات کو آرام سے ایک قبرستان کی طرح سو سکتا ہے۔ اکرم نے سوچا۔ آخر وہ کیا پا رہا ہے۔ زندگی سے۔ اپنے کام سے۔ لوگوں سے۔ ارد گرد کے ماحول سے۔ وہ کیا چاہتا ہے اُن سے۔ کیوں وہ انہیں منظور نہیں کرتا۔ جیسا جوشی جی نے منظور کر لیا ہے۔ راج تانے منظور کر لیا ہے۔ اور باخترائے منظور کر لیا ہے۔ کیوں نہیں اکیوں نہیں وہ بھی منظور کر دیتا۔

ولایت بیگ اور شفیع کو اُن کے بٹل میں چھوڑ کے۔ جب اکرم واپس پرل پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ رشیدہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے میز جیوں پر اکرم کے لاکھڑے ہونے قدموں کی چاپ سُنی۔ اور چپ چاپ جھانکھوں دیا۔ اکرم اندر آ کے ایک ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے اُچھے ہوئے گنگوہرے بالوں میں انگلیاں پیرنے لگا۔ دیرے دیرے

رشیدہ کچھ بولی نہیں۔ چُپ چاپ اُس کے پاس کھڑی تھی، بھیک اکرم نے کہا۔

"میں خبر خوش نہیں بتاؤں گا؟"

"کیوں۔۔۔۔؟" رشیدہ نے چونک کر پوچھا۔

”ہیں! میں منظور نہیں کر سکتا = اکرم کے لیے میں ایک نئی سخی تھی۔
 یہ کیا منظور نہیں کر سکتے =

”وہ ————— وہ سب کچھ جو وہ کہتے ہیں اور کرتے ہیں =
 ”وہ لوگ کون ہیں؟“

”وہ بہت ہیں۔ سیکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ اور انہوں نے فلم انڈسٹری کو اپنی منہی میں لے
 رکھا ہے =

”پر تم ان کا مقابلہ کیسے کرو گے؟“

”کیوں کرو وہ سیکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ لگلا لگول نہیں ہیں۔“

”اور وہ لاکھوں تمہارے ساتھ ہیں؟“

”میرے ساتھ تو نہیں ہیں۔ لیکن میں ان کے ساتھ ہوں۔ آپا؟“

”میرے خیال میں تمہیں ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے = رشید نے اکرم کو گروں سے بچڑا۔ اور اس
 کا سرنل کے نیچے رکھ دیا۔ اور اوپر سے نل چھوڑ دیا۔

اکرم باخڑا کی کمزوری تھا۔ اس لئے جب اکرم نے باخڑا سے کہا۔ کہ وہ اس کی بچہ نگر عرش
 کا۔ ایت کاری نہیں سرا انجام دے گا۔ تو باخڑا نے اسے بہت بھایا۔ بہت اونچی نیچ مکئی ناندھیا
 کی بڑی حالت۔ فاقوں کی تصویریں۔ مستقبل کا لالچ۔ اگر وہ۔ تصویر کا سیلاب کر سکا تو آگے اپنی مرضی
 کی تین چار تصویریں بنا سکے گا۔

”حم جانتے ہو = جاکو بولا = میرے ہاں تو ڈائریکٹر ہی بھی کچھ چاہے۔ ایک طرح سے وہی کچپرا
 پروڈیوسر بن جائے۔ وہ یہ بھی اسی کے کہنے سے خراب ہوتا ہے۔ میں ایک دفعہ میں کہانی پسند کروں،
 اور وہاں کا ادب کا انتخاب ہو جائے۔ آگے میں کچھ دخل نہیں دیتا۔ میں تمہیں بھی تمہاری مرضی کی تصویر دیتا

نگر کیا کروں۔ زمانہ خراب ہے۔ لوگ اچھا سبجیکٹ (موضوع) چاہتے ہیں۔

”اچھا سبجیکٹ — کون سا ہوتا ہے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”جو پلے؟“ باغچہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”اچھا اداکار کون سا ہوتا ہے؟“

”جو پلے“

”اچھا سنگیت کون سا ہوتا ہے؟“

”جو پلے“

”بیرائی بڑو کر اور نا سنگیت کون اچھا آرٹسٹ ہے؟“

”نا سنگیت کون؟“

”طلعت محمود اور بیڑے غلام علی خاں میں سے کون اچھا ہے؟“

”طلعت محمود؟“

”بال گنگا دھر تلک کے بٹ اور میڈی لامار میں سے کون اچھا ہے...“

”کیا امتحان بات کرتے ہو؟“ باغچہ نے ذرا غصے سے کہا۔

اکرم بولا: ”میں تم کو بتانا ہوں۔ میڈی لامار اچھی ہے۔ کیوں کر وہ ملتی ہے۔ اور بال گنگا دھر تلک کا بٹ

چرپائی پر کھڑا رہتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اُس دن تلک کی برسی تھی، اور اتفاق سے اُسی دن

میڈی لامار بھی کے ہوائی اڈے سے گزر رہی تھی۔ اس دن بھی کے ہوئی اڈے پر ہزاروں آدمی جستے تھے

اور چرپائی پر فصل سے چندہ بھی آدمی ہوں گے۔ کیونکہ میڈی لامار ملتی ہے۔ بلکہ اُرتی ہے۔ اور تلک

اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اس لئے میں فیبرے خوش نہیں بناؤں گا۔“

”کیوں؟“

”کیوں کہ تم ٹٹیک کہتے ہو۔ تم چلتے ہو۔ اور میں بیٹھا ہوں۔ ایک دن بیٹھ ہی اسی طرح بیٹھا تھا۔ اور پھر ایک سیب اس کی جھولی میں گرا اور زمین کی کشش ثقل دریافت ہو گئی۔ ایک دن تمہارا سینہ اٹھا ایک دن آپ کی تصویریں حرکت نہ کرتی تھیں۔ وہ ہلٹی نہ ملتی تھیں۔ وہ بیٹھی تھی۔ اس بیٹھے اور چلنے کے بیچ میں ایک ربح صدی کے سائنسدانوں اور محنتی آدمیوں کی ان تھک کاوشوں، کامیابیوں اور محرومیوں کی داستان ہے۔ ان لوگوں کا شکرا ادا کرو سیٹھ جن کی وجہ سے آج یہ سینہ چلتا ہے۔ اور تم لاکھوں کلماتے ہو۔“

”میں سوچ نہیں ہوں۔ جڑیں ہیں ہوں۔“ بانکڑا نے اسے یاد دلایا۔

اکرم نے کہا ”سیٹھ ہر چیز جو کچ چلتی ہے۔ کبھی نہیں چلتی تھی!“

”اس دن میں اسے خرید لوں گا۔“ سیٹھ بولا۔

”تو جب تک مجھے خون نہ کھوئے وہ۔“ اکرم نے اپنی منگنی بھیج کر کہا۔

”تم خون کیوں تمہو کو۔ تم کیلڑی دیک میں آرام سے کیوں نہ گھومو۔“ بانکڑا نے مسکرا کر کہا۔

”اپنا اپنا معاملہ ہے سیٹھ۔“ اکرم نے کہا۔ ”کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہے۔ مگر میں تم سے یہ بات کیوں کر رہا ہوں۔“

اکرم مڑ گیا، اور سیٹھ کی کہیں کا دردانہ کھول کے میڈم کے کہیں میں داخل ہو گیا۔ میڈم کے کہیں کا دردانہ کھول کے جوشی کے کہیں میں داخل ہو گیا۔ جوشی کے کہیں کا دردانہ کھول کے باہر ہال میں پٹا گیا۔ ہال سے باہر نوربابت پرود کشن کے دفتر کے باہر چلا گیا۔

میڈم اور جوشی دونوں اُس کے چلے جانے کے بعد بانکڑا کے کمرے میں آئے۔ میڈم نے پوچھا ”نہیں نا۔“

”نہیں۔“

”تو پھر تم۔ یہ کچھ بھی خوشی جی کو دے دے۔“

”مگر ان کے پاس پہلے ہی سے دو کچرے موجود ہیں۔“

”کوئی بات نہیں سیٹھ۔ میں اسے بھی غسل کروں گا۔“ خوشی جی نے کہا۔

”اچھا۔“

خوشی جی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اُسے اکرم خدا بھی پسند نہ تھا۔ سارا اس طرح میری طرف دیکھتا تھا۔ جیسے میں کوئی موری کا کپڑا ہوں۔ آج حساب برابر ہو گیا۔

بابر اکرم داد میں روٹے گدردہا تھا۔ فلم ایکسٹرا این کے دفتر کے باہر بہت سے ایسٹلر بھائیوں کے ہاتھ اسے سلام کرنے کے لئے اٹھے۔ اکرم ہاتھ دلاتا ہوا آگے کے ایرانی رستوران پہنچا گیا۔ لوگ آج بچے سلام کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ اس غیر خوش کا ڈاکٹر بھٹل ہوں۔ کل ان کا رویہ مختلف ہو گا۔ چلنے کی پیالی منگوانے کے اکرم سوچنے لگا۔ مگر کل تم کیا کرو گے۔ اکرم آج تم بڑے بہادر تھے۔ بڑے جری۔ نہایت صاف گو آج تم نے خداؤں اور پیغمبروں کی طرح بات کی لیکن کل تم کیا کرو گے اکرم؟

چلنے بڑی کڑوی تھی۔ اکرم کا دم رستوران کی کلوخی اور دھوئیں سے گھسنے لگا۔ وہ جلدی سے چائے پانی کے شواہی پارک کی طرف پیدل چل کر آیا۔ آج وہ مسند سے باتیں کرے گا۔ یہ لوگ اُسے بھر نہیں سکتے۔

بہت دیر تک وہ شواہی پارک کے ساحل پر گومتا رہا۔ اس کی بھوس تخی ہوئی تھیں تو ہونٹ بچنے ہوئے اور اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کے دل کی بحث ختم نہیں ہوئی۔ پھر کیا ایک

اکرم ساحل کی ریت پر نئی کیا اہم شخصوں کی ریت بھر کر کے گرانے لگا۔ اور سوچنے لگا۔

زندگی بے بار نہیں آتی ہے۔ موت ایک بلا آتی ہے۔ اہم وقت صنف کے کنارے ساحل پر پہلی ہوئی
اس بے کار ریت کی طرح ہے۔ تم۔ اکرم۔ اس میں سے ایک ہڈی کتنی مٹیاں بھر سکتے ہو
ایک۔ اور اکرم نے ریت سے ایک مٹی بھر لی۔ یاہو۔ اہم اکرم نے ریت سے دوسری
مٹی بھی بھر لی۔ میں ایک مٹی یا وہ مٹی وقت پر پاس برس یا سو برس۔ تم اس سے زیادہ نہیں۔
پھر۔۔۔ سوچو۔ تم اس ریت کو کھا نہیں سکتے۔ تیار سے تیار تم اس ریت کو دھو روں کی آنکھ میں
جو تک سکتے ہو۔ سینٹو بانکروا کی طرح۔ اہم بہت سے لوگ اپنی زندگی میں یہی کرتے ہیں اور وہ لوگ
خاتم ہوتے ہیں۔ پھر کوہ لوگ ہوتے ہیں وہی ریت کو دھو روں کی آنکھوں میں ڈالنے کے بجائے اپنی
آنکھوں میں ڈال لیتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں اہم عزت پسند ہوتے ہیں۔ پھر لوگ اس ریت سے گل بناتے
لگتے ہیں۔ اہم وہ لوگ احمق ہیں۔ کہ وہ لوگ ہر اہم احتیاط سے ریت کے ایک ایک ذرے گنے لگتے
ہیں۔ اہم وہ اس دنیا کے کنوس ہیں۔ کہ وہ لوگ اس ریت کو اپنے سر پر اٹھا کر ڈال لیتے ہیں اور ہنسنے
لگتے ہیں۔ اہم وہ لوگ اس دنیا کے بچے ہیں اہم اس دنیا کی ساری خوب سوتی اہم مصوویت انہیں
کے دم سے خاتم ہے کچھ بھی جو جائے۔ اکرم نے سوچا۔ میں تجھ ہی بنوں گا۔
اور وہ ساحل کی ریت سے اُنکر کر کر کی طرح چل کر اٹھا۔

رخصیہ بہت اُداں تھی۔ اس ماہ اسے کام بہت کم ملا تھا۔ وہ بھی دوچار بار رخصیہ کی
 سفارش سے۔ اور دو ایک بار فوری مرضت کے تحت ٹائر کیڑوں نے اسے سیٹ پر لٹا لیا تھا۔ منظر
 سنا تھا۔ وجہ وہی پڑتی تھی۔ اور وہ جانتی تھی۔ مگر اپنی عادت سے مجبور تھی۔ اپنی بہن کے ایک بچے کی
 بکٹی نیکر سیتے سیتے اس کے منہ سے بے اختیار اک آہ نکل گئی۔ کیوں کہ وہ بڑی بڑی اُمیدیں لے کر یہی
 آئی تھی۔ کیا ہوا اگر اس کا لنگ ساڑا تھا۔ میک اپ کے بدظلم میں ساڑا اپنی نور کائی نہیں دیتا۔
 پھر اس کے چہرے کے نقوش اتنے بُرے تو نہ تھے۔ رخصیہ نے وہ نیکر جو وہ اس وقت سی رہی تھی یہ
 خیال آتے ہی حیا فریض پر چھوڑ دی۔ اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور خود سے اپنا چہرہ دیکھنے لگی
 وہ دل میں کہتی ہاں جب بھی اُسے موقع ملتا تھا ایسا ہی کرتی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل کے
 اندر کوئی شبہ ہے۔ بے جا بار بار مٹانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے ایسا
 ہی کیا۔ جسے غور سے اپنے چہرے کی جان دیکھنے لگی۔ دل ہی دل میں تجزیہ کرتے ہوئے اس نے اپنے چہرے
 ہلکے کان، آنکھیں، ابرو، ہونٹ، دانت، و خد، ٹھوڑی اپنے چہرے کے ایک ایک عضو کو اپنے
 دھم کے پچ کچ سے کھول کر گھسیٹیں گے ہر زون کی طرح آئینے کی سطح پر دکھایا۔ اور انہیں ٹہرے

احتیاطاً سٹائٹ پٹ کر ٹول ٹول کر پر کھنے لگی کہ کہاں نقص ہے۔

عورت جب اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔ تو سب بھول جاتی ہے۔ وہ وقت بھول جاتی ہے۔ بھول بھول جاتی ہے۔ اور بھول جاتی ہے۔ کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ اس سے پہلے وہ کیا کر رہی تھی اور اس کے بعد کیا کیا کرتا ہے۔ وہ اپنا چہرہ اپنے دل کے اندر چھپا کے رکھتا ہے۔ لیکن عورت اپنے چہرے کو آنکھ۔ رخسار اور جوتھوں کی سطح پر باہر لے آتی ہے۔ اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے رضیہ کو یہ احساس نہ ہوا کہ کب اس کی کھولی کا دروازہ کھلا۔ کون اندر داخل ہوا۔ اور جب پاؤں آہستہ آہستہ آگے آتے ہوئے اس کے پیچھے کھڑا ہوا اس سے کہنا نہ ہوا کہ وہ اپنا چہرہ دیکھنے میں مصروف تھی۔

پھر کسی نے جس کر کہا: کیوں آئیے میں اپنی صورت دیکھتی ہوں۔ تم تو ذرا بھی خوب صورت نہیں ہو۔“
اک بجلی سی خیرت کی چمچ مار کے بچے کو کھڑی۔ یہ عشرت تھا۔ اور ایک سبز دھاریوں والی شرٹ اور نئی چٹون پہنے ہوئے۔ جوتے چمکاتے ہوئے۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ بغل میں اس نے ایک بٹل دبا رکھا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ رضیہ نے پوچھا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

عشرت نے مسکرا کر بٹل دکھوا۔ اس میں سے پانچ سو فی نیگزیں نکلیں۔ یہ رضیہ کی پسینے کے تپوں کے لئے تھیں۔ پھر اس نے ایک قمیض اور چوڑی دارپا بٹلے کا کپڑا نکالا۔ یہ رضیہ کی آٹاں کے لئے تھے۔ پھر اس نے بٹل کا خالی کاغذ اٹھا کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ رضیہ خوش بھی ہوئی لیکن کچھ اُداس بھی۔ عشرت اس کے لئے کچھ نہیں لایا تھا۔ اور یہ تو تیس روپے عشرت نے اُسے دس دس کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کاجے کے لئے؟“ رضیہ کے دل میں ایک بجلی سی امید کی کرن آہستہ سے جاگئی۔

عشرت نے کہا ”تبادلے میں رہتا ہوں۔ بولی کھاتا ہوں۔ سوتا ہوں۔ تم کوئی سورت کی چارانی

یو کب تک غیرت بانٹے جاوگی ؟

رفیہ کو ان بد بوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے روپے لے لئے۔ ایک بار بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کا دل اندر سے جیسے میوہ گیا ہو۔ حضرت ایک ماہ سے یہاں رہ رہا تھا۔ ان کے تعلقات بہت مختلف دوستانوں کے سے تھے۔ وہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن اس کی عزت بھی کرتا تھا۔ اس کی قربت بھی ایک دوری تھی۔ اور اس کے نزدیک آنے میں بھی ایک فاصلہ تھا۔ ایک خوش گواری جھبک ہو گی کہی تو رفیہ کو بہت اچھی معلوم ہوتی۔ کبھی کبھی کھل جاتی۔ کبھی بار باتوں اور بحثوں کے دوران میں رفیہ نے عموماً کیا۔ جیسے عشرت اسے عجیب سی لگا ہوں سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے اس کا دھیان اس کی باتوں میں نہیں ہے۔ اس کی نگاہ رفیہ کے جسم پر جم پاتی ہوئی جا رہی ہے۔ رفیہ کو اپنے چہرے پر شبہ تھا۔ اپنے جسم پر شبہ نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ ایک بہت لمبی دل کش موتی۔ ٹھوس دالے مناسب جسم کی مالک ہے۔ جو چلتے چلتے اکثر لوگوں کو پٹ کر اس کی طرف دیکھنے کے لئے مجبور کر دیتا تھا مگر یہ کیا ایک بار بھی تو ایک ماہ میں عشرت نے کوئی چھوڑی حرکت نہیں کی اور وہ نگاہ تو اتنی مصوم ایسی چھپتی ہوئی تھی کہ اس کا کچھ بھی مطلب نہ مل سکتی تھی۔ اچھا کبھی بُرا کبھی۔ شاید عشرت مجھے پسند نہیں کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتی کیوں تھی کہ عشرت اسے پسند کرے۔ بلے کیوں چاہتی تھی۔ اسے تو ان باتوں سے شدید نفرت تھی۔ پھر وہ کیوں چاہتی تھی کہ عشرت اُس کوئی نہیں۔ لیکن عشرت ضرور چاہے۔ ایک بار ان لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھ لے۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ کہاں دیر پا چاہتی ہے۔ منت بھیجی۔ اُجاڑ۔ ان مردوں پر۔ بڑے بختے ہوئے ہوتے ہیں۔ عشرت نے کہا : ”ایہ تم یہ آئینہ چھوڑو۔“ اور جلدی سے ساڑھی بدل کے میرے ساتھ باہر چلی چلو۔

”کہاں ؟“

”کہیں بھی چلیں گے۔“ عشرت نے بڑی فراخ دلی سے اس طرح بازو پھیلا کے کہا جیسے آج بسندی

زمین اور آسمان اس کا ہو۔

”بھی ساڑی ٹیک ہے۔“ رضیہ نے ذرا مشکوک لہجے میں اپنی ساڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوں ہوں! نہیں چلے گی مادام“

عشرت کمر کی ہر جا کے کھڑا ہو کے باہر دیکھنے لگا۔ رضیہ ساڑی بدلنے لگی۔

عشرت نے کمر کی سے شرے بغیر کہا: ”اب گھوم کے دیکھ لوں۔“

”نہیں! نہیں۔“ رضیہ ایک کونے میں سے چلائی: ”ابھی نہیں۔ میں ساڑی تبدیل کر رہی ہوں۔“

”اے! عشرت بہنے لگا۔“

بانی کھلے شینڈلر عشرت نے اندر سے شیشی بجائی اور ایک خالی ٹیکسی پکڑ لگا کے بڑے زانے

سے ان کے قریب آ کے فٹ پاتھ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ رضیہ نے حیرت سے کہا: ”ٹیکسی میں؟“

عشرت نے ٹیکسی کا دروازہ اس کے لئے کھول کر اور بڑے احترام سے جھک کر کہا: ”مکے عالم کے لئے۔“

رضیہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اس کے قریب عشرت آ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔

”کہاں چلیں گے؟“ عشرت نے پوچھا۔

”تم کہو۔“ رضیہ کو اپنی آواز بڑی اجنبی معلوم ہوئی۔ عشرت نے چند لمحوں کے لئے سوچا۔ پھر اس نے

مشکو کے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا: ”سینٹر کو لا پے چلو۔“

ٹیکسی ڈرائیور نے مسکرا کے اپنی ٹوپی تیر مٹی کی، اور ٹیکسی کی رفتار یکایک تیز کر دی۔ اور رضیہ ایک دھچکے

سے عشرت کی گردن ہا پڑی اور عشرت کے سر سے ہوئے نقصوں میں کسی پراسرار خوشبو کی تھک تیر مٹی۔

رضیہ نے جلدی سے اپنے آپ کو عشرت سے الگ کیا۔ اور اپنی سیٹ پر احتیاط سے بیٹھ گئی۔ مگر وہ چاہے

لوں کا بس بہت دیر تک کسی ساز کے دم بیٹھے سوں کی طرح اس کے دل و دماغ میں لڑنا رہا۔
 کولہے میں سوزین ایڈیٹر شوکی دکان پر عشرت نے جھکی کر دکان اور رفیعہ کو لے کر پلٹ کر گیا۔
 ہی ایک باہمی چہرہ پر ایچکھو انڈین لڑکی سے کہنے لگا.... وہ شوکیں میں جو بزرگ کی اونچی اڑتی کی
 سینڈل ہے۔ وہ لے آؤ۔

وہ لے آئی۔

عشرت نے رفیعہ سے کہا: "ٹرائی کرو۔"
 سینڈل نڈاڑی تھی۔

سوزین بولی: "میں آپ کے ساتھ کا سینڈل لاتی ہوں۔"
 رفیعہ نے وہ سینڈل پہن لی۔

"اب چلو" عشرت نے رفیعہ سے کہا۔

رفیعہ اپنی ہنر سازی کو سمجھاتے ہوئے دکان کے اندر بچے ہوئے ٹائیپے پر چلنے لگی چلتے
 چلتے خود خود اس کی کرکاخم داغ ہو گیا۔ سینہ ابھرا آیا۔ چال میں ایک ٹگنت ادا دایدا پیدا ہوئی عشرت
 نے تالی بجا کے کہا: فرسٹ کلاس!

سوزین بولی: "اسے باندھ دوں؟"

عشرت نے کہا: "اسے نہیں، اسے نہیں۔" عشرت نے رفیعہ کے گلبے ہوئے پُرنے چپوں کی طرح
 بڑھا دیا۔

سوزین نے مسکرا کر انہیں ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ عشرت نے وہ ڈبہ اُٹھالیا۔ پل ادا کر دیا اور رفیعہ
 کے ساتھ آ کے باہر نکلیں۔ جیسی داسے سے کہنے لگا: "سیٹھ انڈیا گیٹ چلو۔"

انڈیا گیٹ پہنچ کر عشرت اور رفیعہ دونوں ٹیکسی سے اترے۔ عشرت کی ٹیکسی میں پُرائی چپوں کا

اوپر تھا۔ سمندر کے کنارے کنارے ایک اونچی دیوار تھی۔ عشرت نے بازو گمما کے زور سے وہ ڈبہ سمندر میں پھینک دیا۔ فضا چلائی رو گئی۔

”کیا کرتے ہو کیا کرتے ہو۔ میری چل!“

عشرت نے کہا: ”لامام۔ یہ پڑے چڑا تھیں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اب خدا اس اونچی اڑی والے سبز رنگ کے بیٹنل میں اپنی سبز سازی کو بھلاتے ہوئے چلو۔ دیکھو تہااری خوب صورتی کا ہر خم کیسے جھلکتا ہے تمہارے جسم کا ہر اعضاء اس ساڑھی کے باوجود کیسے چمک چمک کر باہر آجاتا ہے۔ لامام تم عورت نہیں ہو خوبصورتی کی اٹلیکس ہو!“

رضیہ کی آنکھیں یکایک مسرت سے پچکنے لگیں۔ حیرت۔ مسرت اک نامعلوم سی حسرت تھی۔ بولی

”یہ آج تمہیں کیا ہوا ہے؟“

عشرت نے کہا: ”کچھ نہیں آج ہوا چلتی ہے۔ گل مہر کے بھول بھولتے ہیں۔ سمندر قہقہے لگاتا ہے بلو اب کہاں چلو گی؟“

رضیہ نے کہا: ”میں تو کتنی شمی چاٹ کھاؤں گی۔“

جو پانی پرائیوں نے کتنی شمی چاٹ کھائی۔ وہاں سے کولا بے واپس جا کے انہوں نے سالز برگ میں آئس کریم کھائی۔ سالز برگ سے وہ لبرٹی کے سامنے گئے۔ جہاں رضیہ اور عشرت نے سکترے کے پیلوں کا درس دیا۔ یہاں لگی لگی بارش شروع ہو گئی۔ رس والے کے سینڈ کے نیچے کھڑے کھڑے عشرت لبرٹی کی بوتلوں روٹینوں کی جھلکیاں رضیہ کے چہرے پر گزرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ارغوانی۔ شہابی۔ گلابی۔ نیلم۔ یاقوت۔ فیروزہ۔ پھراج کتنی ہی خوب صورت جواہرات کے سنگ رضیہ کے چہرے پر سے گزرتے جا رہے تھے۔ اور وہ اس وقت کتنی خوش تھی۔ اپنے آپ میں کہتی ہوئی

سائنس تیز رہتی رہی۔ تجوں کی طرح خوش معصوم اور پُر اعتماد.....

دھیرے دھیرے بارشس ہو رہی تھی۔

بارشس روشنیاں، دھند، لوگوں کی گفتگو کسی دوسری دنیا سے آئی ہوئی رافیہ کا جہم تناسیب، جوان اور کسی پرانی اجنبی پر اسرار خوشبو میں، کا ہوا عشرت نے اپنی آنکھیں بند کر کے دس کا گھوٹ پیا، آبستہ آبستہ، جیسے وہ اس کی مہفتا بنٹھاس کے ایک ایک قطرے سے حظ اٹھا رہا ہو۔

یہ ایک بارش تیز ہو گئی۔ اور دونوں ٹیکسی میں جا پہنچے ٹیکسی چلنے لگی بارش کے تیز تر خڑے زوردار گونج سے کالج کی کمر کیوں سے ٹکرا کر بچنے لگے۔ باہر طعان بڑھ رہا تھا، لیکن اندر کتنی خاموشی تھی۔ کتنا سکون تھا۔ وہ اندر رافیہ کیل پھر غریب ہو گئی، اُور اسی، وہ جا بجا دھمت، بڑو کا کیل، احساس کا دھوکا اور وہ قریب جو یہ سماج محنت کو ہمیشہ دیتا ہے، مگر آج، یہ اس وقت کا تو کس قدر قطرہ کشیدگی ہوئی خوب صورتی اور سترت کا ہے۔

رافیہ نے سوچا، ہائے یہ کتنی صدیوں کے بعد آتا ہے۔ ہائے میں کیسے اس کا دامن بھر کے اس کے پاؤں سے لپٹ جاؤں۔ تاکہ یہ کتنے کہیں بھاگ نہ جائے۔ میرے لئے، میرے اپنے لئے میرے اپنے پیارے لئے، آ میرے سینے سے لگ جا، میں تجھے اپنی چھاتی سے لگ کے نوری سنائوں گی اور تو میری گود میں، میرے سارے اوصاف، سنوں، میرے سارے سہرے خوابوں کو دیکھتا ہوا۔ سو جائے گا۔ میرے نقشے لئے..... سو جا..... سو جا..... !

مسلم نہیں وقت سو گیا، کرافیہ کے احساس سو گئے، اس کے سارے شہر سو گئے، وہ بجلی ہوئی راہیں اور عتیں۔ وہ خوف اور ڈر اور بے گامائی کے سوچوں سے سائے سمٹ کر سو گئے اور اس نے ایک ایسی تیز بھری، ایسی اطمینان کی، اعتماد اور بھروسے، سترت اور خوشی سے لبریز آہ، جو اپنی اس ہلکے کے اندر سارے جہاں کی طرف ناگ فریض چھپائے ہوئے تھی، کوئی مرد اس طرح سے آہ نہیں بھر سکتا محنت بھی کبھی کبھی، ایک بار زندگی میں یا دو بار یا تین بار، لیکن بار بار نہیں، یہ آہ جو آہ نہیں ہوتی زندگی

کی کبری گیسو راہ ہوتی ہے۔

رفیعہ جب جنسی سے اُتری تو ایسے لاکڑاڑی تھی جیسے اس نے خوشی کی شراب پی ہو عشرت نے جنسی چھوڑ دی۔ اب وہ میرین ڈائیو کے آخری سرے پر کھڑے تھے۔ اور بند کے اُس کنارے کی طرف جارہے تھے جو سمندر کے بیچ میں چلا جاتا ہے۔ اب باش ترک گئی تھی اور چاندل طرف دُسمند چھا گئی تھی۔ اور وہ دونوں خاموشی سے تھروں کے چنے پر ٹیڑھ کر سمندر کی بے قرار لہروں کو تھروں سے ٹکرا کر واپس جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ رفیعہ اور پر سے خاموش تھی۔ لیکن اس کا دل ایک عجیب تڑپ اور بے قراری سے بھر گیا۔ بے قراری جو بولتی نہیں ہے۔ لیکن دل میں ایک خنجر کی طرح چھپی رہتی ہے۔ عشرت رفیعہ کو ایک بُرائی غزل سنانے لگا۔

غزل اُس کرچی رفیعہ خاموش رہی۔ سمندر کی لہروں کی طرف جھٹی رہی۔
 بکھوڑے کے بعد رفیعہ نے کہا۔

”عشرت؟“

عشرت رفیعہ کی طرف دیکھنے لگا۔

رفیعہ نے کہا: ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

عشرت نے کہا: ”میاں جنوں کے سوا کچھ نہیں ہے گا۔“

”چنے ہی لے آؤ۔“

بلی بلی سردی میں گرم ٹنگٹنے۔ ٹبر ٹبر بے ٹھننے جوئے جنوں کی خستہ دوی۔ وہ ہونٹوں کے اندر سے کڑک کڑک کی دھیمی دھیمی آواز۔

رفیعہ کافی جنوں کے لئے چھ آٹھا عشرت چنے لینے چلا گیا اور دیر تک عشرت کو دھند میں غائب ہونے

ہوئے نکستی رہی۔ اے خدا! یہ منظر کس قدر حسین ہے۔ وہ تو اس لمحے کاں کہیں نہ تھی وہ تو اس وقتی نہ تھی کہ کہیں ایسی خوب صورتی کے نازک نقوش چھو سکتی۔ یہ گہری پراسرار دُھند جو دنیا کی بد صورتیوں کو اک مہربان اس کی طرح ڈھک دیتی ہے۔ اور خوب صورتیوں کو ابھار دیتی ہے۔ جڑتی ہوئی چیزوں کو اپنے ہاوس میں آرام سے سٹلا دیتی ہے۔ اور ساکت چیزوں کو چپنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ رُفیع نے گھوم کر اُدھر دیکھا بدھ عشرت غائب ہوا تھا۔ میرین خدا کی بڑی بڑی سٹلے سے اوپر اُٹھ گئی تھیں۔ اُدھ دھند میں لپٹے ہوئے جانوں کی طرح اپنے روشن کالج کی کھڑکیاں کھولے ہوئے تیر رہی تھیں۔ اُدھ ان بڈنگوں سے پرے ایدھیں تھیں کہ آخری گر جانا منزل کسی بار بارانی جہان کے لاجبے ستروں کی طرح دھند میں ڈھل بی ہوئی سلوا ہوئی تھی۔ اُدھ بیک ذوق کے خمی سے گھر چھوٹے چھوٹے ڈونگوں کی طرح اپنے فکر سے اکڑ کر دھند میں بچے جا رہے تھے!

بھر رُفیع نے دھند میں آتے ہوئے عشرت کا چہرہ دیکھا۔ اُدھ وہ لمحہ اور وہ چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی روح پر ترسم ہو گیا۔ وہ چہرہ وہ کہی بھول نہیں سکتی۔ دھند میں لپٹا ہوا۔ خاموش خوب صورت۔ آگے بڑھتا ہوا چہرہ۔ وہ چہرہ جیسے اُس کی طرف متھا ہوا آ رہا تھا یا اُس سے بھی پہلے کسی پہلی ہوئی لائنابی دنیا کی طرف تک رہا تھا۔ کیسا خاموش متھا ہوا۔ اپنے آپ میں کھڑا ہوا۔ اللہ کسی دنیا کی آواز سناتا ہوا۔ وہ چہرہ آ رہا تھا۔ اور بیک رُفیع کا دل خوف سے لرز گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ یہ چہرہ کہیں دھند میں غائب ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں کے اوپر سے تیرتا ہوا۔ اِن بڈنگوں، دھندلوں، روشنیوں پر تیرتا ہوا دھند کے اجنبی پُراسرار سیاہ و سفید ماستوں پر چلا جائے گا۔ جو زندگی اُدھ موت کے بلاوے ہیں۔

مگر نہیں وہ چہرہ قریب آ گیا۔ قریب آ گیا۔ بالکل اس کے قریب آگے جھک گیا اُدھ اس وقت رُفیع کے سامنے احساس اس کی آنکھوں میں بھٹ آئے تھے اور نہ وہ کُڑھ سکتی تھی اور نہ دیکھ سکتی

تھی، نہ محسوس کر سکتی تھی۔ سرف یہ ایک چہرہ تھا۔ ایک رو تھی اور کچھ نہ تھا۔ تاریک سمندر تھا۔ تاریک زمین تھی۔ تاریک دھند تھی۔ اور وہ چہرہ تھا۔ روشنی کے میدان کی طرح طوفانی میں بلند اور مضبوط اور جامد۔ رخصت نے بے قرار ہر کر عسرت کی بانہ پکڑ لی۔ عسرت نے جنوں کی پٹریا اُسے دیتے ہوئے کہا "بڑی بھوک ہو!"

بھوک تو وہ ہے۔ مگر عسرت کیا تم میری اس بھوک کو بھوکے ہو۔

عسرت نے سمندر کی لہروں میں چنے کا ایک دانہ پھینکتے ہوئے کہا "رخصت! میں بہت خوش ہوں۔ آج مجھے خوشی جی کی بچہ میں ایک چھوٹا سا دل ملا ہے۔ بہت چھوٹا سا ہے۔ مگر دل ہے۔ اور یہ وہی خوشی جی ہیں جنہوں نے مجھے فلم ٹیٹ میں قیل کر دیا تھا۔ آج انہوں نے مجھے ایک سو روپے ایڈوانس میں دئے۔ اب ہم۔۔۔ اب ہماری حالت وہ نہیں رہے گی؟ یہ ہم۔۔۔ ہائے! لوگ کون ہیں۔ رخصت! کا دل کاٹنے لگا۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر چپ رہی۔

عسرت ہونے ہوئے کہنے لگا۔ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو "اس ماہ میں نے تم سو کئے ہیں۔ آگے ماہ چار پانسو کما لوں گا۔ پھر ہم یہاں بھٹری بازار کی اس گندری کھولی میں تھوڑی دیر کے، کوئی عمدہ چھوٹا سا عکس لیں گے۔ ایک کروڑ تیار ہو گا۔ ایک میرا۔ ایک تمہارا اور بچوں کے لئے۔ ایک سو روپے ہر ماہ اپنی آنی کو سنبھال لوں گا۔ پھر ہم۔۔۔"

پھر وہی ہم۔۔۔ رخصت نے گویا اندر سے اپنے کان بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اس ہم کو مت سنو۔ اس ہم کے قربت جاؤ۔ جس ہم کو اندر مستانے دو۔ دیکھو تم کیسے کانپ رہی ہو۔ یہ ہم کوئی نہیں ہے۔ یہ کہیں نہیں ہے۔ یہ تو بالکل اجنبی ہے۔ یہ ہم جوشام کی ہواؤں میں آیا ہے اور محبت کی مٹی آواز بن کے آیا ہے۔ اس ہم سے نکالو۔ رخصت! اپنی روح کی ساری کھڑکیاں روشن دلاں بند کر لو۔ اور اس ہم کو کبھی بھی مت آنے دو۔

پھر ہم ہر روز یہاں سیر کرتے آئیں گے۔ اس کیسے خوش خوش گوارا کریں گے ہم یہ عشرت نے
 رخصت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سنو رخصت تم اور ہم۔۔۔ پھر وہی ہم؟ یکایک رخصت نے کان ہی نہیں
 آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اور اپنی صبح کا سارا انداز اس ہم کو تنہا تنہا میں گھار دیا۔ پھر اُسے معلوم بھی نہ ہوا،
 کہ وہ کیا شے رہی ہے۔ عشرت کیا کہہ رہی ہے۔ اُسے صرف اتنا معلوم ہوا کہ آنکھیں بند نہ کرنے کے باوجود اُنہو
 باہل بے اختیار ہو کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ نہ سبک رہی ہے۔ اور نہ ہی ہے۔ اور
 ہم اس کی ساری کوششوں کے باوجود روشنی کی ایک لکیر کی طرح سارے بند صداقتوں اور کھریں
 اور دھندلوں سے گزرتا ہوا اس کی صبح کے کونے کونے کو متحرک کر رہا ہے!

رخصت بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دور کہیں کسی بلڈنگ میں کابینہ کی کوئی روشنی کھڑکی کھلی اور موسیقی دھند کے برابر پہنچتی ہوئی
 اس کنارے آئی۔ جہاں عشرت اور رخصت کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے ہوئے
 دوسرے عشرت نے رخصت کو کھینچ کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ رخصت کا سارا
 جسم کانپا۔ اور پھر کانپ کر یک بار کی عشرت کی باہوں میں گھل گیا۔

اس خاموشی کے باہر غریقی تھی اور بے کاری۔ اور زندگی کے سارے تلخ مسائل۔ رخصت نے سوچا لیکن
 اندہ اس خاموشی کے اندر چند لوگوں کی مافیت ہے۔ اور موسیقی کا شکوہ اس کی غفلت اور غفلت غیب کی
 کاہلوں میں کانٹا کھانی کا تھکا چڑھوں کے بعد وہ اس خاموشی سے باہر ملے گی۔ پھر اسی گھٹن جس
 تلافی اس نے ناپاسی کا مقابلہ کرے گی۔ مگر ان چند لوگوں کے لئے۔ تو وہ اس لازوال موسیقی سے
 اپنی صبح کو قوت اور طاقت سے محروم کر سکتی ہے!

موسیقی ایشیائی رات کے پھولوں کی طرح پھٹتی ہوئی۔ موسیقی پُر اسرار دھند کی لہریں ہر ڈھلکی
 ہوئی۔ موسیقی کسی دریا کی گشتی کے مغربہ باباؤں کی طرح اپنا سینہ پھیلانے دھند میں بہتی جا رہی تھی۔

دعوت پہنچی گئی۔ بہتی گئی۔ بھلا کہ۔ فیہ نے محسوس کیا۔ وہ اور عشرت دونوں اکیلے کھڑے ہیں۔ محبت
 کے ایک جزیرے میں۔ اور چاروں طرف وقت بہہ رہا ہے !!!

روحانی سٹوڈیو انڈیری میں جوٹی جی کے سیٹ پر بے ندر کی بحث چل رہی تھی بحث کرنے والے تھے۔ جوٹی اور اکرم اور کھننے والے تھے۔ جوٹی جی کے اسسٹنٹ، کیمرو میں، راج لا اور شانہ۔ چند لمبے والی لڑکیاں جن میں رضیہ بھی شامل تھی۔ سیٹ بہت بڑا تھا۔ تصویر گوسا جی تھی۔ لیکن سیٹ فینٹسی مینی میٹا سی تھا۔ راج لا ہیرو کے فرائق میں بدلے بدلے سوجاتی ہے۔ اور خوب میں ایک منظر دیکھتی ہے۔ جو اس سیٹ میں دکھایا گیا تھا۔

لیکن جوٹی اور اکرم کی بحث اس سیٹ یا اس سیٹ میں تے جلتے والے شاطے سے متعلق نہ تھی۔ جب سے اکرم نے غیر خوش کی ہدایت کاری پر لات لاری تھی۔ اس کی بے ندر کاری بڑھتی جاتی تھی۔ اور اب تو اس کے خوب صورت چہرے پر بھی نمایاں ہو چکی تھی۔ اکرم نے پریشان چکے کھلے کھنے شروع کر دیے تھے۔ جوٹی جی نے اکرم پر ترس کھلے کے داد کھہ لوگ کہتے ہیں کہ ترس احتیاط اور چہرہ ہے) اُسے تاج کا ایک منظر گیت میں بانٹنے کے لئے دیا تھا۔ آج اکرم وہ گیت لے کے آیا تھا۔ دراصل اکرم کوئی اور ہی گیت اور تاج کا کوئی دوسرا ہی منظر لے کے آیا تھا۔ اور اس نے بھی جوٹی جی نے اس کا گیت ناظرہ کر دیا تھا۔ ویسے اگر وہ گیت انہیں دل سے پسند ہی ہوتا۔ پھر کیا وہ اُسے ناظرہ

کہتے۔ انہیں دوا مل کر مے کوئی گیت کھونا نہیں تھا۔ مرنے آئے ذلیل کرنا مقصود تھا۔ اس وقت بحث کا سرخ تیزی کی طرف تھا۔

جوشی جی نے سامنے پڑی ہوئی تپائی پراتے زور کاٹکا مارا کہ تپائی لٹ گئی۔ لال بھسوکا ہو کے بولے۔
”منہیں اکرم بھائی۔ نہیں چلے گا۔ یہ گیت مجھے اپنے ٹانس میں نہیں چاہئے۔ کچھ اس طرح گیت لکھو۔
رات جوان ہے۔ آسمان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“

اکرم نے کہا: ”گرہ ٹانس کے بول تقریباً یہی ہوتے ہیں۔ رات جوان ہے۔ آسمان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔ تمہارے اسی سیٹ کے ناچ کے بول بھی تقریباً یہی ہیں۔ کیا ناچ اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ تمہارا ناچ یہ بھی تو کر سکتا ہے۔
دھوپ ٹھیلی ہے۔ گیموں کی بالیاں سرسرا رہی ہیں۔ آؤ کام کرو۔“

یا

بل بکلا رہی ہے۔ چنی سے دھواں نکل رہا ہے۔ سوت کے گولے ہمارے ہاتھوں کے منتظر ہیں۔

یا

برق نے سارے راستے بند کر دیے ہیں۔ گھروں سے کوئی باہر نکل نہیں سکتا
آؤ برق چلائیں۔

تم نے (RED SHOES) میں جوتوں کا ٹانس دیکھا تھا؟ اور اخبار کا ٹانس کنٹا دل کش لکھ رہا ہے؟
تاجم رنگ کتابوں کا ناچ شال کے طور پر کیوں نہیں دے سکتے؟

جوشی جی نے اکرم سے کہا: ”لے بھائی میرے تم اپنا فلسفہ یہاں مت لاؤ۔ اپنے کو کچھ اور نہیں چاہئے۔ اپنی کوئی تجربہ کرنا نہیں چاہتا۔ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اپنی تو یہ ٹانس بھی گرم پھر کے

ہیں بھی دے گا۔ رات جوں ہے۔ آسمان پر چاند ہے۔ میرے پاس آجاؤ۔ ہم تمہاری طرح ناکام ڈانڈے
ہونا نہیں بھٹکا۔ اپنے کو کوئی اور ناپ نہیں چاہئے۔ کوئی ادگیت نہیں چاہئے۔ کوئی اور خیال نہیں چاہئے
تم کو یہی ملتا ہو تو اسی خیال کو گما کر دوسرے دل میں باندھ کے لاؤ۔ بھوکا مرنے لگتا تو اندر سے
باہر جاؤ ۛ

”مگر ملک اور قوم...“

”ایسی کی تھی ملک اور قوم کی۔ سب سے پہلے اپنی جیب گرم کرو۔ دیکھو بھائی۔ ہمارا ناسر پوڈیوسر
باجو یا سیٹھ ہی کرتا ہے۔ اس کا ڈھری بیڑا لالہ بھگت لال بھی کرتا ہے۔ اس کا انڈر وئر مگر ہے ہی
کرتا ہے۔ اور پھر آقا (سلا)، آڈنٹس (ماضی) کی مگلتا ہے!“

”تم لوگوں کی یہ بات میں نہیں مانتا کہ لوگ ہمیشہ اسی طرح کی شاعری کو پسند کرتے ہیں بے شک محبت کی
شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں۔“ اکرم نے کہا۔ ”اور یہ ایک بڑی خوب صورت چیز ہے۔ انسانی
محبت، سماج کی بہترین قدر میں سے ہے۔ لیکن آپ محبت کے ساتھ ساتھ سماجی ماحول کی چاشنی
بھی دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فیض کی شاعری ۛ

”کوئی بچہ؟ راج لکے لکے کان کھڑے ہوئے۔ کیوں کہ بیڑوں میں وہی آئل کوئل بھی جاتی تھی۔
ششاد بھلا کہاں بچے رہنے والی تھی۔ اس نے بھی اتھو دیا۔“ ”ہیں تو کم ذات کی خیریں بہت پسند ہیں۔
اس وہی قرے سنائی تھی نا؟“ ششاد راج لکے لکے طرف دیکھنے لگی۔

راج لکے اُسے ٹوک کے کہا۔ ”اسی کم ذات نہیں ہم زاد۔ تجھے دس بار بتایا ہے ۛ

”ہاں ہم زاد، ہم زاد“ ششاد نے دیہاتیوں کی طرح اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے فدا سا جھلکتے
ہوئے کہا۔ ”وہ نہایت ہی خفیت سا۔ بااصل بھڑوں کی طرح کبھی کبھی فدا سا جھلکتی تھی۔ اور لوگوں کو اس کا
یہ جھلکا اس قدر پسند تھا کہ اس کی ہر تصویر کے مکالموں میں اس کا جگہ جگہ خیال رکھا جاتا تھا۔

اب اسٹارٹ پر جب اثر مٹری کی دو مہذب ہیر وٹیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں تو اکرم خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اُسے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے فائل بغل میں دبایا اور چپکے سے سیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جوشی جی نے نوٹ کا ایک قہقہہ لگایا اور بولے "آج کلے ہیں علی گڑھ سے اثر مٹری کی حالت ٹھیک کرنے۔ اپنی پتلون کی حالت تو ٹھیک کر نہیں سکتے۔" اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔

"ایکسٹرا ڈانس گرلز آن دی سیٹ! جوشی نوڈ سے انگریزی میں چلایا۔ اور رفصہ۔ رفصہ اور ولایت بیگم اور دوسری لڑکیاں جلدی سے سیٹ کی طرف بھاگیں۔ بابو لال انھیں ہدایات دینے لگا۔ جوشی جی نے بابو لال سے کہا "لڑکیاں اس شاٹ میں نوڈ سے کوٹے ٹھکا سکتی ہیں۔ لاگ شاٹ ہے۔ سنو ونگ شاٹ پر اعتراض نہیں کرے گا۔"

بھر جوشی جی نے فکر کشاد اور راج سے کہا "دلبرو، تم بھی میک آپ کر لو۔ اگلا شاٹ آپ کا ہے۔" راج نے اور کشاد میک آپ روم میں بائیں کشاد نے راج سے کہا "مجھے بے چارے اکرم پر جراتیں آتا ہے۔" راج لاہوری "تو جانی۔ بولا نا اُسے اپنے پاس۔ ویسے دیکھنے میں خاصا خوب صورت ہے۔"

شمشاد جنس کر میک آپ کرنے لگی۔

اُن کے میک آپ روم سے دھکے پرے ایکسٹرا بھائیوں کا میک آپ روم تھا۔ وہاں ایک نکل خنپاؤہ ہر پاتا تھا۔ جیسے ان لوگوں کے میک آپ روم میں ہمیشہ جوتے تھے۔ شمشاد نے یہ خود مٹری کے راج سے کہا "جانی یہ ٹکلا ہوا دواؤہ تو بند کر دے۔ یہ لو فر وگ اس قدر شور مچاتے ہیں۔"

راج دواؤہ کی جانب مٹری۔ ایک ایک سانس سے اُس نے عشرت کو ایکسٹرا میک آپ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ سبز رنگ کی دھاری دار ٹی شرٹ اور بھوری اولی پتلون میں وہ بہت

جج رہا تھا۔ راج تاجیک خدا سے پرکھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پھر سانس اندر کھینچ کے بولی: "ہائے شمشاد باطل ایلین لاڈ ہے۔"

"کہاں؟" شمشاد ڈریسنگ ٹیبل سے بھاگی بھاگی دروازے پر آئی۔ عشرت ان دونوں کی طرف پیٹھ کے انکسٹرا میک آپ دم کی طرف جا رہا تھا۔ خدا سے پر جگہ کے وہ ٹکڑا۔ خدا سا گھوم کے اُس نے راج تاج کی طرف دیکھا۔ راج تاج شمشاد دونوں جلدی سے دروازے کی اوٹ میں ہو گئیں۔ راج تلے شمشاد کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کے کہا: "دیکھ! کیسے دل دھک دھک کر رہا ہے؟"

شمشاد نے کہا: "جج۔ باطل ایلین لاڈ ہے۔"

راج تلے کہا: "اور بے چارہ انکسٹرا میں کام کرتا ہے۔ ہائے ری کم نمی؟"

شمشاد نے سنی خیر سمجھا ہوں سے راج تاج کی طرف دیکھ کر پوچھا: "کس کی کم نمی آئی ہے؟"

مگر راج نے کوئی جواب نہ دیا پس لے کر اپنے ابرو درست کرے گئی۔

شام کے پانچ بجے کے قریب رہیہ کا آخری شاٹ ختم ہو گیا۔ عشرت کھمٹ ایک شاٹ

باقی تھا۔ رضیہ نے عشرت سے کہا: "میں کہیں میں ہل کے بیٹھی ہوں؟"

عشرت نے کہا: "ہاں تم چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس کے کئی مہینے منٹ کے بعد عشرت کا شاٹ بھی ختم ہو گیا۔ اور جو شی جی نے عام انکسٹرا لوگوں کو پہنچا دی

اب صرف دو کلوز اپ باقی تھے۔ ایک شمشاد کا۔ ایک راج تاج کا۔

راج تلے کہا: "میرے سر میں خدا ہو رہا ہے؟"

جو شی جی نے کہا: "میں ایک ہی ٹو شاٹ ہے۔"

راج لا جلدی سے برنی : کل نے لینا۔ اس وقت بجے جانے دو، سرسٹا جا رہا ہے :

یہ کہہ کر اندر جوشی جی کی خزیہ گفتگو سے بغیر راج لا جلدی سے سیٹ سے باہر نکل آئی کیٹشیں راتے میں پڑتا تھا۔ لیکن کیٹشیں سے پہلے شیخ سے باہر ایک کھلی جگہ میں راج کی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ راج جلدی سے میک آپ اپنا آٹا سے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کے آگے بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد مشرت میک آپ دم سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے باہر نکلا اور کیمین کی طرف چلا۔ راستے میں اس کے کانوں میں گواہی آئی "کہاں جاؤ گے ؟"

مشرت نے پٹ کے دھچکا۔ راج لا جلدی میں تھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جی ؟" مشرت نے پوچھا۔ اس کے کانوں کا اعتبار نہ رہا تھا۔

"آپ — آپ کہاں جا رہے ہیں ؟" راج لکھتے پوچھا "میں آپ کو چھوڑ دوں ؟"

مشرت کے منہ سے بے اختیار نکلا "میں بھنڈی بازار میں رہتا ہوں"

"آجے بیٹے۔ میں آپ کو وہاں چھوڑ دوں گی" راج نے اپنی گاڑی کو سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

مگر بس ایک۔ مرت ایک لمحے کے لئے۔ مشرت بچکھپایا۔ پھر وہ گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔ راج نے گاڑی سٹارٹ کر لی۔ گاڑی دوسرے دوسرے بڑھتی ہوئی کیمین کے سلسلے سے گزرتی "اے اے وہ دیکھو یہ مشرت" رضیہ نے رضیہ کو زور سے شہو کا دیا۔ دونوں ایک بچہ پر مٹی چلے پڑی رہی تھیں۔ رضیہ کے ہاتھ سے پیالہ گئی۔ بعد فرش پر صحن سے ٹوٹ گئی۔ مگر رضیہ کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ بھاگ کر صحن سے باہر نکلی ہوئی۔ اب کار آگے جا چکی تھی۔ راج اور مشرت کا رخ بھی وہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ مسکرائے ہوئے مسخ دودھاری تلوار کی طرح اس کے سینے میں چل گئے۔

آہستہ آہستہ راج کی گاڑی شواہ کے دفتر کے سلسلے سے چکر لگا کے بڑے گیٹ کی طرف ٹری اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رضیہ نے رضیہ کا ہاتھ زور سے پکڑ رکھا تھا۔

رضیہ چلائی " اری کیا کرتی ہے۔ نہجتنی اناخس کا لڑنے میری کلائی میں "۔

گلاڑی اندھیری سے علی۔ سٹیشن کے گیٹ سے گزری بیکہ کی جانب مڑی۔ پہلے پارے گیا ساٹا کر دھگیا۔ کھا گیا۔ لیکن گلاڑی بھنڈی بازار جانے کے لئے باندھ کی طرف نہ مڑی۔ پالی ہسپتال کی جانب گھوم گئی۔ جہاں راج لٹکا کا بنگلہ تھا۔

رضیہ رضیہ کو کچھ پس لے گئی۔ لیکن کبھی کبھی اسان آنکھیں جوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا کان ہوتے ہوئے بھی نہیں سن سکتا۔ تصویریں رضیہ کی تپلیوں بے پھسل کر بچی چلی جا رہی تھیں۔ اس کے دماغ کی تہوں میں نہیں پہنچ رہی تھیں۔ اداکار گنگو کر رہے تھے۔ مگر ان کا ایک لفظ بھی رضیہ کے کان میں نہ پہنچا تھا۔ اس کے کانوں میں تو کوئی سمند کی طرح گرج رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ایک گلاڑی کو دیکھ رہی تھیں۔ جو دیر دیر چلتے چلتے ہوئے اس قدر اس کے قریب آ جاتی کہ اسے محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اس گلاڑی کے نیچے آ کے دب جائے گی۔

رضیہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"تصویر نہیں دیکھ گی ؟" رضیہ ہمدردی سے بولی۔

رضیہ نے کہا " میں ابھی باحمروم سے آئی "۔

لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ رضیہ جانتی تھی کہ وہ واپس نہیں آ سکے گی۔ تو بھی اس نے اسے بلانے یا کبھی ایسا لہو کا ہے کہ ہمدردی کا ہر لفظ ناکارہ اور بے کار ہوتا ہے رضیہ نے سوچا۔ جلد سے

راج لاا عشرت کو ساتھ لے کر باندھ سے ایوان فرزندیں گئی۔ ایمان سے وہ دونوں خنز
 میں گئے۔ خانز سے گاڑی تاج کے پیچھے ڈیاس اینڈ سنز کی پورچ میں جاٹکی۔ وہاں سے گاڑی ہو دیس
 ہوئی۔ تو گاڑی کی پہلی سیٹ پر تیار شدہ سوٹ۔ ٹائی لان کی روانہ بجا رہی۔ جبکہ کارڈز کی ٹائیاں پکڑ
 فیمن کی ہیٹ برادگ کے جوتے۔ کیری سولال اہ پر اس گاڑی پر سے تھے۔ گاڑی پھر وہاں سے ہٹو
 کی طرف ہوئی۔ اہ پالی ہیل پر چلی گئی۔

جب عشرت غسل خانے میں نہانے کے لئے گیا تو ابھینو نے اپنی بہن سے پوچھا۔
 "یہ کیا؟"

"شٹ اپ! راج لاا گرج کے بولی۔"

ابھینو نے جیڑا بدل کے فوراً فوجی یلوٹ جلتے ہوئے کہا: "اگل رائٹ لام!۔۔۔ گراہک خپل اس
 خاکسار کے لئے بھی نے آئی ہوئیں۔ رشتے میں بھائی ہوتا ہوں۔"
 "یوشٹ اپ! راج لاا پھر ملو کے بولی۔"

"بہت اچھا! دام! ابھینو نے کہا: "میں اپنے کمرے میں چلا ہوں۔ گراس وقت کی بھنگ کے لئے
 —۔۔۔ لٹکی کوٹ ہو رہی ہے۔" راج نے اُسے بڑے سے دس روپے نکال کے دئے۔ ابھینو
 نوٹ کو انگلیوں میں حقارت سے گھماتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک راج وہیں اپنے کمرے
 باہر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بڑی صاف شستری ہوئی رات تھی۔ آسمان تاروں سے خریں۔ زمین روشنیوں سے
 منور۔ راج برج کی ٹیڑھیوں سے اتر کر ٹھکانی ہوئی بجے کے باہر آگئی، جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی

آج وہ رات کے وقت مشنر کو اپنے شوہر ڈرائیور کو نہیں لے جا رہی تھی۔ اس وقت اس نے گولڈبروکیڈ کا فریک پہن رکھا تھا بالوں میں پھولوں کے بجائے سفید کوہرنگ کے جواہرات کی دینی لٹا رکھی تھی۔ اور وہ اس وقت گاڑی کے ٹیکہ مارے گی ہوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ اور عشرت کا انتظار کر رہی تھی جوا بھی اندر اپنے کمرے سے باہر نہ آیا تھا۔ اس وقت راج تلنے ان پہلی ہوئی حیران چلیوں کو طرے کے دیکھا۔ جربنگلے کے باہر گاڑی کے قریب گل ہر کے ایک پٹر کے نیچے سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

”غریب صورت ہے بے مددغ صورت ہے رعبیہ نے رعبت کے نیچے سے راج تلنے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل سے کہا۔ پھر کیا ایک وہ زور ہے ایک سانس اندر کھینچ کے رہ گئی۔ عشرت پورج سے گزرتا ہوا لمبے لمبے مردانہ ڈگ بھرتا ہوا بنگلے سے باہر آ رہا تھا۔ مگر یہ وہ عشرت نہ تھا۔ ایک سلی غیر استری شدہ پٹو اور ٹی شرٹ میں بیوس۔ اس وقت اس نے ڈرائیو سٹ پہن رکھا تھا۔ اور اس کی سفید قمیص پر سیاہی عجیب پیار سے رہی تھی۔ عشرت کی آنکھوں میں ایک مغرور چمک تھی۔ اور جب وہ راج کے سامنے آگے نکلا۔ تو اس کا مشکر اٹھا ہوا، اور کھلتا ہوا اور رنگ سرک کی جی کی روشنی میں جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ باطل بے اختیار ہو کر رعبیہ نے زور سے سانس اندر کھینچ لیا۔ جیسے کہیں بہت دھاس کے دل کی گہری ہتھول تک کوئی خنجر اُتر گیا ہو۔

راج نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن گل ہر کے درخت کے آس پاس اندر صبر تھا۔ اندر وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ شاید یہ بات کی سی کی تھی۔ یہ رات بھی شاید عشرت کے مشن سے مسرور ہو گئی تھی۔

”واؤ؟ راج تلنے نے بڑے پیار سے عشرت کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور پھر وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لئے مڑی۔ اور اس کی گھیرے دار گولڈبروکیڈ کی راک ہڈی داروں کی شکل میں گھوم گئی۔ تاج حلقے موسیقی۔ پہلو۔ ترنم۔ راج کے جسم کا ہر رعب اور ہر خم عشرت کے دل میں جا رہا تھا۔

منہاج میں چلیں گے ۛ راج بہت دیر کے آہستہ سے بولی۔ جیسے وہ نہیں کوئی بوسہ بول رہا ہو۔
رات اور رقص۔ سمندر اور ساحل۔

رضیہ اور گل ہر۔

مگر گل ہر کے پھول بہت دُور تھے۔ اور پشاور میں تاروں کی طرح اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے۔ اور اُن سے بہت دُور نچے گل ہر کے تنے سے لگی رضیہ سو سکیاں بے رہی تھی۔ مگر سخت کاٹنہ سخت ہوتا ہے۔ اس کی چھال بھی بڑی سخت اور کھرہی ہوتی ہے۔ اور اس میں کہیں خزی اھلچ، اوروہ درد کو بھنے کی قوت نہیں ہوتی۔ جو رگوں میں اہر کے دوڑنے سے آتی ہے۔ تنے کی رگوں میں تو پانی چلتا ہے۔ اور پانی اہر کا درد کیسے بھجھ سکتا ہے۔

کھولی میں بہت اندھیرا تھا۔ اماں جاگ رہی تھیں۔ بوڑھی اماں ہوئے ہوئے کانپتے ہوئے
 ہاتھوں سے بستر ٹٹول رہی تھیں۔ مگر بستر خالی تھا۔ اماں کو معلوم تھا۔ صرف چند فٹ پرے۔ رضیہ
 سو رہی تھی۔ سو نہیں رہی تھی۔ جاگ رہی تھی۔ اماں کو معلوم تھا۔ اس کی بچی بچے میں سردے رو رہی ہے
 گردہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رضیہ کے پاس چلی جائے۔ اس کے سر پر اپنا بھروسہ دلا
 ہاتھ پیرے۔ گردہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کتنے ہی سالوں سے اماں نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی
 اس کا خاندان مر گیا اور وہ کچھ نہیں کر سکی۔ اس کی بڑی بیٹی کا خاندان مر گیا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ اس کی بیٹی گئی
 اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ چھوٹے چھوٹے پانچ بچے رہ گئے اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ کیوں کر اسے کچھ کرنا سکھایا ہی نہ
 گیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ عورتیں یہاں بننے کے لئے بستر پر لیٹ جانے کے لئے اوب بچہ پیدا
 کر کے اُن کی پرورش کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اُن کے خاندان میں ہمیشہ ایسا ہوتا آیا تھا اور ان
 کے اس پاس کے خاندانوں میں ہزاروں سالوں سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ اور ایسا ہی ہوتا رہے
 گا۔ اس نے سبب بھی کوئی مصیبت اتنی تو عورت دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اُٹھا دینے کے سوا اور کیا کر سکتی
 ہے۔ اور اماں کی تو زندگی کا اب ہر ایک لمحہ محترم دُعا تھا۔ دونوں ہاتھ اُپر اُٹھے ہوئے کس باقاعدگی سے

وہ انداز کرتی تھیں کہس حضور و حضور سے ہر طرف دعا مانگتی تھیں: میری رضیہ تمکانے سے لگ جائے۔
یہ چھڑا سا کہنے کی طرح سنو رہا تھا۔ اے خدا! اے خدا! اے خدا!...

لیکن آج اندھیرا بہت تھا۔ اور اس اندھیرے میں رضیہ آہستہ آہستہ بہت ہی آہستہ جیسے اپنے سینے کا سارا سوز اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوئے سسک رہی تھی۔ اور ان کا دل اپنے لیستر پر لیٹے لیٹے حرکت سے بھر رہا تھا۔ مگر یہ دل محنت سے کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ غم کا سوتا رنگوں میں ٹھک کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ دھیمے دھیمے چلنے والا سانس ایک بارگی آگے غم کیوں نہیں ہو جاتا۔ کب تک اپنی کچی کی ہر نصیبت دیکھتی رہے گی۔ اے خدا!... تم اس قدر دور کیوں ہو۔ اتنے اللہ ہم سے کیوں ہو، آسمانوں میں رہنے والے آؤ نا۔ اس کھولی میں اُتر آؤ۔ اس کا اندھیرا دیکھو۔ اس کی غریب دیکھو۔ اس کی آہوں میں سانس لو۔ میرے رب۔ میرے مولا۔ میری کچی اس طرح سسک رہی ہے۔ اور تم سے کچھ نہیں بڑتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا اے خدا کیا؟

یہ ایک اماں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ توبہ۔ توبہ۔ میں کس کی شان میں یہ گستاخی کر رہا ہوں۔ میرے مولا۔ بے معاف کر دے۔ میرے گناہ بخش دے۔ یہ میں کیا بک رہی ہوں۔ چاہے ان مصیبتوں نے میری عقل مار دی ہے۔...

مگر رضیہ کو اس بحث سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ خدا اور گناہ۔ دُعا اور جزا کے سہاروں کا ایک کونے میں مٹھی سسکیوں اور ٹھکپوں کے درمیان رہتی جاتی تھی۔ آج چاروں طرف محنت اندھیرا تھا۔ اور کہیں روشنی نہ تھی۔ انسان کے دل میں ایک شہر ہوتا ہے۔ اس کی گلیاں اللہ بازار چلتے ہیں۔ جہاں یادوں اور ذراعتوں کا ایک جہم رہتا ہے۔ اس کی دکانوں میں ہزاروں طرح کی نشانیں بچی ہیں۔ خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ اس کے کارخانوں میں محنت سانس لیتی ہے۔ اور اس کے باغوں میں کبھی کبھی چاند چمکتا ہے۔ اور یہاں پہلے ہیں اور آہستہ آہستہ جڑے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے

عامر شہزادہ ہوں سے محبت کا پیام دیتے ہیں۔

دل کا شہر بھی انسان کے شہر کی طرح بستہ ہے۔ محنت کرتا ہے۔ کام کرتا ہے، بہت لہجہ اس کا ہے۔ کبھی کبھی ایسے دن آتے ہیں۔ جب ہر لمحہ عید ہوتا ہے۔ ہر یاد اک نیا جڑ بھین کر نکلتی ہے۔ ہر تہنہ، ہر سنوڑی، ہر تھیلیوں میں چٹائی نقش تصویریں بھلے۔ ہر آنگ نئے نئے چولہے کی طرح خوشی سے ہنستی ہوئی، گلکاریاں مارتی ہوئی ہر آندو جوان اور بچہ مستقبل کی خوشبو سے مکتی ہوئی دل کی گلیوں اور بازاروں میں نکل آتی ہے۔ اور خوشیوں کے میلے میں اور مسرتوں کے آروام میں گم ہو جاتی ہے۔

مگر آج اس شہر میں کیسا تپا ہے؛ آج دل کی پڑیچ گلیوں اور بازاروں اور سڑکوں پر اندھیرا ہے۔ آج کہیں پر روشنی نہیں ہے۔ آج کوئی مراد نہیں ملتی۔ کوئی آرزو نہیں بچی۔ کوئی آنگ نہیں ہنستی۔ آج سارے دھچکے بند ہیں، اور سارے دیوانے قفل ہیں، اور سارے بازار خالی ہیں مرن کہیں کہیں محو پر چند روٹی یا دیں گزے ہوئے آیام کا سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہے ہیں۔

آج ساا شہر خالی ہے۔ آج سڑکوں پر روشنی نہیں۔ باغوں میں چاند نہیں، پیڑوں میں پھول نہیں۔ آج وہ بچی بھی خالی ہے جہاں رخصت اور عسرت جٹھا کرتے تھے۔ یہ ایک رخصت کو ایسا محسوس ہوا جیسے آج کے بعد یہ بچی ہمیشہ خالی رہے گا۔

انسان کا دل بھی ایک عجیب شے ہے۔ وہ کسی یاد کو تو ایک خوشبو میں بدل دیتا ہے۔ جو زندگی بھر ہنستی رہتی ہے۔ کبھی ایک کھٹے میں جو زندگی بھر چھتا رہتا ہے۔ اور کبھی ایک تصویر میں جو زندگی بھر ایک ہی جو کھٹے میں جڑی، ایک ہی دیوار پر مچی ایک ہی زاویے سے دکھائی دیتی چلی جاتی ہے۔ یہ ایک رخصت کو محسوس ہوا جیسے آج کے بعد وہ اس باغ میں کبھی نہیں چلے گی۔ جہاں وہ عسرت کے ساتھ گھومنے جایا کرتی تھی۔ اس بچی پر نہیں مٹھ سکے گی۔ جہاں عسرت کے ہاتھ خود بخود اس کی کمر کے

گروا جایا کرتے تھے۔

نہیں وہ بچی آج کے بعد پیشہ خالی رہے گا۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوا۔ لیکن جب اس نے اس تصور کو جو کٹھن میں جڑ کے دہاں سامنے کی دیوار میں گویا لگا دیا۔ تو اُسے اطمینان ساموس ہوا۔ اس کی سب سکیاں اور ہچکیاں بند ہو گئیں۔ اس کی چپکلیں بھاری ہوتی گئیں۔ اور آخر وہ دم دم مدام سانسوں کے درمیان خند کے ٹھوڑے میں بہتی ہوئی کھو گئی۔ ہر چونکہ وہ رات بھر کی جاگ ہوئی تھی۔ اس نے صبح بہت دیر تک سوئی رہی۔

صبح ہو گئی۔ سورج نکل آیا۔ باناڑوں میں ٹرائیں اور بیس اور رو پلٹے لوگوں کا شور مڑ گیا۔ محرفیہ ٹپے آرام سے سوئی رہی۔ اس کی اماں نے بھی اُسے نہیں جگا یا۔ اس نے اپنی ٹی کے خماروں پر رات کے آنسوؤں کے خشک نشان دیکھے۔ اور اُسے سوئے رہنے دیا۔ اور غوی کا پتہ ہونے ہاتھوں سے گھر کا سارا کام کاج کرتی رہی۔ برتن صاف کر کے۔ گڑے میں پانی بھر کے ٹوں کو ہلکا کے کھانا پکاکے اماں جب فارغ ہوئیں تو انہوں نے دیکھا رفیع ابھی تک بے سدہ فرض پر سو رہی تھی۔ کھڑکی سے جب روشنی رفیع کے چہرے تک آنے لگی تو اماں نے آہستہ سے کھڑکی کے قریب جا کے اس کے ہٹ بند کر دیے۔ اور واپس آکر بچوں کے لئے کھانا نکالنے لگیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، اماں نے اُٹھ کے دروازہ کھولا اور حیرت سے اُن کی گتائی سی بندھ گئی۔ اور وہ کھٹی کھٹی نگاہوں سے دفتر کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔ یہ عشرت تھا۔ مگر شاید کوئی اور ہی عشرت تھا۔ اتنے چمے لباس پہنے ہوئے تھا۔ طرح وہ صاف ستمرا۔ خوشبوؤں میں لپٹا ہوا انفرکتا تھا کہ اماں تو دروازے میں کھڑکی کی کھڑی رہ گئیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عشرت نے مسکرا کے کہا "اماں مجھے اندر نہیں آئے دو گی۔"

اماں دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ لیکن اب بھی ایک لفظ اُن کے منہ سے نہیں نکل سکا۔ عشرت اندر آ گیا۔ اس نے ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر آگے بڑھ کر سوتی ہوئی بی

کی طرف دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر ٹھیک کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ رضیہ کا سینہ ذرا سا کھلا تھا۔ ہرگز بھی
فدا سے بچے تھے۔ آنکھیں بھی۔ گردہ خند میں مستغرق تھی۔ عشرت کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

عشرت نے کہا "رضیہ"

رضیہ سوئی رہی۔

پھر عشرت نے رضیہ کو ایک ٹھوکا دیا۔ رضیہ ہڑبڑا کے جاگی۔ اور اپنے سامنے عشرت کو اس قدر قریب
دیکھ کر حیران اور پریشان ہو چکی اور گھبرا سی گئی۔ اُسے اپنی آنکھوں پر قیس خاں آیا۔ اس نے دو ایک بار اپنی
آنکھیں مل کر عشرت کی طرف دیکھا۔ اُسے چھو ا جب جلے اُسے تعین آیا اور جب تعین آیا تو بے انتہاء
اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائیں۔

عشرت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس نے رضیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "بھئی۔ تو کیا
بگھٹی تھی میں نہیں تاؤں گا؟"

رضیہ نے اس کے نئے سوٹ کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ اس کے بچتے ہوئے جوتوں پر پڑی خوبصورت
طائی پڑا سائی رنگ کی دھاری دار تھیں پر اس کے سونے کے ٹینوں پر۔ وہ چُپ رہی۔ اس نے کوئی
جواب نہ دیا۔

عشرت نے رضیہ کی خاموشی کے کچھ اڑ کو محسوس کیا۔ بولا "تم نے نہیں پوچھا۔ تم رات کہاں ہے؟"
رضیہ بولی "پر چھنک ضرورت ہے کیا؟" یکایک اس کے پیچ میں تلخی سی آگئی۔

عشرت خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھا ہیں جھکا کر رضیہ کے دوپٹے کو اپنی آنکھوں پر لپیٹنے اور کھولنے لگا۔
رضیہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

عشرت آہستہ آہستہ بولا "بات یہ ہے رضیہ۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔"

میں جانتی ہوں۔ کوئی نئی بات بتاؤ۔

عشرت پر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک پھر اس کے دہن کے کنارے سے کینا سا پھر کھنگلا
 ”میں بے وفا نہیں ہوں“

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا! راضی ہوں۔“

عشرت نے کہا ”مان لو۔ راضی میں۔ بے وفا نہیں ہوں۔ یہ جو کہہ میں کر رہا ہوں۔ اپنی اور تمہاری
 بہتری کے لئے کر رہا ہوں۔ یہ صرف ایک طریقہ ہے اپنے دونوں کو لانے کے لئے تمہیں تو مسلم ہے یہ
 ظلم انڈسٹری کیسی ہے۔ یہاں جب تک کوئی کسی کی سفارش نہ کرے کام نہیں چلتا۔ تم خود ہی اپنے
 آپ کو دیکھ لو۔ راج کو دیکھو۔ شمشاد کو دیکھو۔ رنجنا کو دیکھو۔ اوشا کو دیکھو۔ کسی بھی میرو یا میروئن کو لے لو
 کسی نہ کسی کے کندھے پر سوار ہو کے آگے بڑھے گی۔“
 ”تم کس کا کندھا چاٹ رہے ہو؟“ راضی نے پوچھا۔

عشرت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بولا ”دنیا اسی طرح کی ہے۔ میرا مطلب ہے ایک زینے
 کی طرح۔ جب آدمی ایک زینہ چڑھتا ہے تو کھپلا زینہ چھوڑ دیتا ہے۔ میرے لئے راج ایک زینے سے
 زیادہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے ہیرو کا پانس دلوئے کا وعدہ کیا ہے۔ جوں ہی میں ہیرو بننا۔ اہ تم
 جانتی ہو۔ راج اس انڈسٹری کی مشہور ترین ہیروئنوں میں سے ہے۔ وہ مجھے پانس دلواسکتی ہے
 جوں ہی میں ہیرو بننا میں اسے چھوڑ دوں گا۔“
 ”ایک زینے کی طرح؟“ راضی نے پوچھا۔

عشرت نے راضی کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
 ”میں صرف تم سے پیار کرتا ہوں۔ صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے ہر لمحے دیکھ کا علم نہیں
 ہے۔ وہ دیکھ تو مجھے بھی ہے۔ تم سے جدائی۔ یہ عارضی جدائی ہی ہوگی۔ تم سے جدا ہو کر مجھے بحیثیت منہ
 ہوگی! مگر ڈانگ اپنے مستقبل کے لئے۔ اسی بچوں کے مستقبل کے لئے مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ میں جب ہیرو

ہی جاتیں گا تو ایک ساندرا جگہ خریدوں گا۔ دوسرے گاڑیاں ہوں گی۔ ایک میرے لئے۔ ایک تمہارے لئے۔ پھر میں اپنی اتنی اور اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی یہاں بلاؤں گا۔ پھر تمہارے لئے فلم میں کام کرنا ضروری نہ ہوگا۔ بلکہ میں تمہیں کام کرنے بھی نہ دوں گا۔ یہ ذلیل محنت !

”محنت کبھی ذلیل نہیں ہوتی۔ اگر عزت سے کی جائے“ رضیہ غصے میں آکے بولی ”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اگر چاہوں، تو یہ کھولی تبدیلی نہیں کر سکتی؟ ایک جگہ نہ سہی، ایک خلیط تو لے سکتی ہوں۔ نئی گاڑی نہ سی۔ سیکنڈ ہینڈ گاڑی تو خرید سکتی ہوں۔ کیا تم کہتے ہو۔ ہارنہی ریڈیو پر دام سلاچی کے کافی کے دیکھوں میں سلور بروکینڈ کے فرک دیکھ کر میری دلچسپی تو اڑ نہیں ہو جاتی؟ کیا تم کہتے ہو، میں صورت نہیں ہوں۔ میرا ہی خوب صورت ساڑیوں، خوش نما بلاؤں اور نئے نئے زراہوں کے پہننے کے لئے نہیں لایا؟ کیا میں نہیں چاہتی کہ میرا بھی اچھا گھر ہو۔ خوب صورت پردے ہوں۔ رات کی دم دم روشنی میں ریڈیو گرام ایک کونے میں بچتا ہو۔ میری بہن کے بچے اچھے خوب صورت کپڑے پہنے اس کے گرد جمع ہو کے تپوں کا پردہ گرم سنتے ہوں۔ کیا تم کہتے ہو میرے دل میں یہ تصویریں نہیں۔ سب ٹھیک ہیں میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ اُن تصویروں کو خریدنے میں مجھے جو کچھ بچا دیتے گا۔ اس سے یہی بہتر ہے کہیں اُن تصویروں کو بھاڑ ڈالوں۔ میں خالی دلوں میں رہوں گی۔ ایک اندھیری کھولی میں۔ غم والے گھر مجھے کام نہیں دیں گے تو میں کسی گھر میں جھاڑ دوں گی، برتن صاف کر دوں گی۔ کسی کے بچے کی کیا بن جائیں گی۔ پتھر رشک پر کوٹنے لگوں گی! کبھے؟ کل تک تمہارا بھی یہی خیال تھا۔ آج تم کیسے بدل گئے۔“

”غریب رضیہ! عشرت نے کہا: ”غریب بہت کچھ کراہتی ہے۔“

”میں نہیں مانگی کہ غریب میں آؤ اپنی عزت بھی کھو دیتا ہے۔ یہ ہمارے آس پڑوس کی سیکڑوں خاتون کا کام کرتی ہیں، پاول کوٹتی ہیں، بازار میں سبزی بچتی ہیں، کارخانوں میں کام کرنے جاتی ہیں۔ غریب ہی

پر بکائی کا لازم نہ لگاؤ۔ اپنی کمزوری دوسروں سے منسوب نہ کرو۔ میں ہر روز ان غریب عورتوں کو دیکھتی ہوں۔ اسی میں سے کئی ایک بے مدد حسین ہیں۔ تمہاری کئی سرورکینوں سے کبھی زیادہ نہیں ہیں۔ اُن کے پاس نہ ریڑیو گرام ہے، نہ کار ہے، نہ فلیٹ ہے، نہ سونے کے زیورات ہیں۔ مگر ان کا دل تو فحاشہ بننے کو نہیں چاہتا۔ میں کیوں انہیں بازار میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھتی کبھی کبھی اُن کے ہاں غلاتے بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کا بچہ دوا نہ ملنے سے مر بھی جاتا ہے۔ پھر وہ روتی ہیں۔ دودھ پیائے دوائے کرتی ہیں۔ پھر جی مضبوط کر کے کارخانے میں کام کرنے پہلی جاتی ہیں کیوں اُنہوں نے اپنے آپ کو نہیں بچا۔ جیسے تم نے آج اپنے آپ کو بچ دیا ہے۔ تمہارا خیال ہے۔ اس گیسٹروین کے سوٹ میں ریشمی مٹائی اور چھتے ہوئے جوتوں میں تم بہت حسین معلوم ہو رہے ہو، میں تمہیں بتاؤں تم طوائف معلوم ہوتے ہو۔ ایک مرد طوائف !!!

عشرت ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے کسی نے اُسے گولی ماری ہو۔ پھر کچھ ایک اس کا چہرہ صرخ ہو گیا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رضیہ سے منہ پھیر کے کہا "تم دیوانی ہو گئی ہو۔ تم دیوانی ہو گئی ہو۔"

پھر وہ آٹا کی طرح ٹرا۔ اور انہیں ایک سوکھا ٹوٹ دیتے ہوئے بولا "اُمّاں یہ تو سچی ہے۔ آپ تو بچے جانتی ہیں۔ میں — میں — یہ سوکھا ٹوٹ تو رکھئے۔ میں ہر ماہ کبھی نہ کبھی ادھر آیا کروں گا۔ پوچھ لیا کروں گا۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو آپ رضیہ سے نہیں مجھ سے کہہ دیا کیجئے۔ میں خود خیال رکھوں گا۔ میں ہر ماہ آپ کے لئے — میرا مطلب ہے — آپ کا خرچہ بیاں پہنچا دیا کروں گا۔"

رضیہ نے گرج کر آٹا کے باجھوں سے وہ سوکھا ٹوٹ چھین لیا۔ اور اس کے سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھے ہوئے بولی "یہ تم میری محبت کی قیمت چھلانے لگے ہو۔"

دفعہ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

عشرت نے کھسیانہ ہو کے کہا ”تم — تم —۔۔۔ کبھی نہیں ہو“

”جاؤ۔ چلے جاؤ۔ عشرت آج کے بعد کبھی اپنی صورت نہ دکھانا“

اور جب عشرت چلا گیا تو یکایک دفعہ کے دل کی ساری دیواریں ڈھسے گئیں۔ اور وہ منہ

پھر کے ایک کونے میں موڑ کے اپنے ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کے کہنے لگی ”نہ جاؤ عشرت، کہیں نہ جاؤ“

یہ کھوئی تمہاری ہے، میں تمہاری ہوں۔ میری ساری زندگی تمہاری ہے۔ آجاؤ عشرت۔ میری زندگی

کے جھتے بنا کے اپنے پاؤں میں پہن لو۔ مگر یہاں سے نہ جاؤ۔ اُس گندی قلیں بلا بد بو دار دنیا میں —

دفعہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

پہلے پندرہ روز راج لٹا باطل دیوانوں کی طرح رہی۔ یہ دن کچھ اس طرح کے تھے جیسے
 جذبات کی چڑھی ہوئی آندھی ہو، یا سون سون کی موسلا دھار بارش ہو، یا سمندر میں لہریں تھپڑے
 لیتی ہوں۔ اور اپنی اچھال میں کشی کو کبھی بہت اور کبھی بہت نیچے ڈولاتی ہوئی لے جائیں۔ اُن
 پہلے پندرہ دنوں میں راج لٹا۔ کیوں۔ کب۔ کہاں اور کیسے کے تمام سوالوں کو جو ہر فرد کی زندگی
 میں آتے ہیں۔ باطل بھول چکی تھی وہ ایک لمحے کے لئے بھی عشرت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں
 ہونے دیتی تھی۔ ان پندرہ دنوں میں وہ اپنے بنگلے سے باہر نہیں نکلی۔ اور اگر کہا جائے کہ اپنے کمرے
 سے باہر نہیں نکلی تو زیادہ صحیح ہوگا۔ کبھی کبھی قریب کی چائے ناشتہ، دوپہر کا کھانا شام کی چائے اور
 رات کا کھانا ہی وہیں منگاتی تھی۔ کبھی کبھی خود سٹور جلا کے عشرت کے لئے مرغ بھونتی تھی راج لٹا
 بہت اچھا کھانا بنا سکتی تھی۔ کیوں کہ جس گھر سے وہ آئی تھی۔ وہاں اُسے خود کھانا تیار کرنا پڑتا تھا۔ برسرِ رُسن تو
 وہ بد میں ہوئی۔ پہلے تو وہ مشک کی بیوی تھی شکر جواب اس کے گرج میں رہتا تھا۔ مگر اب راج
 کو جیسے کسی کی پردہ دہ تھی اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں کہ اس سے پہلے سناٹے
 نہ ہوئے ہوں۔ راج کو تو اب اُن کی تعداد بھی یاد نہ تھی۔ مگر یہ چیز الگ تھی۔ یہ جذبہ ہی کچھ اور تھا۔

ہیں۔ شے اہل ہے۔ راج نے سوچا۔ عشرت کے بغیر قورہ زندہ کیسے رہ سکے گی۔ سنوڈیو شوٹنگ کرنے کیسے جلائے گی۔ شروع کے پندرہ دنوں میں اس نے ایسا ہی کیا۔ نہ موت یہ کہ وہ کب سے باہر نہیں نکلی بلکہ شوٹنگ پر کبھی نہیں گئی۔ بہت سے پروڈیوسر آئے اور اس چلے گئے۔ کسی کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ان دنوں میں وہ عشرت کے سوا کسی کی صورت بھی دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ ایسی مرثی تھی اس پر۔

گھر میں سب لوگ پریشان تھے۔ یوں تو راج کی بے راہ روی سے سب اکاڑ تھے۔ بلکہ ایک طرح سے اس بے راہ روی کی ترضیب دینے والے بھی رہی تھے۔ راج کے ماں باپ بہت غریب تھے، راج بہت حسین تھی۔ یشتکران دنوں دولت مند تھا۔ کیا ہوا اگر وہ ادھیڑ عمر سے اوپر کا تھا۔ انہوں نے پانچ ہزار روپے لے کر راج کو شکر سے بیاہ دیا۔ لیکن جب شکر غریب ہو گیا اور منافع والے سماج میں یہ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کون امیر کب غریب ہو جائے گا اور کون غریب کب امیر ہو جائے گا۔ زندگی کی دوڑ ایک مسلسل غیر یقینی دوڑ ہوتی ہے۔ راج اپنے تجربے خاوند سے جھگڑ کے اپنے ماں باپ کے پاس چلی آئی۔ اس کے بھائی ایمیونو کو بچپن ہی سے بُری مادتی پڑ بچکی تھیں۔ وہ راج کو گھیر گھا کے پھسلا کے سبز باغ دکھانے لگی۔ آیا۔ راج کی شوخیاں۔ اس کی شریر آرائیں۔ اس کا بے مثل حسن۔ پروڈیوسروں کو بہت پسند آیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی۔ اہل درجے کی سیوٹس بن گئی۔ اب کوئی دشواری نہ تھی۔ راج نے اپنے شوہر شکر کو اپنے پاس بلا دیا۔ غلام چاہے بڑا عہد ہی ہو دعوے کی ایک عمدہ ٹیٹی ہوتا ہے۔ اور پھر چار ماہ شور تھے۔ ان کی بیوی گھنیشی تھی۔ یہی ڈولاری تھیں۔ ان کی بیٹی رام بیاری تھی۔ رام بیاری کا شوہر ارجیت سنگھ تھا۔ یہ سب لوگ راج کے محکموں پر پل رہے تھے۔ اور اس طرح پلنے کے سوا۔ اور کسی دوسرے طریقے سے پلنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ کام کرنا تو ایک غیر شریفانہ فعل ہے جسے آدمی اس سماج میں انتہائی بھوری کے تحت سراہا نہ دیتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص گھر میں ایک چھوٹا سا فرعون تھا۔ ہر شخص خودی کا ایک بوعل

پشتارہ باندے اپنے محفوظ پنے کو چھپانے کی کوشش میں غلطیاں تھا۔ ہر شخص کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی طرح سے راج کا منظور نظر بن جائے۔ اس چھوٹے سے نظامِ شمس کا مرکز راج تھی، اور یہ سب سیاست اس کے گرد گھومنا کرتے تھے۔ اس لئے یہاں عزتِ نفس کا سوال نہ تھا۔ تو کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ سوال تھا کہ کہیں اگر یہ معاملہ بڑھ گیا تو ہر کیا ہو گا۔ اگر کہیں عشرت اور راج نے شادی کی تو ہمارا کیا بنے گا۔ گو سوال پر اس طریقے سے کہی؟ نہ ہوئی تھی۔ یہ سوال قبول میں اندر ہی اندر رہتا تھا مگر تھا بھی۔ بنیادی مرکزی سوال "بیرا ملوہ" ملاوہ کیسے سلامت رہے؟ اگر راج ان چندہ وطن میں کسی طرح سے اُنہیں اس بات کا یقین دلادیتی تو وہ کاہے کو اتنے پریشان ہوتے۔ مگر راج کو اتنا سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔

ایک پرانی سپورٹس کار پورس میں آکے ٹکی۔ اور مرزا راحت حسین فلم جوڑ توڑ کے کھانا کھاتے اُس میں سے اُتر کے برآمدے کے جانب بڑھتے ہوئے دکھائی دئے۔ ابھینو نے بھاگ کے انہیں لائے ہی میں لینا چاہا۔ مگر جب تک وہ اندر ڈھانگ دم میں چلے آئے تھے۔ مرزا راحت حسین بڑے عجیبے اور شوخ مزاج ڈائریکٹر تھے۔ منہ میں ہر وقت ہنس رکھتے تھے اور پک گھولتے رہتے تھے۔ اس لئے جب کبھی گفتگو کرتے تھے۔ تو دورانِ گفتگو میں ہمیشہ جیلے چھوڑتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہیں پانی کی کسی ٹپلی سے سٹلے ہوئے رہے ہیں۔

برے "آج افواہ ہے؟" (راج کہاں ہے؟)

ابھینو نے۔ دست بستہ عرض کی "حضور کیا بتاؤں۔ یہیں کو ایک سوئین بھاڑ ہے"

"میں اُنٹے اچھو شیتاؤں؟" (میں اسے دیکھ سکتا ہوں)

یہ کہ مرزا آگے بڑھے۔ بیڈروم آئی کا۔ دیکھا بھالا ہوا تھا، مگر ابھینو نے آگے بڑھ کے راستہ ٹوک لیا۔ جیسی سماجت سے بولا "اس وقت سو رہی ہیں۔ ابھی ابھی آٹھ گئی ہے۔ ٹاکسٹ لکھ لیا۔"

حالات سے متنبہ بھی کیا ہے۔ ”مزنا بہت چکرائے۔ بڑے۔ آج اُنش کی شو شنگ ہے۔ شٹ اکا ہوا ہے۔“ (سیٹ لگا ہوا ہے)

ابھینو میرے پرانی محبوبی کا اظہار کرتے ہوئے بولا: ”کیا کیا جائے مزنا جی آج تو شو شنگ کینسل کرنا پڑے گی۔“

مزنا جی نے گہرا کراہ اور اُدھر دیکھا۔ کہیں مکالمہ نہ آیا اور پیک اپ سٹن کے اندر بابا بھر چکی تھی۔ مغرب تھا کہ وہ پیک اپ کو کہیں بھی پھینک دیتے۔ ابھینو نے اُگال دین فوراً سناٹے لاکے رکھ دیا۔ مزنا جی پیک اپ کو کھوکھے رومال سے منہ کو پیک سے اور ہاتھ کو پسینے سے صاف کرتے ہوئے بلے ایک ہزار کا نقصان ہو جانے کا میسٹر ابھینو تم تو جانتے ہو۔ احمد بھائی بوجرا میرا پیدو ڈیوسر کس قدر کبڑس ہے۔ اس کا تو بارش فیل ہو جانے کا۔ بڑے جوڑ توڑ سے میں نے ظم جوڑ توڑ کی ہارٹ کیری ماسل کی تھی۔ وہ سب چوہٹ ہو رہی ہے۔ ابھینو بھائی کسی طریقے سے راج کو سیٹ پر لے آؤ۔“

”یہ تو ناممکن ہے۔“

”دبکی کی ایک بوتل دوں گا۔“

”میں تو آدمی بوکل میں ہی راضی ہو جاتا۔“ ابھینو بولا۔ ”مگر وہ اس بیماری میں کیسے آسکتی ہے۔“

مزنا جی نے دوسرا پان تھو بھٹکا اور پٹنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ابھینو نے مسکرا کے کہا۔ ”مزنا جی آگ کوئی ہزل نہیں سنا لیجئے گا؟“

مزنا جی گندی اور عسراں غریب کہنے میں یہ طوٹے رکھتے تھے۔ اس بات میں ان کا کوئی

ثانی نہ تھا۔ کتنی ہی شکل سے مشکل زمین نکال کے لایئے وہ اس میں عریاں غزل کہہ دین گئے۔ کئی غلی پر اسٹریٹ پارٹی ان کی شمولیت کے بغیر مشکل نہ ہوتی تھی۔ شوخ مزاج لوگ جو جنسیات کے سہارے جاتے تھے وہ اساک کی گولیاں، طلا، عریاں پوسٹ کارٹا اور کوک شاستر کے علاوہ ایک نو

مرزا جی کے تبرکات بھی اُن کی بیاض سے نقل کر کے اپنے پاس رکھتے تھے۔

مرزا جی مسکراتے ہوئے بولے: ”پھر سناؤں گا۔ یہ سوتھ نہیں ہے۔ امر بھائی! یہ وہ میرا استاد کر رہا ہے گا؟“
مرزا جی نے اپنی کُملی آستینوں پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ اپنے شقائق پانچکے پر سے ایک خیالی کُمی اُڑائی
اور بڑی اداسے جھومتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ابھینوں نے سامن دیا۔ اتنے میں
ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجی۔ ابھینوں نے بھاگ کے ٹیلیفون کا رسپونڈ اٹھایا۔

”مراج لڑا ہے؟“

”آپ کوں بول رہے ہیں؟“

”میں سیٹھ جھیدی لال ہوں؟“

”نئے سیٹھ جی۔ نئے۔ کہئے؟“

”نئے تم رہنے دو۔ یہ بتاؤ۔ اب علاج لڑا کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بہتر ہو رہا ہے۔“

”تو ابھی کیوں نہیں ہوئیں۔ پانچ دن سے میرا سیٹ لگا پڑا ہے۔ بھیدی جھکے کا کیا بات ہے۔“

”میں اپنا ڈاکٹر بیچ دوں؟“

”نہیں سیٹھ جی۔ آپ کیوں تکلیف کریں گے۔ ڈاکٹر تو یہاں موجود ہے۔ اس کا علاج بھی ہو رہا ہے۔“

”مجیب صیبت ہے۔ راج لڑا کا اس سیٹ میں کام ہے۔ اور پانچ دن سے سیٹ لگا ہوا ہے۔ کل

تک انتظار کروں؟“

”کیا بتاؤں سیٹھ جی۔ اچھا ہونے کو تو وہ کل بھی ابھی ہو گئی تھی۔ اور نہ ہوں تو ایک ایک ٹیک نہ ہوں؟“

”ڈیم؟ سیٹھ جھیدی لال نے ٹیلیفون بند کر دیا۔“

ابھینوں نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا: ”یہ آج تیسرا ٹیلیفون ہے چچا“ اور ان کی

کئی کے جانے کے بعد ابھینو نے کمرے کے دروازے کی جانب ٹلا۔ وہاں باکر اس نے دوبارہنگی سی دستک دی۔ اندر سے ملج ہوئی "کوئی ہے؟"

ابھینو نے کہا: "میں ہوں۔ وہ مرزا جی آئے تھے۔"

"سیٹر جمیدی مال کا بھی ٹیلیفون آیا تھا؟"

"سب کو مدد کر۔"

"کر دیا؟ ابھینو خدا نکر ہے بولا۔"

تھوڑی دیر غاموش رہی اور ابھینو نے کہا: "بہن ٹوٹ گئی ہے۔ میں نہ پہنچا ہوں۔"

"بھروسہ مت کرو۔" ملج اندر سے چلتی۔

ابھینو غاموشی سے ٹھکراتا ہوا دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دروازے کے نیچے سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر ابھینو نے نوٹ اٹھائے۔ اور اپنے کمرے کی طرف چلے ہی دلا تھا کہ پچھلے میں ایک گاڑی کے ٹھکنے کی آواز آئی، اور میٹرو تیزی سے اپنی اپنی ایڑی کے جوتوں سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئی اندر آ گئیں۔ ابھینو نے لپک کے انہیں ماننے کہا میں جاویا۔

ابھینو نے کہا: "اے آپ بھی خوب دقت پر آئیں۔ ایک نئی غزل لکھی ہے۔"

"غزل سننے کا یہ وقت نہیں ہے۔" میٹرو قرائش۔

"تو پہلے ایک دو بازی فلاشس کی ہو جائے۔"

"پتروں کی تو صورت بھی میں اس وقت دیکھنا نہیں چاہتی۔ مجھے تم کسی طرح سے راج کی صورت دکھا دو۔"

"بس یہی نامکن ہے۔"

"اے یہ کیسے نامکن ہے۔ کل میرا سیٹ ہے، اور وہ اس میں کام کر رہی ہے۔"

”تو کیا بیاری بیاری ہیں؟“

”کیا بیاری ہے اُسے؟“ میڈم نے ٹوٹ کے پوچھا۔

”ابھینو نے سکر کے ابو مراد کو دیکھا۔ جیسے کوئی راز کی بات کہنے والا ہو۔ میڈم اس کے قریب آئی۔ ابھینو خاموش کھڑا رہ گیا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ میڈم نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اپنے قریب لے آیا۔ اُسے دس ایک ٹوٹ نکالا۔ ہنسی ”اب بناؤ۔ راج کو کیا بیاری ہے؟“

”عشرت؟“

میڈم نے کہا ”آہ! مجھے ششاد نے بتایا تھا لیکن میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ اُسے قتل درجے کی ہیروئن ہے۔ ایک ایجنٹر انوائس ہے۔ کیا انڈسٹری کے ساتھ سے بیروں گئے تھے۔ آدمی بڑا کام کرے تو کم از کم سلیپ سے تو کرے؟“

”جی ہاں! ابھینو نے سر مل کے کہا ”یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ اعتراض بڑے کام پر نہیں ہے۔ سلیپ پر ہے۔ اور سلیف بڑی چیز ہے۔ میڈم ایک نظم میں نے لکھی ہے۔ سلیف؟“

”نہاں بہائی۔ اس وقت نظم جو سے نہیں سننی جاسکتی۔ تم کسی طرح سے علاج لاکو کل میرے سیٹ پر لے آؤ۔“

”یہ نامکن ہے“ ابھینو نے آہ بھر کے کہا۔

میڈم نے سوکا ٹوٹ جیب سے نکال کے اُسے دیا۔

”اب ممکن ہے؟“

”ابھینو کی پچیس کھل گئیں۔ اس نے سوکا ٹوٹ جلدی سے جیب میں رکھ کے کہا ”دیکھئے کوشش نہ کرنا ہوا۔ دیکھئے کوشش نہ کرنا ہوا۔“

”جے سلوم ہے تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میڈم نے اس کی پیچھے تھپانے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اندازیں اُس کی طرف دیکھا کہ بھینو اپنی ساری پالا کی کے باوجود ساری سچی اپنی بھول گیا۔ میڈم جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے معلوم تھا۔ اُس کی آنکھیں کس حد تک کس کی طرف بے خطر ہو کر کب تک دیکھ سکتی ہیں۔ اب وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں رات کو پھر ٹیلی فون کروں گی۔“

میڈم کے چلے جانے کے بعد بھینو پھر راج کے کمرے کے دروازے پر جا کے دستک دینے لگا۔ اندر سے راج پھر چلائی۔

”کون ہے؟“

”میڈم کئی تھیں۔“

”بیکال دیا ہوتا۔“

”کمال دیا۔“

”کیا کہتی تھی۔“

”کل شوٹنگ ہے۔“

”منت سچو۔“

”مزدور سچو۔“ بھینو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے میں پہلے لے گئی تھی جو تم نے دے تھے کہنا میں اتفاق سے پرس بھول گئی گاڑی میں پڑول ڈالوا تھا۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہ خانے کے نیچے سے کسی نے دس دس کے نوٹ بھر سکا دئے۔ بھینو نے میں دے اپنی جیب میں دیکھ کر اپنی بھری ہوئی جیب کو اطمینان سے تھپتپایا۔ پھر اُس نے چکی گینٹی کے پاس جا کے اُسے میں کے نوٹ دیئے اور بولا۔

”یہ تو اور کھر کا خرچ پلاؤ !“

”اور میرے لئے“ چھانے بیتاب ہو کے پوچھا۔ وہ دور دراز سے اپنی زنجی کے پاں نہیں گیا تھا۔
”صبر کرو۔ یہ نصیحت ٹل جانے دو !“ ابھینونے بڑی سرد مہری سے کہا۔

اور پھر وہاں سے اٹھ کر موسیٰ دلاوی کی بیٹی رام پیاری کے شوہر اجیت سنگھ کے پاس گیا۔ اور کہا
”سے سرگوشی میں کہنے لگا۔ آج تو سکی کا بندوبست کرو دو لڑکیاں بھی بلاؤ۔ جو ہو پیس گے !“
فرط مسرت سے اجیت سنگھ نے اُسے گلے سے لگا لیا۔

دن گذرتے چلے گئے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر گیا۔ ایک مہینہ
گزر گیا۔

اندکے میں عشرت نے ایک جہاں لے کر کہا ”ڈارنگ۔ اب تو اس کرے میں دم کھٹنے لگا؟“

”گھر کی کھول دوں؟“ راج نے بڑے پیار سے اُس سے پوچھا۔

عشرت بولا ”سر میں شدید درد ہے !“

راج بولی ”سر دہانوں پاسے؟“

عشرت نے کہا ”نہیں پیاری۔ یہ بات ہے کہ اب باہر گھومنے کو کہا جاتا ہے۔“

”آہن گئے؟“

عشرت نے کہا ”تم تو میری جان ہو۔ مگر تازی ہوا، کھلا آسمان کیا نیاں ہے۔ میں اس کرے میں

اے ہوئے کتنے دن ہوئے ہوں گے ۛ

س ایک لمحہ ۛ راج نے اس کے رخسار سے اپنے رخسار لگاتے ہوئے کہا۔

عشرت اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا "باہر جائیں گے ۛ

راج اس کی طرہ شکایت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

عشرت نے کہا "آج میں بہت اُاس ہوں۔ آتی یا آ رہی ہیں اور میرے چھوٹے بھائی بہن ۛ

بچے روپے کہو نہیں بچکے ہوں ۛ

وہ قویں جانتا ہوں۔ ڈار لنگ۔ مگر یہ بھی تو سوچو۔ مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہئے۔ میں خود کسکے تھیں کھلاؤ۔

چاہتا ہوں۔ اپنی راج کو... ۛ

راج بولی ۛ میں تمیں اک دم ہیرو کا چانس دلوں گی ۛ

"یہ چانس جب تک ہم اس کمرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ کیسے ہاتھ آئے گا ۛ

راج لا جواب ہو گئی۔ کچھ سوچ کے بولی ۛ اچھا— میں کل ہی تمہارے لئے ایک شاندار پارٹی کا

بندوبست کرتی ہوں۔ انڈسٹری کے تمام بڑے بڑے ہدایت کاروں اور پروڈیوسروں اور دوسرے

لوگوں کو بلاتی ہوں۔ سب کا تم سے تعارف کراؤں گی۔ وہاں باتوں ہی باتوں میں تم دیکھ لینا تمہیں کسی نہ

کسی کچر کا چانس دلوں گی۔ یہ کیا خصل ہے ۛ

"تو اٹھو رو رو کھو لو ۛ

"اے جوں، جی نہیں چاہتا" راج اک اوسے بولی۔

"اٹھو ناں! عشرت نے اس کی چٹو چٹپٹپٹے ہوئے کہا۔

ان نے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہاں کھڑا عشرت کو کھڑا ہوا باہر نکلا۔ ایک ماہ کی تیبہ باشت سے

وہاں باہر آیا تھا۔ دینا اسے نئی نئی سلیم ہو رہی تھی۔

راج باہر آگئی۔ اچھوٹے دھڑکے چلائے کہا۔

”راج باہر آگئی!“ پچھلے بھاگ کے گنیشی سے کہا۔

گنیشی طعنی ہوئی۔ سوسا دھڑی کے ہاں پہنچی۔ ”راج باہر آگئی!“

سوسا دھڑی بھاگتی ہوئی اپنی بیٹی کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں اس کا مادا داس کی بیٹی کو بیٹھا

تھا۔ راج کے باہر آنے کی خبر سن کر اس نے لمبے خوشی کے اپنی بیٹی کو دیکھ کر کہنے سے گھایا۔

سب دھڑتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف چلے۔

راج ٹیلیفون کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں یہ خبر ٹیلیفون پر ٹھوڑے سے ٹھوڑا اور ایک ظم کے ذریعے دوسرے ظم کے ذریعے پھر

گھونٹ گئی۔ ”راج باہر آگئی!“

”راج باہر آگئی!“

”راج باہر آگئی!“

”راج باہر آگئی!“

ظم کے ذریعوں سے یہ خبر ظم کی رسالوں اور پچھلے بھاگتی۔ ظم آگاہی والی کے ایڈیٹر نے خوشی سے

کہے اسٹنٹ، میکس اور چرچی سے۔ ایک ہی شخص تھا۔ اور چونہ خود ہی تھا۔ چلا کے کہا۔

”راج باہر آگئی!“

یہ سوشیا پارک کرنے کی خبر اچھی سنائی۔ فیروز خان۔ جیسی راج کے باہر آجائے کی خبر تھی۔ دوسرے

ظم راج کی تصویر تمام ظم کی ریفوں اور رسالوں میں پہلے سے پہلے ہی اچھوٹے پر ڈھکے ہوئے سچے ماحول

”لال۔ لال سے پہلے پاس بڑی تھی۔ اب تو کسی حالت میں شہرہ دار سے کم نہ لگے گی!“

راج کبھی بچے کی بیویوں اور دوستوں کی شاخوں میں دکھانگ بلی برتنے آگے بھڑکیں
 رہے تھے ساج کے آج کی رات پانی کی خوشی میں اپنے غمناک کے تمام غم فریادیں سامنے لے کر
 نام پیری کے شوہر بیت شوگر کو گرا گرا کر آئے تھے اور تار تار سے تکیا لیا تھا۔ اور اب پورا
 محو غم کی تھوڑی سی سرور بہتوں کی ذہنیوں سے گزرا تھا۔

ساج کا شوہر شوگر جی گنتی اور غمناک کے دوسرے افراد ایک عیب جیتے کے عجیب
 لگتے ہاتھ لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے شوگر کے چہرے پر کوئی سول نہ تھا اور کوئی جواب نہ تھا کہ
 جواب ملے جواب پاتے تھے وہ اس کی انھیں اب ایسے تھوڑے تھوڑے ہیں۔ جس کے آگے کوئی
 رت نہیں تھا۔

اس کی بچے تھے۔ اور پانی اب شباب پر آئی تھی۔

پیر پر ساج کے ایک لون بیٹھیں پر دیکھ کے وہ گلاس کے لیے دت سیراک ڈانٹر کے روایت ہوئی
 میں آج ڈالے کہ رہا تھا۔ یہ سالے پتائی اور لٹے اور گرائے ہوئے پانی کی لڑائی اور پتائی
 ہاتھ ہیں۔ سنو، سنو، سنو سے شہر وں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کچھ بہت جلد یہ یہ لوگ لہر

یہ پارٹی ہمارے نکلنے میں ہوتی، ہمارے جگال میں ہوتی، تم سمجھتی ہو۔۔۔“
 ”جی فرمائیے؟ ولایت بیگم نے کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ مگر یہ سمجھنے کی بات ہے۔ چنے ہم بھی ہیں۔ چنے یہ لوگ بھی ہیں۔ مگر اپنے چنے میں فرق ہے۔ ہمارے کلچر میں جو ایک خاص طرح کی تہذیب۔ ایک خاص طرح کا کردار رکھاؤ۔ ایک خاص طرح کا گزراؤ۔ ایک خاص طرح کی ثقافت۔۔۔۔۔ ایس! ایس! کیا کہہ رہا تھا؟“ بھین دت نے ولایت بیگم سے پوچھا۔
 ”ثقافت! ولایت بیگم نے جوابی لے کے ڈھرا دیا۔

بھین دت کی آنکھیں خواہ مخواہ ہو گئیں۔ بولا: ”میں دنیا کا سب سے بڑا موسیقار ہو سکتا تھا۔ مریضی محبت نے مجھے تباہ کر دیا!“

”آپ کو کسی سے محبت ہے؟ ولایت نے پوچھا۔

بھین دت نے ولایت کی کمر کو زور سے چڑایا غصے میں بولا ”محبت کے بغیر موسیقی ناممکن رہتی ہے محبت زندگی کا خمر ہے، ہا کوئی شگور نے کہا ہے ولایت جس لڑکی سے میں محبت کرتا ہوں۔ اس کی آنکھیں اگر تھم جھوڑو۔۔۔ کوئی لہر بات کر دے۔ بھین دت نے ایسی سے سر ہلا کے کہا۔
 ”وہ کی دودھ ولایت لے گیا۔

”ایس! ایس! ایس! میرے ہاتھ سے پیرا بھین دت ولایت کو روکی پلانے لگا۔

ایک گھونٹ پی کر بھین دت نے کہا ”میں بے حد ناخوش ہوں، ادبھی ہوں، مصیبت میں ہوں۔ ولایت تم کسی طرح سے میری مدد کرو، میں اس لڑکی کو بھولنا چاہتا ہوں!“

ولایت شکوکے بھلی ”میں بھی کسی کو بھولنا چاہتی ہوں!“

”آہ! بھین دت نے ولایت کی کمر کو زور سے کس کر کہا ”میں بھی ناخوش، تم بھی ناخوش تو چلو ہم دونوں جو ہو چکیں۔ میں تمہارے کندھے پر سر رکھ کر دوڑوں گا۔ تم میرے کندھے پر سر رکھ کر

رونا۔ فائن :

بجن دت دسکی پنے نکا۔ اتنے میں ایک عظیم فن کار قسم کا ہیرو میں کا نام بھند کمار تھ۔ منہ بسورے رکھتا تھا۔ بجن دت سے آگے پڑھنے نکا : ” بجن دت آرٹ کے کہتے ہیں ! بجن سے بڑی خطرناک جگہ ہے : ” بجن دت نے بھند کمار کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ مشہور ہیروئی رنچا کو دیکھ کے کہا ” آرٹ آرٹ ایک سانپ ہے : ”
” سانپ ! ” رنچا زور سے چلی۔

برآمدے میں بہت سی کھڑی ہوئی لوکیاں چلائیں ” سانپ ! سانپ ! ” بہت سے لوگ ادھر ادھر بھاگے۔ اک بھگدڑی مچ گئی۔ شراب کے بہت سے جام ٹوٹ گئے۔ بہت سی لوکیاں ڈب کے مارے مردوں کے سینے سے لگ گئیں۔ سانپ نے واقعی پارٹی میں جان ڈال دی تھی بڑی مشکل سے بھند کمار نے سٹائے کو ٹنڈا کیا۔ اس نے کہا ” ابھی یہاں تو آرٹ کے بارے میں گفتگو ہورہی تھی : ”

” آرٹ ؟ ٹنڈا اوچک کے ہوئی : ” سب سے اچھا آرٹ سنگ چھینال سنگھی کی دوکان میں ملتا ہے، جواب نہیں ہے وہاں کے آرٹ کا : ”

بھند کمار نے موڑ کر اکرم سے باتیں کرنے لگا ” آپ آج کل کون سی تصویریں ڈھایت کاری میں مصروف ہیں : ”

” فی الحال تو کوئی نہیں : ”

” تو پھر کسی تصویر کی کہانی گیت مکالمے : ”

” اٹھنا تک تو خالی ہوں : ”

” اوہ : ” بھند کمار نے چونک کر کہا۔ پھر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش نشی

آکے کہنے لگا۔

”آپ شمع کے ستمے مل کرتے ہیں؟“

”نہیں؟“

”آپ کے پاس موٹر ہے؟“

”نہیں؟“

”آپ کو شارک سکن کا سوٹ پسند ہے؟“

”ہاں۔ مگر۔۔۔۔۔“

مگر بعد کار پر چپتا جا رہا تھا۔

”آپ سینلے کے باہر اپنا نام دیکھنا پسند کرتے ہیں؟“

”ہاں۔ مگر۔۔۔۔۔“

”آپ ایک گھر چاہتے ہیں، ایک خوب صورت باغ، مگر میں پیاری بیوی۔ بیوی کے پیاسے سے بچتے؟“

”ہاں۔ مگر۔ دیکھئے؟“ اکرم کچھ کہنا چاہتا تھا۔

بھدرے کمار نے کہا: ”میں کیا دیکھوں۔ آپ دیکھئے۔ مگر اکرم آپ دیکھئے۔ اگر آپ اس سلاخ میں کاہیے۔“

ہونا چاہتے ہیں تو آپ اپنے آپ کو بیچ ڈالئے۔ بھگل طہر پر بیچ ڈالئے۔ اپنے لئے کچھ نہ رکئے۔ کہیں پھر

کا کوئی حقوہ۔ روح کا کوئی ذوق۔ خیال کا کوئی حقہ باقی نہ رہنے پائے؟“

اکرم نے کہا: ”میں نے خورشی کی تاریخ پڑھی ہے بیچ ڈالنے والوں کا انجام بھی جانتا ہوں؟“

”دلوں کے جسے انجام سے ڈر کر آپ اتنی لمبی چوڑی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں؟“

اکرم نے کہا: ”میں کچھ چیزوں اور رشتوں کو بدلنا چاہتا ہوں؟“

بھدرے کمار نے کہا: ”بحری عادت ہے؟“

بھندکار اکرم کو جوہر ذکر ریخت کی طرف چلا گیا۔ جس سے بے کار میں پٹنے کی کوشش ایک
 موصے جوشی بھی کر رہے تھے۔ بھندکار کے سامنے کس ڈائریکٹر کی پہل نکلی تھی۔ بھندکار کھلنے دھکے
 جوشی لگ چکا۔ بھندکار نے اسی طرف منکر کے کہا: ”سوسا“
 ”جی سرکار“ جوشی مسرت سے چلایا۔ اور راج ڈاکٹر دھوڑنے لگا۔

راج ڈاکٹر کا تعارف سیٹھ باجوا سے کر رہی تھی۔ شروع شروع میں سالامان دیتا تھا۔ لوگوں
 کو معلوم نہ تھا کہ یہ پارٹی کس تقریب میں ہی جارہی ہے۔ لیکن جب راج نے مختلف پروڈیوسروں
 کی ٹولہوں میں جا ہا کے اپنے محبوب کا تعارف کرنا انہوں سے رول ہاتھ شروع کیا۔ باتوں کی
 باتوں میں شہس کر کبھی اس سے کبھی شوخ اترا ہٹ سے۔ کبھی اک عجیب پابندیت سے جم پابندیت
 کے باوجود نہایت غلیظ معلوم ہوتی تھی۔ تو سب پرے راز ٹھل گیا کہ یہ وہی کے جام کیوں چھٹلے
 جا رہے ہیں۔

”جی ہاں۔ مزے کوئی کرے۔ رول ہم دیں“ سیٹھ چھیدی لال بولے ”ایسے اوتھے ہم نہیں ہیں!“
 مرزا جی کا پیٹان کے منہ میں پیک گول رہا تھا۔

”مگر اس فونڈے میں ہے کیا؟“ رنجنا نے ڈی غور سے بھندکار سے پوچھا: ”پہلے رنجنا معلوم ہوتا ہے
 یہ عشرت؟“

بھندکار نے کہا: ”نہتے ہیں، اہلن لاٹ سے اس کی صورت ملتی ہے“
 ”جی!“ رنجنا بولی۔ ”تو میں اسے راج لٹا آئے ہوئے دکھائی دی۔ فوراً پٹ کے اس سے پٹ
 گئی۔ بولی“ ”ہائے دی کتنی خوش قسمت ہے تو۔ میری تو عشرت کو دیکھتے ہی ہان پھل گئی، ہوشیار ہوتا
 کسی دن جیت کے لے جلتی گی۔“

راج تباہ شد خوش ہوئی اس نے رنجنا کو ہم کیا۔ دونوں سبیلیاں ایک دوسرے سے پٹ گئیں۔

بھرائے نے بھندکار سے پرچھا۔

”پارٹی پسند آئی؟“

”سیڈم!“ بھندکار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے سفری انداز میں جھکا۔ یہ گریٹ شائدرسٹ عظیم اٹانٹ پارٹی ہے جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی ہے۔“

جوشی جی ابھینو کو لے ایک کمرے میں بیٹھے بی رہے تھے۔ ہشتے داروں میں مرنجھینو، پارٹوں میں شریک ہو سکتا تھا۔

جوشی جی کہہ رہے تھے ”گنگا جلی کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ مرنجھوں گا۔ مگر اس عشرت کو کبھی پارٹی نہیں دوں گا۔“

ابھینو نے کہا ”جی ہاں کبھی مت دیکھئے گا۔ مگر مجھے دوسکی تو دیکھئے“ ابھینو نے جام خالی کر دیا جوشی جی کہہ رہے تھے ”اور وہ بھی پھر ایک مسلمان لڑکے سے! اری تمہاری غیرت کو کیا ہو ہے ابھینو۔“

”ایک شریف ہندو مگرانے کی لڑکی۔۔۔۔۔ اور وہ ایک مسلمان سے عشق کرے۔ میں پڑھتا ہوں کوئی ہندو نہیں ڈالتا کیا اندیشی کے سب ہندو بیروہ گئے تھے۔“

”بڑے بڑا“ ابھینو نے سے تالی ہلکے چونکا۔ جوشی جی نے کہا ”کیا بات ہوئی؟“

ابھینو بولا ”بلدی سے دوسکی لڑ۔ یہ میری ہندو شرافت کا تقاضا ہے۔“

”تمہاری شرافت کہاں ہے؟“ جوشی جی نے غصے سے پرچھا۔

”میری جیب میں“ ابھینو نے جیب سے چھ سات دس دس کے نوٹ نکالے۔ اور انہیں پھر پڑے پڑے

سے چوم کر جیب میں واپس ڈال دیا۔ بولا ”آج میں بہت شریف ہوں۔ میری۔۔۔۔۔“

اکرم اصرے گندہا تھا۔ ابھینو کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے بلدی سے اکرم کو کرے میں بلا لیا۔

جوشی بھی کرتا رہا۔

ابھینو نے کہا "اکرم بتایا۔ ایک مشعل آن پڑی ہے۔ مل کر دیجئے"۔
 "فرمائیے؟"

جوشی نے اکرم کے آنکھ مار کے کہا "یہ پئے ہوئے ہے"۔

ابھینو نے شعلہ بارحکا ہوں سے جوشی کی طرف دیکھا اور کہا "جی ہاں۔ میں ہر روز جنگ پتیا ہوں۔ آؤ
 دیکھی پتی رہا ہوں"۔ "فرمائیے بات کیا ہے۔ مجھے جلدی مگر مانتا ہے"۔ اکرم نے کہا

"اتنی جلدی؟" ابھینو نے پوچھا۔ "ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پوسٹ
 آئے گی۔ پھر تھوڑا سا ہنگامہ ہوگا۔ اس کے بعد ہم سب لوگ یہاں سے نکلنے کے بعد چور
 پر ملیں گے۔ راج نے جو ہوگا ایک پورا ہوٹل آج کی رات کے لئے کھل کر لیا ہے۔ آپ نہیں ملتیں گے۔"
 "نہیں"۔

"کم از کم پوسٹ کو تو آنے دیجئے۔ ہم میں سے ایک تو ایسا ہونا چاہئے جو پولیس سے لگنت کے بغیر
 بات کر سکے"۔

اکرم نے پریشان ہو کر کہا "آپ بات بتائیے۔ نہیں تو میں..."۔ ابھینو نے اُسے آستیں سے
 پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

"بڑا سا سوال ہے۔ یہ جوشی ہی کہتے ہیں کہ راج ایک ہندو لڑکی ہے۔ اُسے مشرت سے محبت
 نہیں کرنا چاہئے۔ اگر مشرت ایک ہندو لڑکا ہوتا۔ تو انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یہاں تک نہیں؟
 کہ جوشی ہی ہندو مسلمانوں کی آپس کی شادیوں کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر اگر بھی مشرت ہندو
 ہوتا اور راج مسلمان ہوتی تو انہیں اس شادی پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہیں نہ محبت پر اعتراض
 ہے۔ نہ مذہب پر۔ پھر کس بات پر اعتراض ہے۔ یہ میری جگہ میں نہیں آتا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟"

اکرم جوشی جی کا سنہ دیکھئے گا۔

جوشی جی کہانی نہیں جس کر بے " میں تو اکرم تم جانتے ہو، اس قسم کی فرقہ واریت سے کتنا دور
ہوں۔ یہ کم بخت ابھینو اس وقت پی کر بیگ گیا ہے ؟

اکرم نے ابھینو سے پوچھا : کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ بخت ہے ؟ حضرت اور راج کے درمیان محبت
ہے ؟

ابھینو نے کہا : کیا تمہیں یقین ہے کہ اگر حضرت نہ ہوتا تو یہ محبت ہوتی۔ حضرت نہ ہوتا جوشی جی جوتے
تو یہ محبت ہوتی، راج نہ ہوتی، شتاو ہوتی تو یہ محبت ہوتی ؟

ابھینو نے کہا : مگر اکرم بھیا، میں اس سوال کو حل کر کے چھوڑوں گا تا ابھینو کی بھوسیں ٹھکرائیں
اس نے بڑی سنجیدگی سے ایک گلاس دہکی کا اپنے سامنے رکھ کے کہا " یہ ایک ہندو لڑکا ہے ؟
پھر اس نے ایک دوسرا گلاس اٹھایا۔ اور کہا " یہ ایک ہندو لڑکی ہے۔ کیا یہ دونوں مل سکتے
ہیں ؟ طے کر لیں ؟ ابھینو نے ایک گلاس کی دہکی دوسرے میں ڈال دی۔ مل گئی۔ ابھینو نے کہا
بھلا کے بولا " اچھا اب یہ گلاس اٹھاؤ یہ مسلمان لڑکا ہے۔ برا اٹھاؤ۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔ دھڑکا
کر لڑاؤ آبا۔ پھر مل گئے "۔

ابھینو نے پھر دو گلاسوں کی دہکی اپنے گلاس میں اڑیل لی۔ چار چھوٹے ٹکڑے ایک بڑا
پیگ اس کے سامنے تھا۔ ایک پیگ۔ پھر اس نے ایک گلاس میں دہکی ڈالی۔ یہ ہندو لڑکا
ہے۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔ آبا۔ دونوں مل گئے۔ وہ دونوں چھوٹے بھی اس نے اپنے پیگ میں
ڈال دیے۔ اب اس نے ایک اور گلاس اٹھایا : یہ مسلمان لڑکا ہے۔ یہ ہندو لڑکی ہے جوشی جی ؟
کہتے ہیں۔ یہ نہیں ملیں گے۔ آئیے دیکھیں، ایں۔ یہ تو مل گئے۔ ایک ہی رنگ، ایک ہی خاندانہ دی
جو اس دی خاندان کی معنی، دی اس کا خاندان ؟

جوشی جی نے کھیلنے ہر کے کہا۔ ارے بُدھو۔ اب سب گلاسوں میں توڑ دی ہے۔
 اکھینو بولا۔ یہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ہم سب میں دیکھی ہے۔ ہم سب اسی آگ اور پانی سے
 بنے ہیں۔ نام عشرت ہوا تو کیا، اور جوشی ہوا تو کیا؟
 اس کے بعد اکھینو بہت بڑا پیک ٹانٹ پیئے گا۔
 جوشی جی نے کرم سے کہا۔ "آج مرے گا۔"
 کرم کوئی جواب دئے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

بڑے ہل میں سے تالیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ غمی ریگھوٹوں کی دھن پر
 رضیہ اور ولایت بگم مانج رہی تھیں۔ راج لال نے خاص طور پر ان لوگوں کو پیسے دیے کہ انہیں
 کسے لئے ہوا است۔ رضیہ نہ آتی مگر آناں سخت پارتھیں اور اُسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔
 اُسے معلوم تھا۔ وہاں پر عشرت ہوگا۔ مگر آناں کی جان کے لئے پڑے ہوئے تھے۔ دیکھ کر کے قہقہے
 تھے بہن کے چہرے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خوب صورت بھانجیوں کی اور اسی رضیہ سے دیکھی نہ جانی تھی۔
 پندہ دن سے کہیں کام نہ ملا تھا جب راج لال نے تیس روپے ایڑھانے کے بجائے تیرے تو رضیہ سے
 انکار نہ ہو سکا۔

راج سے پہلے رضیہ پارٹی میں باصلہ شریک نہیں ہوئی۔ رضیہ اور ولایت بگم دونوں
 شریک تھیں۔ مگر رضیہ خاموشی سے میک اپ کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کسی کو اس کی آنکھ پر نہ تھا۔
 کسی کو پردا بھی نہ تھی۔ عشرت کو بھی معلوم نہ تھا۔ راج نے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک
 ایکسٹرا تھی!

رضیہ نے سوچا تھا کہ وہ بھانجیوں کے کسی طرف نہیں دیکھے گی۔ وہ دو اوروں کو
 دیکھے گی۔ جیت کو دیکھے گی۔ اور فرش کو دیکھے گی۔ اور جہاں کو دیکھے گی، مگر کسی کے چہرے کو

اور کسی کی آنکھوں کو اور کسی کے ہونٹوں کو اور کسی کے بالوں کو اور کسی کی مسکراہٹ کو کسی نہیں دیکھے گی اگر کسی طرح سے وہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے کہا تم صرف اس جگہ انہی پہنچنا چاہیں وہ تمہارا ہجے روپوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں اپنے پاؤں سے ناچوں گی اور اپنی کمر سے۔ کڑے سے۔ بازوؤں۔ گردن اور شانے سے اور ہونٹوں کی جنبش سے ناچوں گی، مگر آنکھوں سے آج نہیں ناچ سکوں گی۔ کیوں کہ آنکھیں روح میں جھانک کر دیکھ سکتی ہیں۔ اور اگر اس نے کہیں دیکھ لیا تو آگاہی ہے میری شکست دیکھ لی۔ تو وہ کہہ مسکرائے گا۔ آنکھوں! کیا تم اندھی نہیں ہو سکتیں چند لمحوں کے لئے، لوگ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے سوا اور سب کو نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن محبت ایسی بھی رہتی ہے جس میں انسان اپنے محبوب کے سوا اور سب کو دیکھ سکتا ہے۔ آج میں یہی ہی آنکھیں چاہتی ہوں۔ رضیہ نے کسے ٹھوکار دیا۔ ہل کم بہت۔ کیا سوچ رہی ہے وہ لوگ ہاں میں روشنی مل گئے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ناچ شروع ہونے والا ہے۔

ہال میں اندھیرا تھا جب رضیہ، رضیہ اور ولایت بیگم اندر آئیں۔ روشنی ہو گئی۔ جیسے جیسے ہر صبح کی سانس کسی کو دیکھ کر تیز ہو جائے۔ پھر کہیں سے پائل کی جھلک سنائی دی۔ جیسے کوئی تار ٹوٹ کر رہ گیا۔ پھر روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ گھومتا ہوا ولایت بیگم سے رضیہ، رضیہ، رضیہ پر رکا۔ ایک لمحے کے لئے۔ ایک لمحے کے لئے رضیہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ابک نہ۔ کہ نہ کسی نے زور سے سانس اندر کھینچی۔ پتھر اس کے کہ رضیہ کو دیکھ سکتی کہ کون ہے۔ ہال میں لاٹ ہو گئی اور ناچ نندہ سے شروع ہو گیا۔ رضیہ کی نگاہ سب سے پہلے میں پر پڑی وہ عشرتِ ناز مسکراہٹ جیسی کی طرح اس کے ہونٹوں پر چمکی ہوئی تھی۔ رات نے اپنا سراپا کی گود میں رکھ لیا تھا۔ جب رضیہ ناچتی رہی عشرتِ ناز چمکی طرح بک بنا ہوا بیچارہ۔ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ رضیہ ۲ کے قریب سے ناچتی ہوئی گزری ۱۱۱ قریب سے گزری اور قریب سے گزری۔

ایک ایک محشر بڑے بڑے چلایا۔ روشنی مٹ کر دو۔
ایک ایک ہال کی روشنیاں مٹ ہو گئیں۔

لائٹ میں نے جس کے ہاتھ میں روشنی کا ستارہ تھا۔ عشرت کی جھلکا نہ آواز سے گہرا کر ہال کی روشنی مٹ کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے ہال میں ہنگامہ سا ہو گیا۔
”روشنی کھول دو۔ کیا ہوا۔ رات ہے۔“ روشنی ۛ

راج نا چلائی۔ روشنی کر دو۔

ہال کی روشنیاں پھر چمکنے لگیں۔ راج نے پوچھا کیا ہوا تھا ڈارنگ ۛ
عشرت نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہا۔ ”کوئی نہیں۔ چکرا گیا تھا۔ روشنی چمکنے لگی تھی ۛ
”اب؟“

”اب ٹھیک ہوں ۛ عشرت نے مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میک اپ کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ رضیہ دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ ولایت بیگم اس کے پاس جھٹی تھی۔ خاموش۔

رضیہ روتے روتے بولی ۛ ”عجب اندھیرا سا ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں اس کے گہرے ہوئے خوب صورت بالوں میں اپنی آنکھیاں پھیر رہی ہوں ۛ
ولایت بیگم نے کہا ۛ ”اس خاموشی میں کبھی کبھی اس بچے کی چیخ سنتی ہوں ۛ
”کس بچے کی؟“ رضیہ نے سکتے ہوئے پوچھا۔

ولایت بیگم رضیہ کے باطل قریب آئی۔ اس کے گلے سے لگ کر بولی ۛ ”جانتی ہو رضیہ میں گیارہ سال کی تھی جب انہوں نے مجھ پر یہ ظلم توڑا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ میرے رحم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے میرے اب کبھی کوئی بچہ نہ ہوگا۔ پھر کبھی ———“

دلایت ہی سختی سے دھبے سے پٹ گئی۔ بولی :- پھر کبھی — کبھی کبھی مجھے اس بچے کی سچ سنائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی وہ میری کوکھ میں کھانے لگا ہے۔ کبھی کبھی میرے ہاتھوں میں بگٹے لگا ہے کبھی کبھی اس کے ننھے ننھے ہاتھ میری چھاتیوں پر بیٹھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خدا! یہ کیا کیوں ہوتا ہے ایسا کیوں ہوتا ہے ؟

دھبہ نے دلایت کو چہرے کے کہا " تو بڑی اچھی لڑکی ہے ۔ تو نہ جایا کر ۔ ان مردوں کے ساتھ کبھی نہ جایا کر ۔ تو کیوں جاتی ہے ۔ آج اس کے ساتھ اکل اس کے ساتھ ۔ عورت کو ایسا نہیں کرنا چاہئے ۔ دلایت ذرا سی ہنسی ۔ بولی :- بھئی ۔ میں کوئی عورت تھوڑی ہوں ۔ میں قراب طوائف ہوں !

کوئی بھی کے قریب سچ کو پہنچا جو پر ختم ہوئی۔ وہ اچھینڈ کا کہنا ٹھیک نکلا۔ کوئی دھبے کے قریب جس لوگوں کی شکایت پر پولیس آئی۔ تو رہاں کا نکل چلا۔ بند ہوا۔ اور سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر جو چلے گئے۔ اور وہاں سے کوئی پانچ بجے کے قریب پھل برخواست ہوئی۔ بہت سے لوگ جن کی اس روز شوٹنگ نہیں تھی۔ وہاں گھروں میں چڑکے سو گئے۔ دوسرے لوگ جنس کام تھا گاڑیوں میں بیٹھ کر گھروں کو بھاگے۔ راج لاکھی شوٹنگ تھی۔ لیکن شوٹنگ سے پہلے اُسے سچ سچا کالے میں ہارن بی لٹو پرایک ادبی سوسائٹی کا افتتاح کرنے کے لئے جانا تھا۔ اس لئے وہ عشرت کو در کر مگر آگئی غسل کرنے کے لئے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے۔ میک آپ کرنے کے لئے تین گھنٹے تو چاہئیں۔

ڈریسنگ ٹیبل پر اس کی اور عشرت کی باتیں ہوئیں۔ راج لاکھی کوئی گھنٹی ہوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اکثر ایک انڈیا ریڈر اور باؤسی پہنے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر میک آپ کرنے لگتی۔ یہ اس کی زندگی کے سجدہ خیرین لمحے ہوتے۔ جب وہ خود سے اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیتی۔ اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی۔

”ٹاٹا فلک وہ برش دینا: راج نے عشرت سے کہا
عشرت نے برش اٹھا کے دیا۔

راج بولی: ”جوشی جی نے وعدہ کر لیا ہے۔ بیٹو باجھڑانے بھی وعدہ کر لیا ہے۔ میڈم سے بھی کہہ چکی ہوں۔ بلکہ کل تو دس سو روپے رزی میں جان بوجھ کے میں بارگئی، مگر کسی طرح میڈم خوش ہو جائیں تم جوشی جی کی اگلی ٹکڑ میں بیرو کا کام کر رہے ہو۔ مزاجی نے بھی ہاں کر دی ہے۔ جھیدی لال نے بھی منظور کر لیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ اگر وہ تمہیں بیرو کا چانس دے تو میں اس سے دس ہزار روپے کم لوں گی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اگلے بجتے اپنی نئی تصویر کا اعلان کر رہا ہے۔ جس میں تم بیرو ہیں۔ تباہی بیروئن۔ ٹاٹا فلک وہ پتی کوٹ دینا۔ یوں وعدے قورات کو دس بیس پروڈیوسروں نے کئے ہیں۔ مگر ان میں وہ چار گبی تھیں چانس دے دیں۔ تو دس سالوں ہی میں تم وہاں ہو پھر ٹوٹو گے۔ راج نے صحت کی طرف دیکھا، عشرت نے اسے گلے سے لگا لیا۔

”اے رے۔ میرا میک اپ مت خراب کر۔ جان!“

راج ذرا تنک کر بولی: ”کالچ پہنچا ہے۔ اتحاد کھو۔ ابھینو نے میرے لئے ایک تقریر تیار کر دی ہے
فدا تم دیکھ لو اے۔ تم ذکر بحیث ہو۔ آئندہ میری تقریر بھی تم ہی لکھ کرنا۔ ٹھیک ہے؟“

”ہاں پاری؟“

عشرت قہقہہ دیکھنے لگا۔ اتنے میں راج نے اس سے بڑے پیار سے کہا: ”جانی
رجنل کے ہاں تھے پیرس کا ڈاکے میں اور ایک بہت عمدہ بلو ظلم بھی آئی ہے۔ کہہ رہی تھی بہت
بلو ظلم ہے۔“

”بلو ظلم کیا ہوتی ہے؟“

”تم پوچھو گے تو تمہیں بتائیں گے۔“

”اے کوئی کوئی ہو گا وہاں؟“

”زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ زیادہ لوگوں میں جو فلم نہیں دیکھی جاتی۔ بس تم اور میں ششاد اور اس کا۔
ریخا اور اس کا۔“

”ششاد کا اس کا کوئی ہے؟“ شرت نے پوچھا۔

”تم نہیں جانتے؟ اے سیٹھؔ تو وہ دمن داس جوہری کا لڑکا گلاب داس۔ دیکھنے میں بڑا حسین اور فزٹ
ہے۔ سچ گلاب معلوم ہوتا ہے۔ مگر ششاد کو اس سے محبت نہیں ہے۔“
”کیوں؟“

”کیوں کہ وہ جتنی اسٹوڈنٹ پر مرنی ہے۔ گلاب بے چارہ ہر سال اسے ایک نئی کار اور ہزاروں کے جواہرات
لے کے دیتا ہے۔ پھر کبھی ششاد خوش نہیں ہے۔ اگر وادی کا دیاؤ نہ ہوتا تو وہ کب کی اُسے دستا
بتا چکی ہوتی۔ خدا نہ سینڈل تو دینا؟“

سجنانا کالج کا ہاں باہل بھرا ہوا تھا۔ ادنیٰ مجلس کا افتتاح تھا۔ لیکن سائنس کے طلباء
نے بھی چھٹی سناٹی تھی۔ اور سب کے سب ہاں میں جمع تھے۔ بلکہ بہت سے لڑکے تو بال کے باہر کھڑے
تھے۔ انہیں ہاں میں کھڑے ہونے کو کبھی جگہ نہ ملی تھی۔ پرنسپل صاحب جن کی موٹھیں ہر روز گری رہتی تھیں۔
وہ بھی آج اپنی موٹھوں کو ہل دے کے آئے تھے۔ پروفیسروں کی جینکوں کے شیشے غیر معمولی طور پر صاف
تھے۔ اور چلوں پر بھی استری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لڑکے تو غیر بہترین لباس پہن کے آئے ہی تھے
لی فرٹ اور نالی لان کے فرٹ جن سے اند کا ہم کا حصہ صاف نظر آتا ہے۔ ٹخنوں سے ادھ رنگ مہی

کی چلوئیں۔ کچھ دھڑکے کے بعد لوگے نائی لان کی شفات چلوئیں بھی پہنچے لگیں گے۔ پھر وہاں دھڑکوں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ راج لائے سوچا۔

راج لاہشرٹ اور ابھینو کو ساتھ لے کے آئی تھی۔ مگر وہ چونکہ لوگوں کا کالج تھا۔ اس نے کسی نے ان دو خلیوں کی طوت توجہ نہ کی۔ عشرت بہت صدمہ لباس پہن کے آیا تھا۔ مگر لوگوں نے اُسے ایک نظر دیکھا۔ پھر کچھ گئے۔ پھر انہوں نے اُسے واقعی نظر انداز کر دیا۔ جیسے وہ ہال میں بیٹھا نہ ہو۔ راج لاک کی تقریر بہت عمدہ تھی۔ ابھینو نے بگ بگ۔ اپنی خبرے اور اقوال پُر کر کر دئے تھے۔ ان پر راج کو بے حد داولی۔ آخر میں جب اس نے اپنی تقریر اس شعر پر ختم کی۔

جوبے نشان چلے تھے وہ پاگئے منزل

ہیں تو راہ کے نام و نشان نے ٹوٹ دیا

ماہرینِ تنویر و دستِ بک تالیاں پیٹتے رہے۔ راج لاک کی تقریر کا موضوع تھا "اخلاق اور ادب"۔ صاحبِ صند جو خود کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اخلاق اور ادب پر اس سے بہتر تقریر آج تک نہیں کی گئی۔

تقریر کرنے کے بعد راج کو لوگوں نے گھیر لیا۔ آؤ گرات کے لئے۔ اس میں کالج میں بلانے کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ تقریر اور دعوت تو ایک یہاں ہوتا ہے۔ اس چیز تو یہ لمحہ ہوتا ہے جب ملک کی مائے ناز ہر دہن آپ کے سامنے باصل سامنے چندا پنوں کے غاصط پر کھڑی آپ کی انگوٹیاں ہم پر دستخط کر رہی ہوتی ہے۔ تم جنت میں پہنچ جاتے ہو۔

راج کو کئی لوگوں نے گھیر رکھا تھا

شیخ کے ایک کونے میں ابھینو اور عشرت بے وقوفوں کی طرح بیٹھے کبھی اٹھتے نہ تھے۔ کبھی پاؤں بکھلنے لگتے۔ عشرت کو بار بار پسینہ آ رہا تھا مالا مالک سر کے اوپر سپن کھاہل رہا تھا۔

تاریخ کے پروفیسر نے جرنیل کے پروفیسر سے کہا "ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ ملک کے بڑے بڑے فلسفیوں، سیاست دانوں، عالموں اور ایسے کو جانتے تھے، اور اس کی باتیں سنتے تھے۔ آج اگر فزکس سوسائٹی کے لئے چندہ اکٹھا کرنا ہو تو ہمیں کسی ظلم اشارہ کو بلایا جاتا ہے۔ بڑے ظلم دانوں سے کوئی عطا نہیں ہے۔ مگر یہ لڑکی پروفیسر نے راج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ ادب یا سائنس یا تاریخ یا جغرافیہ کس کے بارے میں کیا جانتی ہے۔ یہ غالباً صرف چیک بک یا انٹرکٹو بک پروفیسر کر سکتی ہے۔"

جرنیل کے پروفیسر نے جس کر کہا "مائی ڈیریل گاؤنجر۔ آج کل تاریخ کا زمانہ نہیں ہے۔ آج کل کے نئے نئے تاریخ کے پبلک جرنیل میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اب اس بہترین کا جرنیل دیکھو! پروفیسر مل گاؤنجر بننے لگا۔ اور جرنیل کے پروفیسر کو کھینچ کر بال سے باہر لے گیا۔

کئی بنے مگر گئے۔ مگر مشرت کو سیریکا چانس نہ ملا۔ راج لانے بے حد کوشش کی۔ مگر اسے کہیں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔ سیتھ جمیدی لال نے تو سیریکا اطلاع بھی کر دیا تھا: "جمیدی ٹاکو: جس میں مشرت اور راج لال دونوں کا کام تھا۔ مگر بعد میں ڈسٹری بیوٹروں کے کہنے پر اسے اس تصویر کے بنانے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ کیوں کہ ڈسٹری بیوٹران دونوں مارکیٹ کے اندازے کے مطابق سرائے کی کسی کے باعث اور اس پر سود و سود کی زیادتی کے باعث زیادہ تصویریں بنانے کے حق میں نہیں تھے اور ان تصویروں میں تو وہ بالکل ہی کسی نئے چہرے کو لے کر کسی نئے فلم کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جمیدی لال نے سب کچھ راج لال کو اچھی طرح سمجھایا: "اگر نئے چہرے نہیں آئیں گے تو نئے لوگوں کو چانس کیسے ملے گا؟ ایک روز میں بھی تو نیا چہرہ نہی؟" راج لال نے پوچھا۔

لڑکیوں کی بات اور ہے: "جمیدی لال نے مسکرا کر کہا: "اُن کے لئے زیادہ گنجائش ہے۔"

سیتھ پاگڑیا لے کر آیا۔ آج کل منہ مل رہا ہے۔ اسے جب سے جنگ بند ہوئی ہے منہ مل رہا ہے۔ تیس معلوم نہیں راج غلوں کا حال کتنا بُرا ہے۔ جو فلم بناتے ہیں۔ ڈوبوں سے پھر نکلتے ہیں۔ بھائی ہو جاتی ہے۔ باکس آفس نے تو ہمارے ہوش گم کر دیے۔ کچھ معلوم نہیں۔ عام لوگ کیا چاہتے

ہیں۔ یہ سارے چوٹی والے ۛ

کسی زمانے میں کم سے کم ٹٹ چار آنے کا برابر کرتا تھا۔ اور عوام اُسی میں جاک بٹھا کرتے تھے دھڑ کاری گر۔ چھوٹے چھوٹے دوکان دار۔ کھڑک۔ طالب مہمب چوٹی میں غم دیکھتے تھے گریبوں میں گرائی بڑھتی گئی۔ غم دیکھنے کے کبھی دام بڑھتے گئے۔ اب بھی چوٹی، ٹٹ دس آنے میں خریدتا جاتا تھا۔ لوگ اب اس کو اس میں ٹٹنے کے لئے پار آنے کے کپائے دس آنے دیتے تھے۔ گرائی سے روپیہ چورنے والے حضرات اب تک انہیں "سارے چوٹی والے" کہہ کر پکارتے تھے۔

"میں کوری کو دیکھو۔ یہ سارے گھوڑوں کو کیا بڑ گیا ہے۔ اس سال یہ ایک گھوڑا بھی نہیں بیٹا۔ بیٹھ بکلیا راج کو بنانے لگے۔

"مگر میں تو عشرت —

بانکڑا نے راج کی بات کاٹ کے کہا "اگر شاگ ابھی کرلو۔ چارمیں سال سے شاگ ابھی کا دستا کر رہا ہوں۔ ایسا بڑا زمانہ کبھی نہیں دیکھا۔ دولا کو توکل ہی ہار گیا۔ ایک دن میں ۛ
"مگر میں تو سب تو آپ سے شاگ ابھی نہیں عشرت کی بات کرنے آئی تھی۔ دونوں کا آپس میں کیا تعلق ۛ
"بہت بڑا تعلق ہے۔ تم نہیں جانتیں ۛ بیٹھ چک کے لڑے۔

"شاگ ابھی ہارے سماج کا پرڈو لے رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ تو ب کھو اپنی جگہ پر قائم ہے ۛ
"مگر تم نہیں جانتیں ۛ

راج سٹ پٹا گئی۔ بولی ۛ آپ عشرت کو سیر کا پاس دے رہے ہیں۔ کون نہیں۔ صاف صاف بتائیے نا؟
"وہی تو بتا رہا ہوں ۛ بانکڑا نے راج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہا "اگر اس کی تبدیلی کی حرکت خود سے دیکھ کے دولا "بہت لگی ہو۔ تم بہت لگی ہو ۛ

راج نے اپنا ہاتھ ہٹا دیا۔

بھڑانے مسکرائے کہا: "اگر رمانہ اچھا ہوتا۔ تو ضرور میں عشرت کو چانس دیتا۔ گراب تو میں نے سوچ لیا ہے۔ کہ آپ کو رسک لینا ہی نہیں۔ سال میں چار گچہ بناؤ۔ چیاؤہ نہ بناؤ۔ مگر بڑی اسٹارکاسٹ لیلی گچہ بناؤ۔ پچھرنے سے پہلے۔ ڈوشری ہو ڈکوپچ دو۔ دکھٹ دکھٹ دکھٹ پٹ پٹ ۵ راج اکٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیشورنا۔ باغیا یا بیٹھو نے کہا: "سیڈم ابھی آئی ہوں گی۔" راج جواب دے بغیر بیٹھو کی کہیں سے عمل گئی۔

جوشی راج محل میں خوشگ کر رہا تھا۔ وہ راج لٹاکو۔ ساؤڈر پکارونگ کے کمرے میں لے گیا۔ اور انجینیر سے کہنے لگا کہ وہ چندہ بیس منٹ کے لئے باہر چلا جائے۔ اُسے راج لٹاکے کچھ ضروری باتیں کرنا ہے۔ جوشی راج لٹاکو بہت دیر تک اس کی بیچ بھاتا رہا۔ "تم احمق ہو۔ بے وقوف ہو۔ پاگل گدی ہو" جوشی نے راج سے کہا: "آخر تم کیوں عشرت کو ہیرد کا چانس دلوانا چاہتی ہو؟"

"کیوں کریں اُسے چاہتی ہوں ۵"

"بس یہی تمہاری عاقبت ہے کہ تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اسے چاہتی ہو۔ حاصل نہ تم اُسے چاہتی ہو۔ نہ وہ تمہیں چاہتا ہے۔"

"وہ؟" ————— وہ میرے لئے جان بھی دے سکتا ہے ۵ راج لٹاکے اپنے ہی کندھے سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو۔ پیاری کبھی تم باری بھی پیاری نہیں۔ اس لئے کم از کم اس لفظ کے برتے کا حق تو مجھے دیدو" جوشی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ راج خدا سا مسکرائی اور غصے سے اس کی باتیں سننے لگی۔ جوشی کہہ رہا تھا۔ "تم عورت ہو۔ بہت سی باتیں نہیں سمجھتی ہو۔ عشرت کو میں کل ہیرد کا چانس

مے سکتا ہوں۔ دلا سکتا ہوں مگر ایسا بھی نہیں کر سکتا۔ صرف تمہارے بچے کی خاطر میں جانتا ہوں۔ تم اسے کتنا چاہتی ہو۔ مگر جس دن تم نے اُسے بیرو کا چانس دلوایا۔ وہ تمہارے ہاتھوں سے ضل جلتے گا آخر دوسری بیرو مینوں کے بھی تو عاشق ہیں۔ وہ بھی خوب صورت ہیں۔ ہلکے ہیں۔ بچیلے ہیں۔ نوجوان ہیں وہ لڑکیاں کیوں انہیں سنبھال سنبھال کے رکھتی ہیں۔ کیوں انہیں کسی غم میں بیرو کا بلکہ بیرو سے کم وجہ کا بدل بھی نہیں دلاتیں؟

راج لا جوشی بی کامنہ دیکھنے لگی۔ واقعی یہ بات جری عجیب تھی۔ اُسے رہنا اور اسنس کا دوست سنسنس لگا رہا آیا۔

جوشی بی نے راج کا چہرہ دیکھا۔ اور اپنی آواز غبی کر کے بولا: ڈارنگ تمہارے بچے کے لئے کہتا ہوں اگر عشرت کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہو تو اُسے کسی غم میں چانس مت دینے دو۔ وہ شاید ہی تصور میں کام کرنے کے بعد وہ تمہارے کام کا نہیں رہے گا۔ تمہارے ہاتھ سے جلتے گا۔ دیکھو وینڈو گدار کرب سے پہلے آخانے کام دلوایا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔

گل کو کورانی بالانے کام دلوایا تھا۔ آج گل محمد نے ارشاد سے شادی رچائی ہے۔ اور دانی بالا۔ منہ تانکتی رہ گئی۔ اگر تم عشرت کو اپنے ہاتھ سے کھڑا چاہتی ہو۔ تو گل اُسے میرے پاس بیجو۔ میں اُسے کام دے دوں گا۔ جوشی بی نے جی بکائی راج سوچنے لگی۔ بات تو ٹھیک کہتا ہے۔

جوشی بی نے کہا: ڈارنگ تم نے میں چھوڑ دیا۔ مگر اب بھی تمہارے بچے کے لئے سوچتے ہیں۔ تم ر عشرت کو اس طرح دیکھتی نہیں۔ اُسے تاج پارٹی۔ اپنے کپڑے۔ ہار میں ایسا لگ کر دوکھی سے شام تک اسے غم کا دھیان تک بھی نہ آئے۔ وہ غم میں آیا۔ اور تمہارے ہاتھ سے گیا۔ کیوں؟ راج نے سوچتے ہوئے کہا: بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔

جوشی جی نے خوش ہو کر اُسے گلے سے لگا لیا۔ اُس نے کمر میں ہاتھ ڈال کے اس کا پید پھینک کر شیش کرنے لگے۔ چند لمحوں کے لئے تو راج نے اُن کے بس کو برداشت کیا۔ پھر اپنے آپ کو جھٹاتے ہوئے بولی "اجتاب یہ کتوں کی طرح کیا کچک کچک گارہی ہے۔ مجھ کو روکے۔"

اُس نے اپنے آپ کو جوشی جی کی گرفت سے چڑا لیا۔ اور دیکھا تو نگ روم سے باہر نکل گئی۔ باہر انجینئر دہارے لگا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ راج کو دیکھ کر مسکرایا۔ راج جلدی سے اپنی ساڑی سنبھالتی ہوئی تیزی سے گزر گئی۔

"سالی! انجینئر نے سگریٹ پھینک کر اُسے اپنے پاؤں تلے دالتے ہوئے کہا۔

ایک سال گزر گیا۔ عشرت کو کہیں بیڑ کا پانس نہیں ملا۔ یہ سال عام لوگوں کے لئے بڑی مصیبتوں کا سال تھا۔ بہت سے شورو میں لاسٹ مینوں اور دوسرے خاندانوں کو تھوڑے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ میسور میں ایک شورو بند ہوئے والا تھا بہت کم تصویریں بن رہی تھیں۔ ایکسٹرا لوگ قریبے کار رہنے ہی تھے۔ اب اس کا اثر دوسرے درجے کے اداکاروں پر بھی پڑ رہا تھا۔ جو کہیکر بڑول کیا کرتے تھے اُن میں سے بہت سے لوگوں کی گلاڑیاں گردی ہو کے کاہا دیوی روڈ کے سینوں کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ یہی لوگ تھے جو انڈسٹری میں رہتے ہی نکلتے تھے۔ جبکہ اُن لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو سرائے کی شرح سود بھی بڑھا دی۔ پہلے تیس پائیس فی صدی پر سود چل جاتا تھا۔ اب پچھن فی صدی پہنچ گیا۔ ایک لاکھ روپے پر پچھتر ہزار سود دو۔ تو تصویر بنانا۔ اب ایسے میں کسی تصویر بننے کی اور کیا تیار ہوگی۔ ایک

ایک بار پروڈیوسر کہے بے ایمانی پر تل گئے۔ تصویریں شروع ہوتی تھیں اور آدمی یا ایک چوتھائی بن کے وہ باتی تھیں۔ پروڈیوسر بیچ میں روپیہ کھا جاتے تھے۔ ایک لاکھ پر کچھ تر خزانہ سود کو من دے گا؟

جوشی جی نے سینما کٹر چند سے ایک لاکھ روپیہ سود پر لے کر اپنی بیوی کے نام پر ایک مکان بنالیا تھا۔ میں ہزار فلم میں بھی لگا یا تھا۔ دو درمیں تیار ہو کے ڈبے میں پڑی تھیں۔ آگے کے لئے کام بند تھا۔ جوشی جی باہر سے سینما کی تصویریں لے کر رہے تھے۔ اب سینما کٹر چند آگے بڑھے۔ مزید رقم دے تو اس کی بچہ بن سکتی تھی۔ روزہ میں کہے میں طرح جوشی جی پیش کر رہے تھے۔

مگر موت اُن پر کے چامیس پکاس یا سو آدمی مزے میں تھے بھئی کی فلم اندیشی میں کوئی بھی نہیں ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ اُن ایک سو کو چھوڑ کے باقی سب کی حالت بدتر سے بدتر ہوتی جا رہی تھی راج کی باہنوں کے باہر اندھا تھا۔ عشرت نے اُن خوب صورت باہنوں کے آسمان کو نشیت جانا۔ میں دھشت نے اُسے کابل اور کشت اور جہاد بنا دیا تھا۔ وہ پہلے سے دنگن موٹا اور بھاری ہو گیا تھا۔ اُس کا پیٹ تھوڑا سا آگے نکل آیا تھا۔ اس کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وہ شرمیلا پن نہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طرف کی طمانیت چھا گئی تھی۔ جیسے پلے ہوئے شہر کے چہرے پر ہوتی ہے۔ اب اُسے گندہ خاق پسند آتا تھا۔ اب اُسے بھنگ یا دھکی یا چرس سے نشہ نہ آتا تھا۔ وہ راج کے بھائی اجمینو کے ساتھ اُن تمام مراحل سے گزر کر ماریفا کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جب تک وہ ماریفا کا انجکشن نہ لے لے اُسے نشہ نہیں ہوتا تھا۔

اجمینو اس میدان کا پُرا نامکلاڑی تھا۔ وہ کہنے لگا "بھائی بھے تو اب اس ماریفا سے بھی نشہ کم ہونے لگا ہے۔ میں تو اب سنکھیا چائنا شروع کر دیں گا۔"

"سنکھیا؟" عشرت حیرت سے بولا "سنکھیا سے تو آدمی مر جاتا ہے؟"

"ایک دن سے شروع کر دیں گا؟" اجمینو بولا "اور پھر خوراک بڑھاتے بڑھاتے بڑھالے جاؤں گا۔"

سکیا سب نشوں کا بادشاہ ہے۔ اور سچ پوچھ تو نشتے کی سراج وہ مقام ہے جہاں آدمی سانپوں کو سونا شروع کرتا ہے۔

”سانپوں سے ۱۰ عشرت کی انھیں حیرت سے چکی کی چکی رہ گئیں، ہم مذاق کرتے ہو۔“
 ”مذاق نہیں ہے۔ خدا کم زہریلے سانپوں سے میں نے کئی سادھوؤں اور فقیروں کو ڈسوانے دیکھا ہے۔ انہیں مرث سانپ کے زہر سے نشہ ہوتا ہے۔ بس اُس نشے کا جواب نہیں ہے۔ نشوں میں یہ عرفان کی آخری منزل ہے۔“
 ”سانپ کا زہر ۱۰ عشرت کا نپ اٹھا، انہیں اپنے لئے تو بس مار دیا کافی ہے۔ جو سات گھنٹے ایسا جاہلانہ ہوتا ہے کہ چنڈو کیا چیز ہے۔“

”اُن کو قواب اس سے بھی نشہ نہیں ہوتا۔“ ابھینو، سخی بھجار کے بولا۔
 اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عشرت دھڑا دھڑا باہر گیا۔
 ششاد ٹیلی فون کر رہی تھی۔

عشرت نے کہا ”راج تو کہیں باہر گئی ہے۔“

ششاد بولی ”کل مید ہے۔ ہمارے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ راج کی اور آپ کی۔ آئیں گے ناں؟“
 عشرت نے کہا ”مزدرائیں گے۔ آپ بلائیں اور ہم نہ آئیں۔ بھلا کیسے ممکن ہے؟“
 ششاد نے بولی ”راج سے کہہ دیجئے گا۔ اُسے میں دوبارہ ٹیلی فون کروں گی۔ اور ہاں دیجئے؟“
 ٹیلی فون پر اپنی آواز سنی کرتے ہوئے بولی ”ابھینو، میں کو نہ لائے گا۔ میں نے بس بہت کم لوگوں کو بلایا ہے۔“

”جی بہت اچھا۔“ عشرت نے رسد رکھ دیا۔

شمشاد خود تو اس قدر چالاک نہ تھی۔ لیکن اس کی داری آٹاں بہت ہوشیار تھیں۔ وہ راج لٹا ایسی نٹ کھٹ لڑائی کی حرکتوں کو پسند نہ کرتی تھی۔ وہ مفت لالہ پارک کے چمے منہ ملائے میں ایک خوب صورت غلیٹ میں رہتی تھی۔ اس کے ہاں ہمیشہ عید کی دعوت ہوتی تھی بھگمگی یا بھگد نہ ہو سکتا تھا۔ جو راج کی دعوت میں ہوتا تھا۔ اس نے اس دعوت میں صرف دس جوڑے بلائے تھے کوئی آدمی اکیلا نہیں آیا تھا۔ اور کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ ششاد کی داری اس کا خاص خیال رکھتی تھی کہ کسی ایسے آدمی کو نہ بلایا جائے جو غلطی سے اس موقع پر اپنی بیوی کو لے کے چلا جائے راج کے ہاں یہ بھی ہو جاتا تھا جس سے دعوت کی گر باگری میں خاوند سے ایسی حرکتیں ہو جاتی تھیں جس کا خمیازہ اُسے ابد میں بیوی کے سامنے بھگتنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں سے بے چاری بیویوں کو دودھ ہی رکھنا چاہئے۔

دادی آٹاں بہت بھد دار تھیں۔ اُنہوں نے ریاستوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ محل کے آداب جانتی تھیں آج کل کی لڑکیاں اسب گڈ نہ کر دیتی ہیں۔

اس دعوت میں فلم کے لوگ زیادہ تھے۔ مگر تین جوہری بھی تھے۔ ان کے ساتھ تین ہی کلاس کی بیرونیس بھی تھیں۔ راج لٹکے لئے یہ تین لوگوں سے اس طرح ملنا واقعی ایک اچھا ہمارا۔ لیجئے وہ ان لوگوں سے واقف تھو۔ مگر راج سے پہلی بار یوں ملنا ہوا کیوں کہ بظاہر یہ لڑکیاں اپنے آپ کو بہت لگے دئے رہتی تھیں۔ ان کی آمدنی یعنی فلموں سے آمدنی بھی زیادہ نہ تھی۔ اس نے راج بھگ نہیں مکتی تھی۔ کہ ان لوگوں کا پیش قیمت لباس قیمتی زیورات اور ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آتی

ہے؛ پیاری راج کنتی جلدی تم اپنے اخی کو بھول گئی ہو۔ سچ باتیں کون یاد رکھتا ہے۔ ایک ہی یہ لوگیاں بھی بام شہرت پر پہنچ کر بھول جائیں گی۔ آج یہ لوگ جلد و جید کر رہی ہیں۔ اور وہی ہتھیار استعمال کر رہی ہیں۔ جو کبھی تم نے کئے تھے۔ کتنا صدیوں پُرانا راستہ یہ ہے۔ کتنا آسان بھی ہے۔ ایک خوب صورت منہی اداؤں والی عورت کے لئے!

دعوت میں کسی طرح کا بنگاس بھی نہ ہوا۔ شراب کا اور بھی نہ پلا۔ جوہری لوگ اور دوسرے لوگ بھی ششاد کے لئے تھخے لائے تھے۔ ششاد کا دوست گلاب داس خود ایک جوہری کا لاکھ تھا۔ ظاہر ہے، کہ اس کے تھخے سب سے عمدہ تھے۔ مگر دوسرے جوہریوں کے تھخے بھی۔ کوئی کم شاد ار نہ تھے کوئی چھب کرنے کے لئے کوئی دقا قائم کرنے کے لئے۔ کوئی مستقبل کی طرف نگاہ رکھتے ہوئے ششاد کے لئے عمدہ سے عمدہ تھخے لائے تھے۔ اصلی بیروں کے زیورات۔ ان لوگوں کا تاج اور گرین میں کانٹ پلتا تھا لندن۔ شنگاگو اور نیو یارک میں ان لوگوں کے دفتر تھے۔ یہ لوگ بچی کے اصلی مالک تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مگراؤں پر کوٹ اور قمیص کے ٹیئوں پر لٹے بیرے لگے ہوئے تھے کہ ان کی قیمت اس دعوت میں شریک ہونے والی تمام بیرونیوں کے جھوٹی بنک بلیٹس سے زیادہ ہوگی۔ وہ صوفے پر اس طرح بٹھے تھے۔ جیسے وہ اس صوفے کے مالک ہوں۔ جب وہ پائے پیٹے تھے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پریشان کر رہے ہیں۔ جب وہ لوگ کسی کی طرف دیکھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس کے بھی مالک ہیں۔ جس کی طرف وہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کے جسم کی ہر ادا کتنی تھی! ہم مالک ہیں۔ ہم مالک ہیں:

ان لوگوں کی بہت اچھی بیویاں تھیں۔ جن کے ساتھ بہت پیارا پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بچے تھے۔ خوب صورت پیارے بچے جو اشرافی اسکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ یہ لوگ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان لوگوں کو اُن کے گھر میں اپنی پیاری جھولا بھولتی ہوئی بیویوں کے ساتھ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ کبھی ایسی دعوتوں میں شریک ہو سکتے ہیں یہ لوگ اپنے اچھے پر

چند نکلے ہوئے اس قدر پرتز باطل گنگا جل کی طرح شفات اور مغربے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ لوگ جو میوہیں مہی کے خدا تھے۔ مقدس تھے۔ اور ہر سوسائٹی میں پوجے جاتے تھے۔ یہ لوگ یہاں کیوں بٹے تھے جس کے پاس سب کچھ موجود تھا۔ پھر یہ زندگی سے کیا چاہتے تھے۔

سب کچھ کے بعد کچھ اور اس کے بعد کچھ اور ————— دیوتاؤں کا کیا اعتبار ہو جس کی نہیں شے کی؟ کیا تم کسی کو انسان نہیں بننے دو گئے۔

ہندو دیوالا میں کہتے ہی ایسے دیوتا تھے جن کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔ تو پھر آج کل کے لوگ کیوں خدا بنا پر ایویٹ دم رکھیں۔ گھر سے دُور، گھر سے باہر، ایک صاف ستھرا خلیٹ، ایک بھی جھانپنا ہندی۔ اُن کے حکم کے منتظر کا بادیوی روڈ، اور حمام اسٹریٹ کے اندازوں کے ہیں یہ فیشن میں داخل تھا۔ ایک بیوی اور ایک داشتہ۔ بہت سے بندے سینٹو جرسی فٹم کے جنسی تعلقات دُر کر سکتے تھے۔ وہ بھی ایک داشتہ پالتے تھے۔

فیشن!

ششاد کی دادی بہت خوش تھی، اب کی بچلی عید سے زیادہ تحفے آئے تھے۔ زیور کی چاقاں خزانہ کے ہوں گے۔ اکیلے سینٹو جسونت لال پارک نے چند ہزارے زیور دئے تھے۔ حالانکہ پچھلے سال اس نے صرف سات ہزار کا ایک بار دیا تھا۔ جسونت لال پارک کی طرف ششاد کی دادی نے غور سے دیکھا مگر سینٹو جسونت لال پارک کو بڑے آرام سے چائے پی رہے تھے جیسے کچھ ہوا نہیں۔ بے اس سنو کو کسی دن ٹیلی فون کرنا پڑے گا۔ دادی داس نے دل میں سوچا۔ میری بے بی بڑی بڑے قوت ہے اسے کچھ آجانا نہیں پس دیکھو اس وقت بھی کیا غم سے گلاب داس سے باتیں کر رہی ہے۔ اسے گلاب داس تو نکالی ایک جوہری کالا لکا ہے۔ مگر جسونت لال پارک تو کرسٹل ایسی ہی ایشن کے سکرٹری ہیں۔ بڑی احمق ہے۔ ایک دوسری توڑ کے نہیں دیکھتی سینٹو پارک کی طرف۔ بس گلاب کو دیکھ کر ہی مسکرائے جاتی ہے۔ نامہنی!

دعوت بخیر و خوبی ختم ہوئی۔ اب لوگ چلے گئے شمشاد نے راج اور عشرت کو روک لیا۔ وہی ماں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شمشاد نے دوسری کی بوتل کھولی۔

اس صبح جوئے فلیٹ میں بڑا سکون ہے۔ رنگ دم ہیں۔ پردے نظر نواز ہیں۔ تصویریں آرٹ کے بہترین نمونے ہیں۔ کتابوں میں عمدہ مصنفوں کی کتابیں بھی ہوئی ہیں۔ گلاب داس خوش ذوق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ عشرت نے سوچا۔ راج تلکے گھر میں۔ کتنی اذکار کی ہے۔ کپڑے ہیں تو شوخ۔ تصویریں ہیں تو ٹنگی۔ رنگ ہیں تو چھپتے ہوئے۔ اس کم ہفت راج کو کبھی عقل نہیں آئے گی۔

رات ۱۔

یہ رات کتنی صاف ستھری اور منگھٹ ہے۔ گویا ابھی ابھی لائٹری سے دُھل کے آئی ہے۔ اس کے سیاہ لہاوے سے کسی ہلکی ہلکی خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں۔ شمشاد نے صرف ایک ہلکی سی روشنی رہنے دی پھر اس پر بھی سک کا ایک مدال ڈال دیا۔ اب روشنی کتنی آہستہ سے چھپتی ہوئی آرہی تھی عشرت کو گورانیچہ کرنے لگی۔

شمشاد نے ریڈیو گرام پر مغربی ناچ کی ایک سسٹ ریکارڈ چھیڑ دی۔ شمشاد اور عشرت راج اور گلاب ہوئے ہوئے فانس کرنے لگے۔ کتنی خاموشی ہے شمشاد کی آنکھوں میں کتنی بلاغت ہے برقی ناچنے کو نہیں ایک دوسرے کے جسم میں جھل جاتے کو کہہ رہی ہے۔

پرمگیت ختم ہو گیا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔

شمشاد راج کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ ہر کمرے میں صرف عشرت اور گلاب داس رہ گئے۔ دونوں ہوئے ہوئے دوسری چیتے رہے۔ گلاب داس کے چہرے پر ایک عجیب طنز یہ مسکراہٹ تھی۔ عشرت کی آنکھیں شے سے سرخ تھیں۔ دونوں ہوئے ہوئے خاموشی سے دوسری چیتے رہے ایسے لوگوں میں کچھ کہنا بے کار ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ششاد اپنی خواب گاہ سے باہر آئی۔ مگر راج اس کے ساتھ باہر نہیں آئی ششاد اُن دونوں کے سامنے آکے بیٹھ گئی۔ اُس کا گلاس خالی تھا۔ عشرت نے اس کے لئے گلاس بنایا۔ ششاد نے ایک گھونٹ پی کے کہا " اندر راج آپ کو بلاتی ہے۔ عشرت گلاس ہاتھ میں تھامے اُٹھا۔ اور ششاد کی خراب گاہ میں چلا گیا۔ اس نے سوچا، اب میرے فرائض سرانجام دینے کا وقت آگیا ہے فرض فرض ہے۔

راج ایک بیڈ پر نرم دراز حالت میں تھی اپنی جاسنی رنگ کی ساڑی کے مٹلا پتھر سے کیمل رہی تھی عشرت اس کے قریب آکے بیٹھ گیا۔ راج نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، اُس کے ہاتھ میں یاقوت کی ایک خوبصورت انگوٹھی چمک رہی تھی، جو عشرت نے اس سے پہلے نہ دیکھی تھی۔ یہ انگوٹھی بے عشرت نے پوچھا۔

" ششاد نے مجھے دی ہے۔ دی نہیں ہے۔ مجھ سے بدل لی ہے۔ میں نے اُس کی انگوٹھی۔ اور اس نے میری انگوٹھی پہن لی ہے۔ آج سے ہم دونوں ہمیں بن گئی ہیں پہلے ہم دوست تھیں، مگر آج سے بہنیں ہیں "

" مبارک ہو "

کچھ عرصے تک خاموشی رہی۔ راج پھر اپنی ساڑی کے پتھر سے کہنے لگی۔ آخر وہی " ششاد ہمیں چاہتی ہے۔ " کیا مطلب بے عشرت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

" بس کتنی کی آج تم اس کے پاس رہ جاؤ "

" تمہارا مطلب ہے : عشرت نے بڑی حیرت سے پوچھا " جس طرح تم نے انگوٹھیاں بدل لی ہیں اُسی طرح "

" ہاں " راج نے مسکرا کے کہا " میں گلاب داس کے ساتھ جاؤں گی، تم یہاں رہو گے "

”عمر میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ تم — یہ — کیسے بے غصے کے مارے عشرت کے منہ سے
 کچھ اور نہ نکلا۔“

ذرا فک ایک رات میں کیا ہوتا ہے ؟ راج نے اپنے بچے کیلئے ہوئے کہا۔

یہ کہ ہے۔ کہ عشرت نے راج سے شادی نہ کی تھی۔ پھر بھی وہ اسی طرح رہتا تھا۔ جیسا کہ وہ
 اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہوا۔ وہ اسی طرح اس کا دفا دار تھا۔ دل سے اور روح سے۔ اور حالات سے
 بھی۔ کسی طرح سے بھی اس نے کسی دوسرے طریقے سے نہ سوچا تھا۔ وہ چاہتا تو اور مرد مر جا سکتا
 تھا۔ جیسے کہ اس کے احوال میں دوسرے لوگ کرتے تھے۔ اور اُسے ہرگز بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اس
 قدر ہٹ کر اس گنہ گار کا ایک حصہ بن کر بھی وہ اس صحت نہ گیا تھا۔ وہ کمزور تھا، بُرا تھا، لالچی تھا
 یہ بھی سچ ہے کہ وہ راج سے دلی محبت نہ کرتا تھا۔ وہ خود ہیروئن کی طرح اس سے نجات پانا چاہتا تھا۔ مگر
 کہو عرصے سے اس نے ہیروئن کے خواب بھی دیکھنا بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ اپنی قیمت پر تعلق
 تھا۔ راج پر تعلق، شراب پر تعلق، اچھے لباس پر تعلق اور مار پیسے کے انجکشن پر تعلق۔

پھر بھی وہ بدکار نہ تھا۔ اس وقت جب راج نے اس کے سامنے یہ تجویز کی تو کہیں کسی کو نے میں کڑی
 ہوئی ہر رفت کے دو آنسو اس کی آنکھوں میں کھسک آئے۔

راج نے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال کے کہا: ”دیکھو میں خدا سی بات کے لئے اپنی بہن کو کیسے بھلا
 کر سکتی ہوں۔“

عشرت اس قدر احمق تو نہ تھا کہ کچھ نہ بوسکتا۔ ایک چہرے جھوٹے لمحے نے اس کے
 ارد گرد کے غل کو بچہ میں سے شق کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے حقیقت اس کے سامنے آگئی تھی ایک
 لمحے میں گویا راج نے اپنے بڑے ہوئے پالش شدہ ناخنوں سے اس کی روح کے لہاوے کو
 تاننا کر دیا تھا۔ اور اُس نے بالکل ننگا کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو اس طرح دیکھنے لگا کہ اسے اپنے

جہد سے غرت ہو گئی۔ وہ کس لئے کیا تھا۔ کن اربانوں اور ندوں کو لے کر بجی میں وارد ہوا تھا۔ کس طرح سے جہد جبر کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر اس نے کس طرح جہد جبر کو ختم کرنے کے لئے ایک چھوٹا آرام دہ راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا کہ جہد جبر کا کوئی آرام دہ چھوٹا راستہ نہیں ہے۔ جہد جہد محنت جانکاہ طویل اور جاں گرازا ہوتی ہے۔ اس میں غلغلہ بھی ٹھوکانا پڑتا ہے۔ اور ملت کبھی کبھی اتنا سببا ہوتا ہے کہ ناہئیں تو ناہئیں اُن سے دیکھتے ہوئے تھک جاتی ہیں۔

مگر صرف ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا۔ دوسرے لمحے میں اس نے حتمی اُنھیں بند کر دیں ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ پھر یہ رات کتنی حسین ہے۔ کتنی نرم اور کداز۔ منہ نہیں سرگوشیاں کرتی۔ صبح سو جاؤ۔ زندگی نام ہے سو جانے کا۔ اُنھیں بند کر لینے کا۔ جی، اُنکی خود گی آئینہ سستی نے کہا ہوں ہانہوں کی گولائی میں اپنے آپ کو محسوس کر لینے کا۔ ایک نئے جسم کی پکار سننے کا۔۔۔ آج تو سو جاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ یہ رات گزر جانے دو۔ کل سے وہ پھر جہد جبر شروع کرے گا۔ بعد ازاں کو اور تشاؤ کو اور ہیتم کے بے حواہ پنے اور بے حدیچے ماحول کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دے گا۔ پھر سے زندگی کا ایک نیا باب شروع کرے گا۔

مگر آج تو سو جاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ ایک رات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک درازی بات تو ہے بیکار محنت کو ارفیا کے الجھن کی محنت ضرورت محسوس ہوئی۔

جب آدمی محنت نہیں کرتا ہے تو وہ اپنی زندگی میں یہ جان چاہتا ہے۔ راج کا خیال تھا۔ وہ عشرت سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ لیکن جب تشاؤ نے اس کے سامنے یہ سوال رکھ دیا تو راج کو فیصلہ کرنے میں ایک منٹ نہیں لگا کسی طرح کی اُداسی، گھٹن، دہ پریشان کن استہجاب جواسے اس موقع پر محسوس کرنا چاہئے تھا۔ اس نے کچھ بھی محسوس نہ کیا اس بات پر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ دوسرے لمحے میں اس کے سامنے مجھ میں ایک سختی ہی زندگی۔ اور اس نے باطل نئی نگاہوں سے

گلاب داس کی طرف دیکھا اور منہ ہی جذبے کی بجگانی لہریں اس کے رگ و پے میں دوڑتی چلی گئیں۔ عشرت ٹھیک تھا۔ بہت عمدہ اور پیارا تھا۔ مگر یہ چیز باطن بھی تھی۔ اس میں کتنا متحول ہے، بلکے یہ متحول! موٹر گلاب داس اور راج کو لئے ہوئے جو ہو کی پڑیج سڑک پر دوڑنے لگی۔

مگر جب ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ اور عشرت واپس نہ آیا تو راج کو تشویش سی محسوس ہوئی۔ اس نے شمشاد کو ٹیلی فون کیا۔

”کیا بات ہے۔ عشرت کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں بالکل ٹھیک ہے؟“

”تو پھر وہ آیا کیوں نہیں؟“

”یوں ہی۔ شمشاد منہسی؟“

”یوں ہی کیا؟ راج نے ذرا خفا ہو کے پوچھا۔

”میں نے سوچا۔ کیوں؟ وہ ہفتے بھر کے لئے یہاں ٹھہر جائے۔ اس میں ہرچیز ہی کیا ہے؟“

”ہفتے بھر کے لئے؟“ راج ٹیلی فون پر چنچی۔

”چلاؤ نہیں بہن؟“ شمشاد نے ٹیلی فون پر راج کو مشورہ دیا۔ عشرت کا کبھی یہ خیال ہے۔

”بہن ہی خیال ہے؟“ راج نے غصے میں دوہرایا۔ ”منہ شمشاد تم وہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں؟“

”مگر؟“ شمشاد بولی۔

مگر راج نے یہی فون بند کر دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے کمرے میں غصے سے چیخ رہی تھی۔

”بھینو، ہشکر، چچا اور“۔۔۔ تم سب کہاں مر گئے؟“

تھوڑی دیر میں خاندان کے آٹھ دس افراد، اور پانچ چھ نوکر اور نوکرانیاں راج کے گرد آئے۔

راج ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے غصے سے ہڈی ہل رہی ہے۔

اس نے پاؤں فرش پر زور سے مار مار کر کہا۔

”جلدی سے گاڑی نکالو۔ سو رکے پھر!“

جب گاڑی ماہم کے کازوے پر سے گزر گئی۔ تو راج نے پھر پاؤں پیچ کر اپنے غلام شکر سے کہا۔

”گاڑی تیز کیوں نہیں چلاتے؟“

”چالان ہو جائے گا۔“

”ہو جانے دو۔“

”کوئی آدمی نیچے آجائے گا۔“

”آہلے دو۔ مگر گاڑی تیز چلاؤ۔“

یہ دو دن راوی اماں کے لئے بڑی مصیبت کے دن تھے۔ اپنی پوتی کو وہ کیسے بھائے گا۔ اب اس کی پختہ دل ہے۔ اور اس کے تھنلو۔ نالائق۔ و فرشتہ کو گھر میں رکھنے کی بات بالکل ہی اور ہرجائی ہے۔ بھر بھی اس نے بد بارشاد کو بھایا۔ مگر شاد تو ایسے خوش تھی۔ جیسے اُسے کوئی نیا کھلونا مل گیا ہو۔ وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھی۔ اس نے راج کا ہیرہ مار لیا تھا۔ جسے شکر نے اس کوئی دیر یا سلطان کو مارتا ہے۔ وہ جیتی ہوئی بازی کو ادھی ہوئی بازی میں کیوں کر تبدیل کر سکتی تھی۔ پھر پھر شکر نے وردہ کو اُسے بتایا تھا کہ کس طرح وہ اُسے چاہتا ہے۔ شکر ہی سے چاہتا تھا۔ مگر حالات نے اُسے ایسا مجبور کر دیا تھا کہ راج کے ہاں رہتے ہوئے وہ محبت کا لفظ منہ پر نہیں لے سکتا

تھا۔ کس طرح عشرت نے اس کے قدم چھو لئے تھے۔ جیسے وہ زہرہ کی دیوی ہو۔ اور گلاب داس کیسے اکٹھے اس سے بات کرتا تھا۔ وہ اس کے روپے اور جواہرات کی بھوکی نہیں تھی۔ وہ جیسے میں خود شہر اسی ہزار کافیا تھی۔

گلاب داس کیسے اس پر حکم چلاتا تھا۔ جیسے شہزاد ہندوستان کی اقل درجے کی بیرونی نہ ہو۔ اس کی متوجہ نہ جاگیر ہو۔ لنگا۔ اب وہ اسے مزہ کھا دے گی۔

لیکن راج کے آئے سے وہ ڈر بھی رہی تھی۔ بڑی تیز ہے۔ جانے کیا کیا کہے گی۔ بھو۔ تو بات بھی نہیں کی جائے گی۔ اور وہ تو ایک منٹ میں مجھے ہزار سلواتیں منادے گی۔

اور راج کی حالت جب وہ شہزاد کے گھر پہنچی یہ تھی کہ اگر اس وقت شہزاد کی خوش قسمتی سے اس کی دادی اماں ڈھانگہ روم میں بیٹھی نہ ہوتیں۔ تو وہ شہزاد سے بات کرنے کے لئے زبان کے بجائے چپ سے کام لیتی۔ اس قدر اُسے غصہ تھا۔ اس کا لڑکا اور کوئی دوسرا بچے لڑکے کی طرح اسے اب ہر سی طرح سے باگ پکڑتی تھی۔ وہ عشرت کو بازو سے پھڑکرا پنے گھر لے جائے گی۔ یہ بھی نہیں گئی میری چیز کو کن مجھ سے چھین سکتا ہے۔ واہ! ایک دن کے لئے اُدھار دیا۔ اور آپ الگ ہی بن نہیں۔ مسلم ہوتا ہے۔ اخلاق تو دنیا میں رہ ہی نہیں گیا ہے۔

راج اسی طرح جتنی بھنی کڑا متھی کو سنی ہوئی جب ڈھانگہ روم میں آئی تو دادی اماں کے دیکھتے ہی اس کی جلاں میں بے لگتیں۔ اور اُسے گھر سے لگا کے روئے گئیں۔ دادی اماں بڑی ہی ایک زبردستی کشی اور زمانہ ساز تھیں۔ زمانے نے انہیں اور انہوں نے زمانے کو بیت اپنی طرح سے دیکھا تھا۔ وہ تو اتنی کو ایک نظر سے دیکھ کر بتا دیتیں کہ اس وقت اس کے دل میں کیا ہے۔ شہزاد راج کے آنے سے گھبرائی ہوئی تھی۔ راج غصے سے اپنے نبوش دھواں میں نہ تھی۔ دادی اماں کے دماغ میں یہ بات باطل صاف صاف تھی۔ جنگ کا نقشہ انہوں نے اپنے سامنے ذہن میں کھینچا لیا تھا۔ ادا دیا

وہ اس کے مطابق کام کرنے لگیں۔ کچھ بھی ہو جائے۔ عشرت کو واپس راج کے ماں بااں ہی پڑے گا
 کہاں عشرت؟ کہاں گلاب داس۔ ایسا امیر سرمانے دار سٹوڈنٹ کہاں ملے گا۔ شمشاد کی عقل پر تو پونے
 بڑ گئے تھے۔ گرداوی اماں نے دنیا ابھی طرح دیکھ رکھی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ اس دنیا میں کوئی جنت
 نہیں کرنا ہے۔ لوگ جنت سے کہتے ہیں۔ جیسے باکی سے فٹ بال سے کیلا جاتا ہے۔ اس کیل کے
 بھی اصول ہوتے ہیں۔ اور اب شمشاد این اصولوں سے انحراف کر رہی تھی۔ شمشاد کو ہوش میں لانا ہی
 پڑے گا۔ سچی جنت میں لاکھوں کی کمائی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آ سکتی ہے۔ عرو
 سے عمدہ ٹیٹ کیسے خریدے جاسکتے ہیں۔ آدی کو جنت نہیں کرنی چاہئے۔ جنت سے کیسا پاپا ہے
 محبت کا کیل بہت عمدہ ہے۔ دل کا روگ بہت بُرا ہے۔ اور شمشاد بڑی بھڑائی لڑکی تھی۔ عشرت کے
 آنسوؤں نے اُسے رام کر لیا تھا۔ داوی اماں جانتی تھیں۔ مگر شمشاد نہیں جانتی تھی۔ کہ عشرت کا کیل
 کیا ہے۔ وہ اپنا کیل کیل رہا تھا۔ داوی اماں ایک پویشیا دکھلا ڈی کی طرح اُسے نظروں نہیں کٹی
 تھیں وہ اگر عشرت کی حالت میں ہوتیں تو غالباً یہی کرتیں۔ ان کے ذہن میں عشرت کے لئے تعریف
 کے کئی پہلو مضمی تھے۔ مگر انہوں نے ان دونوں میں عشرت پر باطل کچھ غلام نہیں ہونے دیا۔ انہوں
 نے اس سے بات بھی نہیں کی۔ اس کا آداب بھی قبول نہیں کیا۔ بہت بُری بات تھی۔ لڑکا حسین
 تھا۔ خوب مُرد تھا، مسلمان تھا۔ اچھے گھر نے کا تھا۔ مگر امیر متا تو داوی اماں کو کوئی اعتراض بھی
 نہ ہوتا۔ مگر۔۔۔۔۔!

داوی اماں نے پہلے تو راج کی بلائیں لیں۔ پھر رونے لگیں۔ پھر آنسو پونچھ کر کہنے
 لگیں: ”یہ شمشاد کی طرف اشارہ کر کے، یہ تو چچی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ تم دونوں۔ تم دونوں
 سیلیوں کی چھ سال کی دوستی اور بہنا پا گیا ایک مرد نے کے لئے قربان کیا جاسکتا ہے؟“
 اسی بات پر کچھ بھی حیرت ہوئی اماں ”راج داوی اماں کو اپنا ہم خیال پاپے بہت خوش ہوئی“

اس کا بوجھ بدل گیا۔ ہماری دوستی پر تو ساری فلم انڈسٹری رشک کرتی تھی۔ مگر بہنوں سے بھی زیادہ ہم میں محبت تھی۔ سو کبھی ساتھ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا سب اکٹھا۔ اور اب یہ بچائیک... راج نے شکایت آمیز چخ ہوں سے تشاد کی طرف دیکھا۔

تشاد کی نگاہوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولی ”میں کب کہتی ہوں تمہاری سہیلی نہیں ہوں؟“
”عشرت کہاں ہے؟“ راج نے تشاد سے ڈپٹ کے پوچھا۔

”اندر بیڈروم میں ہے۔“ تشاد نے ذرا گہرا کئے کہا۔

”اے رجنے دو۔“ داوی آاں نے بڑے میٹھے میٹھے میں کہا ”بہدی آپس کی گفتگو میں اُسے رازدار بنا لے۔“
”جی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ جو فیصلہ کریں گے وہ ہم لوگ آپس میں بات چیت کر کے طے کریں گے۔“
”اُسے صبح میں بولنے کا کیا حق ہے؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ راج بولی۔

”تو تو اس کے لئے مجھے مجبور دے گی۔“ راج نے تشاد سے پوچھا۔

تشاد نے کہا ”یہ میں نے کب کہا ہے۔ میں نے ٹیلی فون پر یہی کہا تھا۔ کہ ایک دین اور ایک ہفتے میں کیا فرق ہے۔ یوں پلک جھپکتے میں گزر جائے گا۔“
”مگر مجھے منظور نہیں ہے۔“ راج ذرا سختی سے بولی۔
”اور مجھے بھی داوی اماں نے کہا۔“

تشاد نے دلکھی ہو کر کہا ”مگر میں زبان دے چکی ہوں؟“
تشاد نے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔

”اُس سو کر میرے سامنے لاؤ۔“ راج غصے سے صوفے پر سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ مگر داوی اماں نے ہاتھ بچر کر اُسے واپس بلا لیا۔

”اُس پر غصہ نہ کرو۔ یہ مردوے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ انہیں بتائی مٹی رہے۔ یہ بہت خوش رہتے ہیں۔ عشرت کی بات جانے دو راج۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے۔“
 ششاد نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے۔“
 ”تو عشرت کو میرے حوالے کر دو۔ بس۔“

”مگر میں وعدہ کر چکی ہوں۔ اور پھر مجھے اس سے محبت بھی ہو گئی ہے۔“ ششاد بولی۔
 ”مگر تم تو مجھے اسٹوارٹ! —————؟ راج نے فقرہ ناتمام رہتے دیا۔
 ”ہاں۔ مگر ————— یہ بھی چلے گا؟“ ششاد آنکھوں میں آنسو لاکے بولی۔

”محبت وغیرہ کچھ نہیں ہوتی اسے۔“ دادی اماں نے راج سے کہا۔ ”بس کسی وقت میری طرح کی خند آجاتی ہے اسے۔ میں تو اسے خوب جانتی ہوں۔ اچھی طرح سے۔۔۔۔۔ لے اب دونوں سیلیاں گچھلے بل جاؤ۔ بل جاؤ۔ بل جاؤ۔“

دادی اماں نے راج اور ششاد دونوں کو پچھڑا کر ایک دوسرے کے گلے سے لگا دیا۔

گلے لگتے ہی دونوں سیلیاں خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے لگیں۔ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔ روتے روتے ششاد نے کہا ”جانیاں میں نے تیرے ساتھ بڑا دھوکہ کیا، بائے اپنی سیلی کے ساتھ دھوکہ کیا؟“

راج سکتے ہوئے بولی۔ ”تو تو میری جانی ہے شمو۔ میں تو عشرت کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ مگر تیرے بغیر نہیں۔“
 ششاد نے ایک سگریٹ سلکا کے راج کے منہ میں رکھا۔ بولی ”لے جا، لے جا۔ تو اب عشرت کو لے جا۔“

راج ششاد کی بلائیں لے کے بولی ”نہیں جانیاں۔ تجھے اگر اچھا لگتا ہے۔ تو تو رکھ لے میں کیا اتنی گنتی گری ہوں کہ اپنی سیلی کے لئے خدایا قربانی بھی نہ دے سکوں۔“

تھوڑی دیر کے بعد وادی آٹاں نے عشرت کا سوٹ کیس بند کر کے اسے رنجنا کے ہمراہ کر دیا۔ اس سے پہلے ہی وہ راج کو کہہ چکی تھی چپکے سے کہ وہ رنجنا کے آنے سے پہلے ہی شمشاد کو اپنے گھر لے جائے تاکہ معاملت میں آسانی رہے۔ چنانچہ جب رنجنا عشرت کو لے کے گئی۔ اس وقت گھر میں وادی آٹاں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ عشرت سے نہ راج لی۔ نہ شمشاد۔ عشرت کے پاؤں تلے جتنی زمیں تھی وہ سب کی سب وادی آٹاں نے کھسکا لی تھی۔ اور اب عشرت کو سہارا لینے کی عادت چڑھ چکی تھی۔ اس نے رنجنا کا ہاتھ پکڑ لیا رنجنا کا اپنا دوست سنتوش کمار پندرہویں روز کے لئے پڑا گیا ہوا تھا۔ جب اُسے وادی آٹاں نے بتایا کہ عشرت اور راج کی آپس میں ہل گئی ہے۔ تو اس نے اس سوتھے سے قائمہ اٹھاتا مناسب سمجھا۔ اور پھر عشرت کس قدر حسین تھا۔ کئی دفعہ پارٹیوں میں رنجنا نے راج کے ساتھ اُسے دکھایا تھا۔ یونانی دیوتا کی طرح مضبوط اور گھٹا ہوا۔ اس نے کبھی رنجنا کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھا بھی نہ تھا۔

اس کتاب ————— اب ۹ —————

رنجنا کے بھائی پراطینان اور استقام کی مکلاوٹ آئی۔ اُس نے عشرت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا: ”اؤ“ مگر جب وہ عشرت کو لے کے اپنے گھر پہنچی تو اس کی خادمہ نے اسے بتایا۔ کہ اس کے جانے کے بعد پڑنا سے ٹرنک کال آیا تھا۔ اس کا دوست آج رات کی گاڑی سے واپس آ رہا تھا۔ خادمہ نے ٹیلیفون کا پیغام لے لیا تھا۔

اب رنجنا کیا کرے۔ پسینہ اس کے ماتھے سے چوٹے لگا۔ سنتوش کمار بڑا ظالم تھا۔ وہ اس سے بہت ڈرتی تھی۔ رنجنا نے عشرت کو بتایا۔

”نہیں۔“

”تو پھر میں کہاں جاؤں؟ عشرت نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔

”جہنم میں جاؤ!“

راج نے ٹہلی نون رکھ دیا۔ بچا ایک اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک عرصہ ہوا عشرت سے امت پائی تھی۔ وہ اُسے ذرا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں اور دماغ میں محبت تو کیا۔ نعمت کا ایک مشابہہ تک نہ تھا۔

عشرت نے اپنا سوٹ کھین اٹھایا۔ ڈرائنگ روم سے باہر برآمدے میں آیا۔ برآمدے سے پورچ میں آیا۔ پورچ سے باہر سڑک پر آیا۔ سڑک سُفساف تھی تاریکی گہری تھی۔ وہ دیر تک پتلا رہا، ان کے ہر دگر و کوئی فاصلہ نہ تھا۔ کوئی منزل نہ تھی۔ اور جب راستے میں راہ گیروں نے اُسے دیکھا، تو ڈھکے ماسے پیچھے ہٹ گئے۔ کیوں کہ آج عشرت کے پاس کوئی چہرہ بھی نہ تھا۔ آج وہ موت کی طرح چل رہا تھا۔

کھٹے ہی مہینے گزر گئے۔ اکرم کو کوئی دیا سام نہ ملا جسے وہ اپنے خیر کو بڑی طرح بھروسہ کر سکتا۔ یہ نہیں اس کے لئے اس قدر بحیف وہ کیوں ہے۔ بہت سے لوگ بلا اکثرہ میٹر لوگ اس کی غیم اندیشی میں اس طرح گھومتے تھے جیسے انہوں نے اپنے اپنے سائی ٹس کی طرح اپنے خیر کو بھی آپریشن کر دے کے بھٹوایا ہوا کسی دوسرے طریقے سے ان کا مدد نہ کر سکیں اس کی بجائے انہیں اسکتا تھا۔ وہ خود بھی کیوں نہیں اپنے خیر کا آپریشن کر دیتا۔ ایسے تو وہ بھوکا رہ جائے گا۔

اور اب تک وہ بھوکا مر گیا ہوتا اگر وہ اپنی بہن کے پاس رہتا نہ ہوتا۔ رشیدہ بھی طرح اسی رو پے میں پورے مگر کر چلائی تھی، اسے بھلا اوقات حیرت ہوتی تھی۔ یہ صبح ہے کہ اب نفیس اور صیب رشیدہ کے دونوں بڑے لڑکے اخبار نیچے لہام کرتے تھے۔ مگر زندگی گویا موت کی صدوں کو چھو کر گزرتی تھی اس کی زندگی کی کسی تیز دھار ہے۔ ذرا سچا چوکی، قدم پہلا چند ماہ کی طالت یا چند ماہ کی بے روزگاری اور آدمی غائب۔

نا پرل میں آج دیوالی کی بہار تھی۔ قلموں کی عجیبی نقل آسان پر سلجھائیوں کی اڑتی ہوئی ڈلوانوں کی بہار اُچھلتے کودتے، پٹانے چھوڑتے ہوئے پکڑوں کی پچھڑ پھارتا ہی رہتی تھی۔ اسے دیوالی بہت پسند

نہی مگر آج تو ایک سو مچی خریدنے کے لئے اس کی جیب میں پیسے نہ تھے۔ نفیس ایک عرصے سے بیمار تھا۔ کسانسی اور بخار جو جاتے ہی نہ تھے۔ ڈاکٹر نے بہت سے انجکشن اور دوائیاں تجویز کی تھیں، اور شدید کئی دنوں سے اکرم بے کمرہ رہی تھی۔ کبھی ایک فترے سے، ایک شمارے سے، ایک طاعت کیوں کہ وہ بہت کم برقی تھی اور اگر اپنے بجائی سے نہ کمرہ نکلتی تھی۔ اسے زندگی سے لانا تو خوب آتا تھا مگر وہ اپنے بجائی سے ایس طرح نہ لاسکتی تھی۔ نفیس کو بہت تیز بخار تھا، اور وہ بخار میں دوا ہی تباہی تک رہا تھا۔ ڈاکٹر کا پیلاہن پاس روپے کا ہو گیا تھا۔ اس نے رشیدہ کی ہمت نہ بڑھائی تھی کہ ڈاکٹر کو بلاوے، اور پھر وہ دوائیاں اور انجکشن اس نے لکھ کر دے تھے وہ کہاں سے لائے گی۔ لیکن ہے ڈاکٹر صاحب خود کسی طرح سے آیا تھا۔ مگر من ڈاکٹر کے آجانے سے تو اس کا لاکا اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے دوا بھی تو چاہئے۔ اکرم بھی خوب بہتا تھا۔ مگر بے بس تھا۔ اتنے دنوں تک وہ کوشش کرتا مگر کہیں سے اسے کام نہ ملا۔ نہ کوئی رقم اور دوا ہی ملی۔ آج دیوالی کے روز سینہ باخڑا نے انداز غایت اسے کچھ رقم دینے کا وعدہ کیا تھا، اور اسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بہت جلد کوئی اس کے ڈھنگ کی تصویر شروع کرنے والے ہیں اور اکرم بوٹھی ڈائریکٹ کر سکے گا۔

اکرم بہت خوش ہوا تھا۔ سینہ باخڑا نے دیوالی کی خوشی میں سارے شام کو بونس بانٹا تھا اور شام کے وقت چند خاص خاص لوگوں کو اپنے آٹس میں دھکی پھینے کے لئے بلایا تھا۔ اکرم بھی انہیں خوش قسمت لوگوں میں سے تھا۔ سینہ باخڑا اپنا پراہنگ تھا۔ سینہ بگت لال، چمکھڑے، جوئی جی، میڈم راج، شمشاد، سینہ کٹر چند بھی رات اور بالہ فاس اسٹر۔

دیر تک دھکی جیتی رہی۔ دیر تک رات بھر رہی۔ دیر تک ہر سماج میں ہی سماجوں میں اڑتی رہی۔ ایک بیہوشی ہوتی تھی کہ طرح وہ اس رخصت سے اس رخصت اور اس جام سے اس جام اور اس احمد سے اس احمد تک اڑتی رہی۔ اکرم ہار پیتا رہا۔ ضرورت سے زیادہ پیتا رہا۔ چنیے سے زیادہ پینکٹا رہا۔ مگر اس سے نہیں اندہ کی اندہ بکاتا رہا۔ اس کے گھٹنوں میں ایک مسند تھا۔ ایک سال تھا۔ سال پرنگے ہم تھے

کسی نے دائیں رکھ دی۔ دائیں کے سروں سے سر نہیں سوسکے نوٹ جھٹکتے تھے اور ان جہوں پر بچے جاتے تھے
 تھے کہ وہ جہان نوٹوں سے باہر چپ گئے۔ پھر وہ نوٹ اوپر اٹھتے اٹھتے ایک نیزہ بن گئے۔ نیزہ کے اوپر چنڈا تو
 ہشس کھینے لگے۔ تاش میں کوئی عجم، بادشاہ، کیک نہ تھا۔ ہر تاش کے پتے پر عجیب سے لوگوں کی تصویریں تھیں۔
 کوئی پیراؤنڈا چلا رہا تھا۔ کوئی سڑک کٹ رہا تھا۔ کوئی کڑا نہیں رہا تھا۔ کوئی انجن چلا رہا تھا۔ کوئی کپڑے سی رہا تھا۔
 کوئی سیٹ بنا رہا تھا۔ کوئی پھول اکا رہا تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ کسی کی آنکھیں غائب تھیں۔ کوئی
 ہسپتال میں پڑا میسج رہا تھا۔ کوئی مرگٹ کو جا رہا تھا۔

مگر جو کھیلنے والے ہاتھ تھے بڑے خوب صورت، مخروملی اور حنائی پوری لگے ہوئے تھے۔ کسی
 کی انگی میں دوڑے سونے کی مروانی انگوٹھی میں نعلی ہلال شہر تھا۔ کسی کی کلائی میں سونے کی زنجیر تھی یا ہیرے
 کا نگین تھا۔ کسی کی پٹنکلیاں میں ہیروں سے بڑی ہوئی انگوٹھی تھی جس کے درمیان میں ایک گڑی لگی ہوئی تھی۔
 وہ ہاتھ تاش کو اٹھاتے۔ نہر سے میز پر رکھتے

کٹ !

ٹرن !

چلو۔

پتے دوسرے دوسرے پھینکے جاتے اور کوئی ہسپتال چلا جاتا۔ کوئی پاس خانے۔ کوئی مرگٹ کو
 کوئی کارخانے کو، اور کوئی ڈاک خانے کو۔ کوئی پتہ سڑک پر کھڑا ہو کے بیک اگنے لگتا۔ کچھ کسی کوئی خوبصورت
 انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ اٹھاتا۔ خاکہ ایک طرف ڈال دیتا۔ ۱۱۔ برنسٹن کراپنے ساتھی۔ کتنا میرے پاس ایک
 پر کرا گیا ہے۔

بکمر نے بیت بلیٹی تھی اس نے پنا سرہ پا۔ اپنی انھیں پہنائیں۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا
 کہ وہ میز کے دتر میں بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے ہوشی جی کا سسٹنٹ بیٹھا ہوا اور میٹھا ہوا اس کی طرف بک

رہا ہے۔

”میں کہاں ہوں؟“ اکرم نے پوچھا۔

”سیٹھ کے دفتر میں“ بیٹا پارو نے جواب دیا۔

”سیٹھ کہاں ہے؟“

”سیار جیل پر“

”مگر مجھے اُن سے _____ انہوں نے مجھ سے دوسرے _____“ اکرم غامض

ہو گیا۔ اس نے اُمّی کی کوشش کی، مگر اس کی نا اہلی نے اسے جواب دے دیا۔ بیٹا نے اپنی جگہ سے اٹھ کے اسے سہارا دیا، جب کہیں وہ پٹنہ کے قابل ہوا۔

باہر کے بیٹا نے کہا: ”آپ کی وجہ سے آج میری دیوالی حرام ہو گئی۔“ آپ آنکھیں

پلی پتے ہیں۔

”کیوں کہ اس ہائش ماکسمل مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔“

”تو مت دیجئے۔“

”آنکھیں کیسے بند کروں۔“

بیٹا نے بڑا سامو بند بنا کے کہا: ”جو شئی جی کہہ گئے تھے۔ میں آپ کو گھر بنیادوں اب بارہ بج چکے

ہیں اور مجھے“

”تمہیں دد“ اکرم نے کہا: ”میں خود گھر چاہاؤں؟“

”یقیناً؟“

”یقیناً!“

بیٹا اکرم کو چھوڑ کے چلا گیا۔ پرل سے گزرتے ہوئے اکرم نے سوچا: آج وہ پھر غلام ہوا

اپنی بہن کے گھر جا رہا ہے۔ آج وہ ہر کیلے گا۔ کیا کہے گا۔ کیا کہے گا۔ . . .

گر رشید بہت کچھ جانتی تھی۔ نہ صرف اپنے بھائی کو بلکہ اپنے بھائی کے ابو و گرد کی زندگی کو۔ اسے اتنا کچھ معلوم تھا۔ جب ہی وہ خاموش رہتی تھی۔ بہت سے لوگ بہت سی باتیں کرتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔ بہت سے لوگ کچھ نہیں کہتے اور سب کچھ جانتے ہیں۔ ان کی خاموشی حماقت نہیں ہوتی ہے۔ اس نے جب اپنے بھائی کو اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو اسے بڑے کے آگے بڑھے دیکھا اس نے جب اُس کے سوتے ہوئے چہرے اور اس چہرے پر ہنسی برتی آنکھوں کو دیکھا تو وہ خاموش رہ گئی۔

اکرم نفیس کے سرانے کے فرش پر بیٹھ گیا۔ نفیس کپڑا اٹھائے اور سر موڑ دیا۔ وہ اپنے بیٹا تھا۔ اکرم نے اپنے بالوں میں انگلیاں پیر کے بڑی تلخی سے کہا: "بیٹو نے مجھے اتنی دھکی پلا دی کہ اس سے بچنے کے لئے ماری دوائیں اور سامنے الجھنیں آسکتے تھے۔ مگر اس نے مجھے دھکی پلا دی اور بچے نہیں دئے۔ رشیدہ میں کیا کروں؟"

رشیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے نفیس کے سر پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ نفیس مردہ پڑا تھا۔

اکرم نفیس کی طرف دیکھا۔ دیکھا۔ دیکھا۔ دیکھا۔ اور اس کے دل میں صرف یہ خیال آیا کہ اگر وہ رشیدہ کے سر پر بار نہ دیتا۔ اگر وہ غصہ نہ کرتا تو آج نفیس نہ مرنے لگا۔ وہ رقم جو اس کے کمانے پہنچے اور روز قزو کی ٹرام کے کمانے پر خرچ ہوتی تھی وہ رقم نفیس کی بیماری پر رشیدہ خرچ کر سکتی تھی۔ تو کبھی رشیدہ نے ایک لفظ زبان سے نہیں سنا۔ ایک روپیہ۔ ایک اٹنی۔ ایک چوٹی۔ ایک دوٹی کر کر کے رشیدہ نے نفیس کی ساری زندگی اکرم پر خرچ کر دی۔ ہر لمحہ اس نے نفیس کو جلتے ہوئے دیکھا۔ اور ایک دفعہ ہی اس نے

اکرم کاس گھر میں آتے ہوئے نہیں روکا۔ کسی یہ اس کی بہن تھی؟ اکرم سہارا بن سہے پاؤں تک پہنچ گیا کیسا اس کا بھائی تھا؟ اگر کسی طرف سے وہ اس گھر سے چلا گیا ہوتا۔ اگر اس نے کہا تھا انکا اپنا ہوتا ٹرام اور سٹل۔ کرتب نہ دینا ہوتا، تو آج نفیس زندہ ہوتا۔ کبھی کبھی تو رشیدہ کے سامنے باطل واضح طور پر یہ کیفیت آئی ہوگی۔ یہ تباہی کیفیت یعنی ایک طرف اکرم ہے۔ دوسری طرف نفیس ہے۔

ہائے جلاواں! ہائے جلاوہ بھائی۔ ہائے جلاوہ زندگی! تم دونوں کو زندہ کیوں نہ رکھ سکیں؟ یہ کیسی زندگی ہے۔ خوراک۔ کراہ۔ بجلی۔ پانی۔ چیزوں سے چیزوں سے پھر چیزوں کی طرف واپس آ جانا اور بچ میں انسان کو غائب کر دینا۔ ایسے جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جیسے جیسے اس کے لئے نہیں تھیں۔ وہ چیزوں کے لئے تھا۔

یہ ایک اکرم کی زبان پر نہک کا نائقہ آیا۔ ہاں۔ یہ ایک آنسو تھا جو اس کے رخسار سے بہ کر اس کے بوٹوں کی راہ سے زبان پر آ گیا تھا۔ مگر کس قدر تلخ اور تلکین! اکرم نے سختی سے اسے جھٹک دیا نفیس کے سر پر چادر اڑھا دی اور خود باگنی میں جا کے کھڑا ہو گیا۔

دوسرے دن جب وہ اور رشیدہ صیب اور جمیل۔ نفیس کو دفن کر کے لوٹے تو اکرم نے اپنا سوٹ کیس بند کیا اور اپنا بستر باندھنے لگا۔ اس کی بہن خاموشی سے کھڑی رہتی رہی۔ بستر باندھ کر اکرم نے ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھالیا۔ بستر باندھ کر پڑا لیا۔

اس کی بہن نے اسے روکا نہیں۔ وہ اس کے ساتھ دو دروازے تک گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ میرزا بھائی جا رہا ہے۔ کل میرزا شا گیا۔ آج میرزا بھائی جا رہا ہے۔ میں اُسے روک نہ سکی۔ میں اسے بھی روک نہ سکوں گی۔ روکنے کے لئے بھی انسان کے پاس کچھ چاہیے۔ رشیدہ نے سوچا۔ جہاد سے پاس اگر کچھ ہے تو بھائی بھی کچھ ہے۔ وہ ایک خوب صورت جذبہ ہے۔ ایک پایا رانشہ ہے۔ اور اگر کچھ نہ ہو تو بھائی ایک بہت بُری عادت ہے۔

اکرم نے سوچا۔ کچھ بر تو بہن ایک پھول ہے۔ نہ ہر تو ایک آنسو ہے۔

دونوں بھائی بہن خاموشی سے دروازے تک گئے۔ جب اکرم دروازے سے باہر نکلے گا تو رشیدہ نے اسے روک کر اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔ اور جلدی سے اندر آ کے دروازہ بند کر لیا۔ اکرم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے آنسو روک سکے، مگر نہ روک سکا۔ وہ وہیں بند دروازے کے باہر کھٹکا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دروازے کے اندر اکرم رو رہا تھا۔ دروازے کے اندر رشیدہ رو رہی تھی۔ دونوں کے بچہ میں زندگی سفید کنٹین کی طرح کھڑی تھی۔

ہارون بی روڈ کے مرکزی ایمپلائمنٹ ایجنسی کے باہر چنے والے کے پاس اپنا سوٹ کیس اور سترکہ کر
 کم دفتر میں داخل ہوا۔ اب اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ غم کا کام نہیں کرے گا بلکہ کوئی دوسری
 نوکری اختیار کرے گا۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری جو کچھ مل جائے گی وہ اُسے کر لے گا۔ یہی سچا کرہ ایمپلائمنٹ
 ایجنسی میں عرضی گزارنے آیا تھا۔ یہاں ایک کلرک اس کا پہلے سے واقف تھا۔ اس نے کام آسانی سے ہو گیا وہ
 جانے کتنے دن گئے ایک عرضی گزارنے میں۔ کلرک اسے دفتر کے بڑے باورے بلا کے کہیں میں چلا گیا۔ بڑا باور
 ان لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنی اہمیت کا احساس ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے اور جن سے حکومت کے سیکرٹریٹ کے
 سیکرٹریٹ بھرے پڑے ہوتے ہیں۔

بڑے باورے اپنے گننے سر پر ہاتھ پیرا اپنی نیوٹل کی سی موٹھوں کو سنوڑا۔ اپنی سفید قمیص کی سیاہ
 بڑکھیک کیا اور کاسٹ کرکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹے جانیے" بڑے باور کے ہچے سے صاف
 ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اس نے جالیا ہے کہ تم میرے اسسٹنٹ کے واقف کار ہو۔ وہ... بڑے باور نے
 دو چار غلام نکالے۔ وہ ایک کپ اٹائے سیدھے گئے۔ اور پھر وہ اٹھا کر میزنگ کی سی آواز میں کہا "آپ

”میرا مطلب ہے، وہ کوئی بیباک نہیں ہے جس سے ساج کو غامد سمجھتا ہو۔ جیسے بڑھئی ہے،
 بیلنگ ہے، مقدس ہے، کلرک ہے، انجینئر ہے“

”میں بھی ایک انجینئر ہوں روحوں کا، ایک تدریس ہوں اخلاق کا، ایک بیلنگ ہوں ساج کا،
 ایک بڑھئی ہوں تخلیق کا“

بڑے باور نے سزلا کے اس طرح کہا جیسے کسی دیوانے سے ان کا واسطہ پڑا ہو۔ مشترکاً اگر تم
 میرے اسٹنٹ کی معرفت نہ آتے ہوتے تو میں تمہیں ابھی کڑے کڑے عطا دیتا، تم خواہ لڑنا میرا دوست
 ضائع کر دے ہو۔ میں کہہ چکا ہوں، ہمارے ہاں شاعر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر تم اس کے
 علاوہ کوئی ڈھنگ کا کام چاہتے ہو تو بولو۔ میں ابھی تمہاری عرضی داخل کرنے کو تیار ہوں“

اکرم نے میز پر دستکار کے کہا ”میں شاعر ہوں۔ میں بطور شاعر اور ادیب کے اس ملک سے اپنی
 مددی طلب کرتا ہوں“

”تو بڑے طلب کرتے رہو۔ میں تمہاری ضرورت نہیں ہے“
 ”اگر ضرورت نہیں ہے تو کمالی داس کا نام کیوں پیتے ہو؟ نیگلا نے غالب کی تحفیں کیوں چاہتے ہو؟
 ٹیکسٹر ایڈیٹر چند کا نام فخر سے کیوں پیتے ہو۔ ناشائے ادب گورکھ کی کے سامنے سر کیوں جھکاتے ہو۔ تم بے
 بتاؤ۔ یہ چہلاداس کیسا ہے؟ یعنی جب تک غالب زندہ رہا، تم نے اسے مجھوڑا مارا۔ جیل میں سٹرا۔ لیکن جب
 وہ مر گیا، اس کے بعد تم نے اس کی تصویر اٹھا کے ڈاک کے ٹکٹوں پر چھاپ دی۔ اگر تمہیں اس کی ضرورت نہیں
 تھی۔ مگر اس بے کوئی مفید کام نہیں کیا تھا تو کیوں چھاپی؟ جواب دو“

بڑا ابو کر سی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے زور سے گھٹنی بجاتی کہ ایک کے بجائے دو تین چپڑی اور
 وہ ایک کلرک اندوڑے روڑے آئے۔

بڑے بابہ نے اکرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اے بابہ بھال دو“ پھر اس نے اکرم

سے کہا۔ ”اے عسکر تم پاگل خانے میں جا کر اپنے داغ کا علاج کراؤ۔ پھر یہاں آنا۔“ بھاری عرضی نے وہ جھوٹا جب وہ دفتر سے باہر نکلا، بلکہ جب اُسے نکال دیا گیا، تو اکرم کو احساس ہوا کہ اس نے کسی غلطی کی تھی۔ وہ گیا تھا کام کی تلاش میں، غلہ خزانہ بڑے بابو سے مل گیا تھا۔ مگر اکرم نے سوچا۔ یہ نکتہ ہے جس کے لئے دوڑ کر گئے تھے۔ یہ شاعروں اور ادیبوں والی بات۔ آخر ہم لوگ کہاں جائیں۔

اکرم نے ابو مراد کو دیکھا۔ اُسے وہ چنے والا کہیں نظر نہ آیا جس کے پاس وہ اپنا سوٹ کیس اور بستر رکھا گیا تھا۔ اُس نے ابو مراد کو نظر ڈالنا ہی بڑی مشکل کے بعد اُسے چنے والا دو پولیس کے آدمیوں میں بگڑا ہوا سر پہنے کی فوٹری اور ہاتھ میں سوٹ کیس اور کندھے پر بستر اٹھائے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اکرم بھاگ کر اس کی جانب گیا اور مڑ پراسے پکڑ لیا۔

چنے والے نے اکرم کو دیکھ کر بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ بولا۔ ”یہ پولیس والے مجھے چوری کے الزام میں پکڑ کر لے جا رہے تھے۔ میں نے لاکھ کہا، آپ اندھ گئے ہیں دفتر میں۔ مگر یہ ماننے نہیں۔ بولے پھر تمہارے اب میں تمہارے جلد ہاتھ بنگلوں کی کراپے تم آگئے۔“ اُسے اپنا سوٹ کیس اور بستر دراب ۳۰ پکڑا ہوں۔ آگے کسی کی مدد نہیں کروں گا۔ میلانی کا زمانہ نہیں ہے۔“

اکرم نے اپنا سوٹ کیس اور بستر بنگلہ ابو مراد کی طرف ہر لیا۔ آج رات تک سے رہنے کے لئے کہیں نہ کہیں بگڑا ہوا نہ ملے گی۔

شام کے پانچ بجے وہ لال باغ میں تھا۔ لال باغ سے وہ فیروز آبادی محلہ پر پریل کی طرف روانہ ہوا۔ پریل پہنچ کر اس نے فٹ پاتھر پر کھڑے ہو کر سامنے کی بڈنگ کی طرف دیکھا جس کے ایک کمرے میں اُس کی بڑی بہن رہتی تھی۔ اس کے دل میں بڑی شقت سے یہ خیال ابھرا۔ کیوں نہ وہ واپس چلا جائے اپنی بڑی بہن کے پاس۔ پہلا ہی شقت اور سختی سے اس نے اس خیال کو اپنے دل میں دبا دیا۔ نہیں وہ واپس نہیں جائیگا۔ اب وہ آگے جائے گا۔ کہیں پر غور اپنے لئے جگہ تلاش کرے گا۔ وہ اپنی بہن کی غریب

میں اور نادر زندگی پر غم نہیں توڑے گا۔

ہاں مگر یہاں پرل کے فٹ پاتمہ پر کھڑے کھڑے گریا اس کی نا اچھیں اور اس کی ہمت سب
جوب دینے لگیں۔ جاؤ۔ جاؤ۔ کوئی اس کے دل میں کہنے لگا۔ بار بار کہنے لگا۔ سامنے کی بلڈنگ میں چلے
جاؤ۔ وہاں ایک کمرہ ہے۔ ایک باگنی ہے۔ باگنی میں بستر بچالو آرام سے نا اچھیں پیار کے سوجاؤ۔
سوجاؤ۔ . . . سوجاؤ۔ . . .

اکرم نے یکایک سامنے کی بلڈنگ سے موڑ پھیر لیا، اور آگے والد کی طرف چل کھڑا ہوا۔ چلتے
چلتے وہ والد کے ڈاک خانے تک پہنچ گیا۔ یہاں فٹ پاتمہ پر باسن کا ایک گنا پڑ تھا۔ اکرم نے سستانے
کے لئے ہاتھ سے سوٹ کیس زمین پر رکھ دیا اور خود بستر پر بیٹھ کر اپنے لمبے سے مہینہ پر بخنے لگا۔

اتنے میں ایک اور بزمی حرکت پاؤں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے ڈالے۔ ہاتھوں کی
انگلیوں پر چاندی کی بے شمار صوفی بڑی انگوٹھیاں پہنے اس کے پاس آئی اور بولی "یہاں ایک خط تو
لکھ دو"

اتنا کہہ کے اس حرکت نے ایک پوسٹ کارڈ اس کے حوالے کیا۔

اکرم نے اپنی جیب سے اپنا پراانا تعلیم چھلا "کیا کھوں اماں؟"

"اب کیا بتاؤں بیٹا، کیا کھو" وہ حرکت اپنے اچھے پر ہاتھ مار کے بولی "میری تو قیمت
ہی پھوٹ گئی۔ کھواگ سگائی اپنے حناؤں سودھرا میں کی تھی، مگر کھوانے یہاں جو دھما سے شادی کر لی"
"جو دھما کون ہے؟"

"میری بہو ہے۔ مگر مرنچی ہے۔ تو گزی لاٹنگ والی ساڑی پہنتی ہے۔ نہ میں اس کی بات

کھوں نہ وہ میری بات سمجھے۔ دن میں دس بار تو لڑائی ہوتی ہے اور بعد میں بات کچھ نہیں بھلتی۔ معلوم
ہوتا ہے اس نے میری بات غلط سمجھ لی ہے یا میں نے غلط سمجھ لی تھی۔ اب کیا کروں، کھوا اپنا بیٹا ہے۔

اُدھر سو دھڑکی پوری بھی اپنی بڑائی کی تھی۔ اُدھر دھڑکی تو لگ کھڑا کر جات باہر کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔

”کیوں؟“

”کہتے ہیں اُس نے کیوں جات باہر شادی کی۔ بیٹا اب یہ تو بڑا شہر ہے، بھئی۔ یاں تو بھانت بھانت کے ملاوڑ میں رہتی ہیں اور ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ہاں تو پتہ نہیں چلا کون دھڑکی ہے۔ کون نائی ہے۔ کون ہمارے۔ اب۔۔۔۔۔ جس دھڑاک نائی کی بیٹی ہے۔ ہماری تو ناک ہی کٹ گئی۔ جانے کھوایا کبے گا۔۔۔۔۔“

”کھو کون ہے؟“

”اُسے میرا گروا ہے۔ اُس نے تو کھوایا سگائی اپنے دوست چنگن کی لڑکی اگتھی سے کر دی تھی۔ جب تو دونوں گھٹنوں پہنے تھے جب ان کی سگائی ہوئی تھی۔ کھو اب بے بہتہ بیٹا تھا بیٹا، اس لئے میں اُسے چھوڑ کر سیاں اپنے بیٹے کے پاس آ رہی۔ کھو تو یہ سُن کے بہت خفا ہو گا۔ وہ وہاں سو دھڑکیں گاڑی بیٹا ہے میرا کھو، اور اتنی گاڑی جیٹا نہیں ہے جتنی خود بیٹا ہے۔ وہ اس وقت ہوتا تو میری چڑی اُدھیر کر رکھ دیتا۔ گلاب میں کیا کروں۔ جو ہر چہ وہ ہو چکا۔ اب تو ایک ہی صحت ہے کہ کھو کے چھوٹے بھائی دھو سے گتھی کی سگائی کر دی جائے۔ میری تو کچھ ادھ بھو میں نہیں آتا۔ کیسے اس سگائے کو پٹھاؤں۔ تم ہی بتاؤ بیٹا۔“

”تو میں کیا کھوں اس خط میں؟“ اکرم نے پوچھا۔

”بس یہی کچھ کہہ دو جو میں نے بتایا ہے۔“ وہ محنت بڑی مصمصیت سے بولی ”وہ تو خوف ہیں گے کون سی دھائیں لگتی ہے۔“

خیر اکرم نے اپنی تحریر میں شارٹ ہینڈ اور خود بین دونوں کے اوصاف بلا کے کسی نہ کسی طرح سے وہ خط لکھا۔ اتنے میں وہ محنت چلا چڑی۔ بولی ”اُسے یہ تو میں بھول ہی گئی۔“ وہ کھواسے بکھڑا کر

اکرم نے کہا "آئندہ سے احتیاط کروں گا"

دعویٰ نے اسے اپنی دعویٰ کے بغیر ایک آزاد خیال کے اے دیا۔ بولی "میرے حجاب سے دو پیسے ہونے تھے مگر تم اپنے دس کے مسلم ہوتے ہو اس نے دیا آگنی۔ رام رام"۔
 "رام رام" اکرم نے جواب دیا۔

اکرم نے کئی کی طرف دیکھا مسکرایا۔ سامنے ڈاک خانے کے باہر لوہے کا جھگڑا تھا جس کے پیچھے دیوار سے لگے ہوئے بانگ کے پیڑوں کی ٹالیاں لوہے کے جھگڑے پر سایہ کئے ہوئے تھیں۔ جھگڑے کے باہر دیوار پر سائے کے نیچے ایک ٹائپسٹ اپنے سر کے اوپر چھتری کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک ٹول پر ٹائپسٹ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ ٹول پر اوپر بھی دوسرے کاغذ تھے۔ پوسٹ کارڈ۔ مٹی آڈر فارم۔ رجسٹری کے فارم پارسل کے فارم اور اسی طرح کا ڈاک خانے سے مطلق سامان۔ اکثر و بیشتر ڈاک خانے میں آنے والے لوگ آن پڑے ہوتے تھے۔ اس نے ڈاک خانے کے باہر اسی قسم کے لوگوں کی اشد ضرورت ہوتی تھی۔ اس نے ان لوگوں کا رخصت اچھا پلٹا تھا۔

ڈاک خانہ اب بند ہونے والا تھا۔ ٹائپسٹ کے پاس اس وقت کوئی کام بھی نہ تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بائیں کمرے کے پیچھے آیا۔ اکرم کی طرف رخ سے دیکھ کر بولا "تم اپنے موقع پر آئے۔"
 "کیا مطلب؟" اکرم نے چونک کر کہا۔

"زیادہ ہوشیار نہ بنو" ٹائپسٹ نے کہا "میرا تھلا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ میں ٹائپسٹ ہوں۔ تم خط لکھنے والے ہو۔ مگر یہ یاد نہیں پڑے کیسے چاکر رام بھروسے مر گیا ادب اس کی جگہ خالی ہے؟"
 "رام بھروسے؟ جگہ خالی؟ میں سمجھا نہیں" اکرم نے بڑے غلغلے سے پوچھا۔

ٹائپسٹ نے خدا کی خدا اکرم کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر اُسے تعجب پر گھبرا کر اکرم رام بھروسے کو بائیں نہیں جانتا ہے۔ بولا "میرے غلطی ہوئی۔ میں نے سمجھا نہیں کسی نے یہاں یہاں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس بائیں کے

پڑ کے نیچے دم بھر دے جیتا تھا۔ وہ کسی مرگیا۔“

”کیا ہوائے اکرم نے پوچھا

”فاقے مرگیا۔ اکیلا ہوتا تو فاقے سے کہی نہ مڑتا۔ یہاں خطا کھنے کا جو کام ہے۔ اس

میں آپ ایک بڑے کنبے کا فرج نہیں چلا سکتے۔ ایک دو ہوں تو کام چل جاتا ہے۔ رام بھر سے کیڑی

تھی۔ سات بچے تھے۔ فاقے سے تو مرنا ہی تھا اُسے۔ غلط تو نہیں اتنے پیسے کہاں سے کما سکتا ہے؟

تم اکیلے ہونا؟“

”ہاں!“

”کہاں ٹھہرے ہو؟“

”ٹھہرنے کا ابھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔“

”تو پھر میرے ساتھ باقی کلمہ میں۔“

”کہاں؟“

”وہاں جھونپڑیاں ہیں۔ ہم لوگ دس باہ آدمی ہیں۔ تین جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ سب

ہل کے فرج چلاتے ہیں۔ مڑے میں رہتے ہیں۔ قبلانام کیا ہے؟“

”اکرم“

”مسلمان ہو؟“

”ہاں“

”کوئی بات نہیں۔ میرا نام جہنوت ہے۔“ ہاتھ پٹے ہاتھ دھو کر اپنے آگے بڑھایا۔

اکرم نے مصافحہ کیا۔

جہنوت نے کہا: میں گجراتی ہوں۔ مگر ہماری جھونپڑیوں میں ہندو، مسلمان، سیک، پشاور

گجراتی۔ مڑھے پنجابی سب ہی طرح کے لوگ رہتے ہیں ” پھر وہ ہنس کر بولا ” وہاں جگہ اس قدر تنگ ہوتی ہے۔ روشنی اس قدر کم ہوتی ہے۔ غریبی اس قدر گہری ہوتی ہے کہ چھوٹ چھات ایک قسم کی مباحثی سی معلوم ہوتی ہے، جب سوتے میں ایک کی ٹانگ دوسرے کے سر پر اور دوسرے کا سر تیسرے کی ٹانگ پر رکھا ہو تو مذہبی اختلافات کو قائم رکھنا نڈا مشکل ہوتا ہے۔“

اکرم نے پوچھا ”تم کیونٹ ہو؟“

”ہاں“ سمونت نے سر ہلایا اور پھر اس کے قریب آکے کہا ”مگر کسی سے کہنا نہیں بیٹا ہم ایسا ہے کہ اپنی روزی کمانے کے لئے ڈاک خانے والوں کی اور پولیس والوں کی دونوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ میں نہیں سب بتاؤں گا۔ مگر بھائی اگر انہیں یہ پتہ چلے گا کہ میں اس طرح کے خفیہ رکھتا ہوں تو پولیس والے دوسرے دن ہی ڈنڈا مار کے مجھے اس جگہ کے آڈے سے نکال دیں گے۔ روزی سے بھی جاؤں گا۔“

”میں بھلا کیوں کہوں گا“ اکرم نے بڑے زور سے سر ہلایا۔

اکرم کو بانی کلمہ کی جھوڑیوں کا آؤہ بیت پسند آیا۔ اس کے مقابلے میں اس کی بہن کا ایک کمرہ آج محل تھا۔ لیکن یہاں جو چیز بہت عمدہ تھی وہ یہ کہ ان جھوڑیوں میں رہ کے آدمی سوجھ بوجھ نہیں سکتا اس سے نیچے سطح پر بھی کوئی معاشرت ہو سکتی ہے۔ نہایت تنگ و تاریک چھوڑیاں تنگ آکر وہ ٹھین کی ہیں۔ مذکورہ روشن دان مذکورہ کڑکی۔ ایک تنگ سا دروازہ جس میں سے آدمی سر جھکا کے گزرے گھٹنوں کے بل چل کے گزرے تو ادھی پچھلے قتلہ اندازہ چھوڑیوں کے بسلوں کے درمیان ایک تیزی تیزی کی گئی جیسی باجیہاؤم کے وقت آگے ہوئے تھے۔ جن کے گرد مرد و عورتیں بچے بڑے و جوان عریانی کے مختلف درجوں میں بنے ہوئے حقانی رہے تھے۔ ناش کھیل رہے تھے بنگریزوں

سے مکمل رہے تھے یا دال بچل رہے تھے۔ شہر اور گورنمنٹ متعلقہ ایسی۔ پانی لانی پچاس جھونپڑیوں میں ایک جھونپڑیوں کے اندر فرشس کچا اور سیٹا ہوا۔ برسات میں مین کی چھت نہیں ملتی تھی فرش پکنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی فرش کے اندر کھینچا گیا رہا ہے۔ اور کچی مٹی کے نیچے زور مار کے اچر محل آتا چاہتا تھا۔ اور اکثر اوقات لایا بھرا ہوا تھا۔ فرش میں اس طرح کچڑ کے بلبلے پھونٹے دکھائی دیتے تھے کہ بار بار مٹی ڈالتے تھے یہی فرش کی سلیں نہ جاتی تھی۔ اس تمام ننگ و تاریک، بدبودار فضا میں انسانی سانس اور پینے کی گھٹی باس چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی جو اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ اس بستی میں طشوا ایک ایسی غیاثی ہے جو سیال کے کینوں کو تیر نہیں۔ اس نے ان جھونپڑیوں کے اندر سے جوبہر ایک دفعتاً ٹھنکی تھی وہ باہر نہیں جاتی تھی۔ میں جھونپڑیوں میں اس باس اور گرد و مٹائی رہتی تھی۔ بچی آبادیوں سے اور مرآتے ہوئے اور اس بستی کے چاروں طرف پانی آبادیاں تھیں۔ ایک طرف یہی منظر کوشالہ ایشیٹن اور نیرنگ آت اندھا کے آٹھ منزلہ کوارٹر۔ دوسری طرف پانی کڈا ہزار کے عالی شان مندر اور دو لائیں۔ تیسری طرف جہاں چال کی بلند بالا عمارت کئی ایکڑوں کا پھیلی ہوئی اور چوتھی طرف امیر پروار خوجوں کی مسلمان بستی اسیڑی میں جھونپڑیوں کا قلعہ۔ گویا ایک طرح سے بالکل شہر کے مرکز میں اس کے دل میں ایک تاریک زخم کی طرح چھتا ہوا۔ اس قلعہ کو ظاہر کرتا ہوا جس میں ایک طرف عمارتیں۔ اونچی سے اونچی ہر کر آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں، تو دوسری طرف اتنی نیچی ہو جاتی ہیں کہ زمین کے پھنسے لگ جاتی ہیں۔ ایک طرف تھوڑی سی لٹین اور ایک کڑھنڈا ہوتی ہے کہ سامنے میں لپٹیں ہی کٹنے لگتی ہیں اور دوسری طرف اتنی متعلقہ اور بدبودار کہ ایک کی مٹ بھی جاتی رہتی ہے۔ ایک طرف نہانے کے آب دو دوسری طرف پیشاب کے جوہر۔ ایک طرف دولت کے انبار دوسری طرف گڑھے کے۔ اور یہ قلعہ اس قلعہ امیر اور گھاناؤ نامہ کہ بہت سے سیاست دانوں اور شہر کے نیک آدمیوں نے مشہور دیا تھا کہ ان آدمیوں کو گھاریا چاہئے۔ اور یہ تجویز برطانیہ مقبول تھی۔ کچھ میں آئے دانی تھی۔ یعنی آفے کو جلاؤ

یہ ساری نغابہ دار تاریکی، سیلین، گمشدہ خود بخود فنا ہو جائے گی۔ ایک دھندلوں نے کوشش بھی کی تھی۔
 وہ ایک بار یہ اُڑے خود بھی مل گئے تھے۔ مسلسل جہازوں میں مڑتی ہوئی پرانی کڑائی کو خود بخود گنگ
 لگ گئی تھی۔ اور جھونپڑوں میں جب آگ لگ جائے تو کچھ نہیں بچتا۔ جتنے پختے پڑنے بستر اور چھتیلے
 کڑائی کے صندوق ہوتے ہیں وہ جل جاتے ہیں۔ نیم کے درخت بھی محفوظ نہیں رہتے۔ لوگ کہتے ہیں
 کہ فرش کی مٹی اور مٹی کی چھت تک جل جاتی ہے۔ کچھ نہیں بچتا۔ اور کوئی کچھ اپنی جان بچانے کے سوا
 کچھ بچانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کیوں کہ کسی کے پاس ہوتا ہی کیلے ہے جو بچایا جائے۔ اول تو ایسے
 موقعوں پر ناز و برکتیلا انجن نہ تو بلایا جاتا ہے۔ نہ خود آتا ہے۔ اگر آجی جائے تو اسے اس پاس کی بچی
 عمارتوں کو محفوظ کرنے کے کام میں لگا دیا جاتا ہے۔ ٹھیک بھی ہے۔ مناسب بھی ہے۔ رواج بھی ہے۔
 دستور بھی ہے۔ مگر ایک بات جو ان یقینوں کے جتنے سے مجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ اگر فرض کریں بچی بالی نکلا
 کی بستی جلداری جائے تو دو تین دنوں میں یہ بستی یہاں سے ہٹ کر اٹھکے کے قریب نمودار ہو جائے گی۔
 اٹھکے سے جلا دیجئے تو یہ پلٹ کر کولابے میں نمودار ہو جائے گی۔ وہاں سے جلا دیجئے تو اہم میں غلوسر
 آجائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بستی شہر نہ ہو ایک بہت بڑا جم ہو جس میں جگہ جگہ بڑے پنسیاں
 دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ایک جگہ کے پھوٹے کو دوا لگا کر جلا دیجئے پھر پھوٹا کسی دوسری جگہ نمودار ہو جائے
 گا۔ وہاں سے جلا دیجئے کسی تیسری جگہ سے رہنے لگے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصور پھوٹے کا نہیں
 ہے، اندر کا خون خواب ہے۔ اور جب تک اندر کا خون صحت نہیں ہوگا، گلے شڑے پھوٹے یہ ساری
 میلی پنسیاں اُٹھتی رہیں گی۔

اکرم جب بستی میں داخل ہوا تو اسے یہ سب باتیں ایک دم دھیان میں نہیں آتی تھیں۔ یہ
 تو وہاں سسل رہنے سے آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں گھس گھس گئیں۔ لیکن تاریکی اور گمشدگی کے احساس کے
 ساتھ ساتھ سب سے بڑی بات جو اس نے اس وقت ملاحظہ کی وہ اس کی ناک کی تیز حس تھی۔ اُسے

وہ ہیں۔ ”فضل رام پر ہنسنے لگا۔ ”یہ بھی کیسی ڈھائی ہو رہی تھی؟“

جسوت نے کہا۔ ”نہیں۔ یہ بے چارہ تو دوسرا دکان خانے کے باہر خطا لکھا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ ایک بڑا عیاصیت اپنی منہی ہوئی آواز میں چلائی۔ ”اس بستی میں ایک اور پڑے گئے آدمی کی مرضیت بھی تھی۔“

یہ ہڈی مورت جتنا تھی۔ اپنے زمانے میں ایک مشہور طوفان تھی۔ اب گوشہ نشینی اختیار کر کے اس بستی میں زندگی کے آخری دن پورے کر رہی تھی۔ اس کی جھونپڑی، جیسا کہ اکرم کو بعد میں معلوم ہوا، بستی میں سب سے عمدہ تھی۔ فرش سینٹ کا تھا اور ساری بستی میں اسی ایک جھونپڑی کا فرش سینٹ کا تھا۔ مگر بنابے حد گنہگار تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے اپنی جھونپڑی میں اپنے اپنے وقتوں کا دوسرا مکان رکھا ہے۔ اس نے فرش پر سینٹ کر رکھا ہے۔ تاکہ کوئی فرش آسانی سے کھود نہ سکے۔

”اس کی ضمانت کون دے گا؟“ پتہ قدمو سے کہا جو ملاحظہ تھا اور قریب کی چھائوں میں

۲۴ کرتا تھا۔

جسوت ہلا۔ ”میں دیتا ہوں۔ ابھی تو اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم میرے حساب میں گھولنا۔ آج شام سے تو اس نے ۲۴ شروع کر لیا ہے۔ دس باہر اند میں سے دے گا۔ اسی پرے حساب میں گھولنا۔“ ایک موٹی بھلی گرمی ہوئی آواز نے بند بانگ ہو کر میں چلا کے کہا۔ اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بعد میں آواز آئی تھی۔ ”اکرم بھئی! دھر دیکھنے لگا۔ ایک نوا آوی چوٹ سے ادھماکتا ہوا۔ بڑے بڑے فنگر ٹپے سیاہ بال اسے پرچکائے ہوئے سر تک نکلا۔ کمرے کے نیچے ایک دھوئی پہنے ہوئے۔ ہاتھیں پانی کی باہی نے اس کے قریب کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”اے تم ستیلے؟“ اکرم اپنی جگہ سے اٹھا۔

ستیلے نے اُسے گلے سے لگایا۔ اور پانی کی باہی زمین پر گر کر اس طرح غائب ہوا

جیسے اُس کے سامنے بستی کے دو چار آدمی نہ ہوں۔ دس بارہ ہزار کا مجمع ہو۔ ” دوستو! یہ سارے کوی ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا سارے ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا کوی ہے۔ یہ نظم ڈاکٹر کٹر بھی ہے۔ آں۔ کیا سمجھے؟ ہندوستان کا سب سے بڑا نظم ڈاکٹر کٹر۔ سب سے بڑا۔ سب سے بڑا۔ سب سے نیک۔ سب سے پیارا۔ فریبوں کی مدد کرنے والا۔ فریبوں کی بچی، صحیح زندگی دکھانے والا نظم ڈاکٹر کٹر آپ کے درمیان کھڑا ہے۔ دوستو! شرم کا مقام ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ دیش۔ یہ ہمارا واجبہ دامن مومین دانتے اور سوامی بدھ بھاند کا دیش۔ ہمارا تھاکا مذہبی اور جواہر لال نہرو کا دیش (اور مجھے یہ صاف صاف کہہ کر کرم صلات ہے، یہ ہمارا عمرانی اور شرکت ملی کا دیش ہے۔ منت ہے ہم پر۔ ایس کہ ہم ایسی ہستی کی تعداد نہیں کر سکتے آں؟“

ستیا رائے نے اس طرح گفتگو کرتے پھلا کر چہرہ کانوں تک شرم کر کے چاروں طرف دیکھا۔ جیسے کسی کو کچا جاپانے کا۔ اس کے بعد اس نے بھاؤ چاروں طرف گھما کر کرم پر ڈال دی۔ گویا سپر ڈال دی اور بڑی نرمی سے اس سے مخاطب ہوا ”مگر تم نکرہ کرو۔ میرے بھائی تم یہاں شوق سے رہو جب تک قبل ازاجی چاہے۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ ان حرام زادوں کو۔ یہ جو نظم اڑا شری پر اس وقت قبضہ کے بیٹھے ہیں۔ ان سب کو پھینچ کر باہر نکال دوں گا۔ مگر میرا طریقہ دوسرا ہے۔“

اس کے بعد ستیا رائے رک گیا اور اپنا ایک ہاتھ ہوا میں اونچا کر کے بولا ”مجھے — مجھے وہ کیا سمجھے ہیں۔ آج میں اس گندی بستی میں ہوں۔ مگر ایک دن دکھاؤں گا کہ میں ستیا رائے بھائی نہیں رہا ہوں۔ پھس کا تہیہ کیا ہوتا ہے۔“

”ارے بھائی“ باہرام لڑک نے جو دھوے کے ساتھ میں بیٹھا تھا اوروڑے ہل میں ہی اسٹینٹ سیکشن میں ٹوک تھا احتجاج کرتے ہوئے کہا ”خود کو تو حلال دیتے ہو۔ میں بھی تو کھانی کھاتا ہوں۔“

اپنے چھوٹے بھائی کنک سے ملاؤں گا۔ کنک راز میرا چھوٹا بھائی ہے۔ جو جب تک جیت نہ کر رہا تھا۔ اگر مرنے محسوس کیا کہ چھوٹے بھائی کے ڈاکٹر من جیت کی آواز میں غرور سا آچلا تھا۔ ”کنک تیرا یہاں میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے۔ دو سال میں ڈاکٹر بن جائے گا۔ بڑا ڈاکٹر! میرا کنک راز میرا چھوٹا بھائی۔ میں اُسے کبھی یہاں آنے نہیں دیتا۔ تو راکر اُس سے ملنے کے لئے ہوشل میں جاتا ہوں۔ اگلے اتوار کو تمہیں لے چلوں گا“ جیسے من جیت کبہرا بڑا فکر نہ کر تو مکی میرا چھوٹا بھائی ہے۔

من جیت نیکی ٹھانسی تھا اور خدا اس گندی جتنی میں رہتا تھا۔ مگر اس کی ساری کائناتی اپنے چھوٹے بھائی کنک راکر کو چڑھانے میں مرنے ہوتی تھی۔ اپنے اوپر وہ بہت کم مرنے کرتا تھا۔ اکثر کہا کرتا۔ میرا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میری بچے تو بڑے ہیں ادب مرنے۔ یہاں ایک چھوٹا بھائی ہے۔ مگر کالج چارنگ۔ یہ ڈاکٹر بن جائے تو کبھی کا میں نے کچھ کیا۔ واہ گرد کی کرپا ہے اب دو سالہ گئے ہیں۔ جیسے من جیت کبہرا ہو۔ میں آن پڑھ ہوں۔ جاہل ہوں۔ غیر تہذیب یافتہ ہوں۔ تمہاری بہت کے لائق نہیں ہوں۔ مگر میرا ایک بھائی ہے۔ میں نے اُسے پڑھا ہے۔ اُسے ہوشل میں رکھا ہے۔ وہ ڈاکٹر ہونے والا ہے۔ وہ تمہاری بہت کے لائق ہے۔ میں تو اس سے ملاؤں گا۔

اگر مکی بھرا یا اس نے من جیت کو نہ دے گا۔ مے گھا کے کہا ”نہیں بیٹا من جیت میں تم سے بھی بڑی کر بہت خوش ہوا ہوں۔ بھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں تم کے بھائیوں میں آیا ہوں“

رات آدھیک اندھ لہو تھی۔ فرش پر کیڑے، جوئیں، دوجا اندھ کھنسل ریختے تھے۔ انھما میں ہنر بننے لگے تھے۔ پھر مکی جوئیں کے اندھ اور جوئیں کے باہر مکی میں اندھ کے جوئیں کے فرش پر انسانی مہم بننے میں مددگار بنے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب قریب کھڑی کے ہتھکڑی کی طرح مکی کے پیر کے اوپر لٹین مکی مکی مل رہی تھی۔ سب سوئے تھے مگر اکرم جاگ رہا تھا۔ اندھ بنا بڑا صبا اپنے

دلن اسدا تیں ہیئوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ غلی سخت کا بحران کم نہ ہوا، بڑھتا ہی گیا۔
 اکرم کی خطوط انویس کا بہت سے لوگوں نے مذاق اڑایا تھا۔ یہاں تک کہ ایکسٹرا بائی لوگوں کے لئے بھی۔
 ہنسی مذاق کا موضوع بن گیا تھا۔ شروع شروع میں اکرم کے اس کام کے شروع کرنے کا ہر چاہی ہوا
 تھا۔ ایڑنگ رولز نے اس کی تصویر بھی چھاپی تھی۔ اس سے پہلے بھی یہ اخبار ایک بی اے پاس پائس کرنے
 والے کی تصویر چھاپ چکا تھا۔ مگر کئی ہمدی کی بھاء سے نہیں، مرٹ سنٹی پھیانے کے نکتہ بھاء سے، مگر
 اس بات کو بھی اب جو بھاء سے اوپر ہو گئے تھے غلی وگ اکرم کو بھول گئے تھے ان کے لئے پنی پڑھیں
 کیا کم تھیں۔ اُجرتیں کم ہوتی تھیں۔ مختلف سٹوڈیو میں ڈاٹ ہنوں نے اپنی یونین بنالی تھی۔ کئی برسٹوڈیو
 میں ہڑتائیں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے ہاتھ کھینکا لیا تھا۔ بہت سی آدمی پوٹھالی پکڑتھیں
 ڈبلی میں بند پڑی تھیں۔ نئی تصویریں بہت کم شروع ہوتی تھیں۔ بھوت بہت کم ہوتے تھے۔ ہمدیوں کو جاکے
 وقت خانے لگ رہے تھے۔ داروں میں دھڑ پرانگ دھڑوں دھڑوں کی کیفیت کا منتظر تھا۔ کبھی ایسا سناتا جیسے سب
 ادھمک رہے ہوں۔ کبھی ایک نکتہ ایسی لڑائی کہ آں کی آں میں سرکل جاتے۔ ایکسٹرا لوگوں کو سٹینڈ ٹو کریڈٹوں
 کو لکھ کئی سفید کپڑوں ڈائریکٹوں کو خانے لگ رہے تھے۔ مہینے بھر ہوا کپڑا بنانا اور میرے بڑائی ہوتی سکا بھٹ

کو قائم رکھنا جو اصل معلوم ہو رہا تھا۔

بٹا چلریہ نے پہلے پہل اکرم صاحبیت مذاق اٹایا تھا۔ پھر بڑی بخیدگی سے اسے اس کام کو چھڑ کر پھرے
نہوں میں آئے کہ کیا تھا۔ یہاں تک کہا تھا کہ اس کے اس حقیر کام کرنے سے نعم دلوں کی تعمیر ہوتی ہے مگر اکرم
نہیں مانا۔ اب وہی بٹا چلریہ تھا کہ اکرم کی دانش مندی کو سرور رہا تھا۔

”بس سے ملت کے ہوں بیچے تک کام کرتا ہوں۔ پھر بھی کوئی بیہ نہیں رہتا۔ تین پھروں میں سسٹنٹ
ڈائریکٹر ہوں۔ ایک کچر کے پردے پیچے نہیں ملتے۔ بیٹھنا کھڑا نہ سنے میں بس لاکھ ہاروئے ہیں۔ ہوتے ہیں
حالت تہی ہے زرا مبرکرو۔ اسے جب حالت موٹی تھی جب تم نے کون سی تیلیاں کھول دی تھیں۔“
اکرم غامض رہا

”تم بہت اچھے رہے۔“ بٹا نے کہا ”دن میں کتنا کاتے ہو؟“

”دو ڈھائی روپے۔ کسی دن تین بھی ہو جاتے ہیں۔“

”یہاں تین بھی نہیں تھے۔“ بٹا نے اکرم کی طرف رنگ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا میں یہ لحاظ ڈال آؤں۔ بٹائی سے سوہنہ یہ لگا یا ہے۔“ بٹا نے لحاظ اکرم کے سامنے ہلکا
اندھ پھر ڈاک خانے کے اندھ گھس گیا۔

ایک دن اکرم نے کسی صاحب کو ڈاک خانے میں گھستے ہوئے دیکھا۔ بلایا چھاپا انداز معلوم ہوا
مگر چونکہ اس کوئی کی پٹت اکرم کی طرف تھی اور اکرم اس وقت ایک خطا کھینے میں مصروف تھا۔ اس نے اس نے
زبان توجہ نہ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کوئی ڈاک خانے کے باہر نکلا تو اکرم نے جھٹ پھان یا ہنوا راست
خیش تھے۔ مگر کس اندھ گیا پچک سے گئے تھے۔ ان کے سرخ و سفید تھے اندھ کو جس گئے تھے اور اندھ فریخ مسج

اتھاڑوں ڈھولوں سا ہند تھا۔

”اے مرزا جی؟“ اکرم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

مرزا جی نے بھی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھا۔ حیرت دونوں کو، ایک دوسرے کو اس حالت میں پا کر ہدیٰ تھی۔ مگر اکرم اپنی حالت پر زیاں مطلق نظر آتا تھا۔ مرزا جی نے اپنی آنکھیں پھاڑیں مگر اس کے برعکس تم یہاں کیا کرتے ہو؟“

”مظلوم فریجی کرتا ہوں“

مرزا جی خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے ”دیکھا۔ اچھے فڑے کئے مسلمان کو بھی یہاں کام نہیں دیتا۔ میں تو پاکستان جا رہا ہوں“

”کیوں؟“

”کیا کروں۔ یہاں ایک سال سے بے کار بیٹھا ہوں۔ اب تو قاتلوں پر فزیت آنے لگی“

”پاکستان میں کیا فائدے نہیں ہوں گے یہاں کیلے کھاری، فریجی، جہالت۔ ادا اس قسم کے مسائل نہ ہوں گے۔ یہ بیماری ہر جگہ ہے مرزا جی“

مرزا جی اپنے شانے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے ”کراچی میں میرا ہم زان ہے۔ وہ ایک سوچے سمجھے چور پرنا ہے۔ اس نے مجھے کھسا ہے کہ اگر میں پاکستان آ جاؤں تو وہ مجھے پلٹی ڈپارٹمنٹ میں چور کی پوسٹ ملا دے گا“

”لیک ہے!“

”مگر تمہارا کتہ تو یہ تھا۔ تمہیں کھنوساں قندہ ہند تھا۔ مرزا جی سال میں دو مرتبہ تم اپنے وطن جلتے تھے“

”کھنوساں کے پان۔ اس کا کچھ اس کا خصوص اب دہو۔ وہ گلابا تھکی زمین کی سی سونڈی سونڈی خوشبو دے...“

مرزا جی نے اپنی نظریں اکرم سے پھیریں۔ آہستہ سے بولے ”میں نے بے شک کھنوساں دیا ہے“

اکرم نے مرزا جی کے گمہ سے جھپٹے، ان کے شانے پھنکے کے گرتے اور خیر باد بھالے کی طرف

دیکھ کر سوچا اسے کسی دیکھ بھونڈ میں رہنے والے خوب صورت لوگو! اب تمہارے لئے کوئی ابتداء نہیں ہے اور کوئی انتہا نہیں ہے۔ کوئی جزا نہیں ہے اور کوئی سزا نہیں ہے۔ کیوں کہ تم نے اپنے لئے سب کچھ منظور کر لیا ہے۔ تمہیں کھٹو کے بجائے کچی لایا اور کھد کے بجائے جانور مراد اور تم نے اسے منظور کر لیا۔ اجمد کے بجائے تمہیں مشرت اور اجمد تم نے اسے منظور کر لیا۔ ایک دن تمہیں زندگی کے بجائے پتوں کی گولی ملے گی اور تم اسے بھی منظور کرو گے۔ کیوں کہ تمہاری روح کا طوفان مرچکا ہے۔ اور تمہارے مائل کا سیلاب اتر چکا ہے۔ اور تمہاری کاوش نے تمہیں کانگریز ساید بچو دیا ہے۔ اس لئے اب تمہارے لئے کوئی پتہ نہیں کھڑا کرے گا اور کوئی شاخ نہیں لگے گی۔ اور کوئی پہاڑ تمہارے دروازے پر لاٹک دینے کے لئے نہیں آئے گا اور تم اپنے ہون پرش من دنیاؤں میں سر دی سے ٹھہرتے ہوئے مر جاؤ گے۔ اے برے خالی فونی خوبصورت نئے لوگو!

مزا ہی نے اس سے کہا "تم یہاں اپنی زندگی بریلو کوں کر رہے ہو پاکستان چلے جاؤ پڑے کھے مسلمان کے لئے اب بھی وہاں بہت قند ہے"

"اگر سب ہی پڑے کھے مسلمان چلتے بنے قرآن پڑھ مسلمانوں کا یہاں کیا ہوگا"

اکرم کی آنکھیں غصے سے چمک رہی تھیں اس نے ذرا بلند ہونے میں کہا "تم بولتے ہو مزا ہی۔

میں ایکو نہیں ہوں۔ بے کاری، منظمی، نگہاری مسلمانوں ہی میں نہیں ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، عیسویوں اور پارسیوں میں بھی ہے۔ غریب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم مسلمانوں ہی کی بات کرتے ہو تو یہ بھی تمہیں لو کہ اس ملک میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ کوئی اور ملک اتنا بڑا نہیں ہے کہ انہیں ہمسلا دے سکے۔ یہ ان کا ملک ہے۔ یہ ان کا وطن ہے۔ اسی وطن سے وہ پیار کرتے رہے اس کی مٹی کے ساتھ گیت گاتے رہے۔ اسی کے ساتھ ایک ضروری قیمتی اور پتھر بن کے ان کے آگے بڑھنا ہوا۔ انہیں کوئی بدسلوایت نہیں ہے۔ میرے داغ میں یہ بات بالکل واضح اور مانع ہے"

مزا ہی ایک تلخ ہنسی ہنسے۔ بڑی احتیاط سے انہیں لے جانے بھی پانڈن میں سے ایک یا ان

”نہیں ولایت عجم۔ یہ دنیا شریفوں کی ہے“ اکرم نے اس سے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ ولایت عجم بڑی سختی سے بولی ”یہ دنیا شریفوں کی نہیں ہے“

اکرم چپ ہو رہا۔ نئی آواز گھوڑا کے ولایت عجم نے اسے ایک دوسرے دیا۔ اکرم نے اسکا کر دیا۔

”لو“ ولایت عجم نے کہا ”اس کی کمائی ہے۔ ایک دوسرے تم لے گئے تو کون سا خنب ہو جائے گا“

”ایسا کیوں کرتی ہو ولایت!“ اکرم نے بڑی اندر دگی سے کہا ”ایسا کیوں کرتی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں

ہے اپنے آپ کو تباہ کروانا“

ولایت کی ساری شرفی ایک دم ختم ہو گئی۔ جیسے اس کے سپرے سے تاریکی سا سایہ سا گھوم گیا۔ وہ

یہ ایک کمانے تھی۔ اس کی آنکھیں، بالائیں، اس کے حق سے قورک کے ساتھ خون کی ایک گیرہ باہر فرش

پر رھ گئی۔

اکرم کانپ گیا۔ ”تم اپنا علاج کرو۔ تمہاری باتیں چھوڑ دو۔ کسی ماں باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ تم کسی ہسپتال میں داخل

ہو جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ چل کے قہیں داخل کروں گا“

ولایت اس کے ہاتھ سا بارالے کے اٹھی۔ بولی ”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب مجھ میں کچھ نہیں بچا اب

سب ختم ہے“

اور وہ چلی گئی۔ اکرم دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ ایک عجیب بے عجم چال سے چل رہی تھی وہ بسنا

پاؤں کیس اور یاں پاؤں کیس۔ اور وہ ہنسا کونسا کس اور یاں کونسا کس۔ اور ایسا سلوم ہوتا تھا جیسے ایک

عورت نہیں۔ وہ عورتیں بچے میں سے شق چورک الگ الگ ٹانگ اور کولے کے بدلے وہ نصف عورتوں میں

گھس رہی ہیں۔ اکرم نے سونہ پھیر دیا۔ بیت خشک ہے۔ چیزوں کو دیکھنا۔ بھنا اور بھوکنا خاموش ہو جانا۔ اپنے

دل و دماغ کو اس قدر خالی کر دینا کہ وہاں کوئی سوچ باقی نہ رہ جائے۔ بلکہ میں کتنی ہی عورتیں۔ انہی

عورتوں میں۔ آدمی سے بھی کم ایک تباہی۔ ایک چر خالی۔ عورتیں۔ ایسی عورتیں جن کے اندہ کوئی عورت نہیں

ہے۔ جن کے صرف اعضاء عورتوں کے سے ہیں لیکن جن کے اندہ کوئی صحت باقی رہنے نہیں دی گئی۔ کوئی
 ہی کوئی بہن، کوئی بیوی، کوئی محبوبہ ——— عورتیں جنہیں صرف تاجر بنا دیا گیا ہے۔ صرف دکان دار۔
 صرف مائع خور۔ جن کے اندہ سے دل بھی نکال لیا گیا ہے لہذا ہاں جس ایک پانڈی کا سکہ دکھ دیا گیا ہے۔
 بہت فضل ہے اس ظلم کو دیکھنا اندھا شخص وہ جانا! اگر مرنے والوں ہاتھوں سے اپنے سر کو
 پکڑ دیا۔ کہیں پر کوئی راستہ ہے۔ ضرور کہیں پر کوئی راستہ ہے۔ اگر اس نے جلد یا بدیر اسے تلاش نہ کیا تو
 پاگل ہو جائے گا۔

اُس روز بارش برس کے خم مٹی تھی۔ شام کا وقت تھا اور سستی کے اور پر آسان میں شفق کا لہر
 بادلوں کی جھالیں سہانے کھڑی تھی۔ سستی کے آس پاس اور سستی کی لگی میں چھوٹے چھوٹے بوڑھوں میں پانی
 بھر گیا تھا۔ اور اس وقت شفق کے عکس سے ایسا سلوم ہوتا تھا گویا پانی کی سطح پر خزاؤں ملا کر چمک رہے ہیں
 آسمان کے اس چھوٹے سے کونے میں اس وقت آناٹھن تھا اگر دیکھتے چوتے بحیث ہوتی تھی۔

مگر سستی کے لوگ اوپر نہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک عرصہ ہوا کہ آسمان کو بھلا چکے تھے اس وقت
 نیم کے پڑنے کے نیچے بڑے زور شور سے بحث جاری تھی دھوئے جو عموماً خانہ کش رہتا تھا۔ اس وقت بہت
 ہی بے چین اور مضطرب انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا "سیٹھ نے مجھے بلایا۔ کافہ کا پرزہ جو میں نے برائے میں کو دیا تھا۔ اور بوا کر میں
 نے انہیں کو دیا تھا۔ وہ اس وقت اس کے سامنے تھا۔ وہ بہت بے چین اور پریشان نظر آتا تھا۔ مجھے
 اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر کہنے لگا۔ "کب سے تم ہڈی بل میں کام کرتے ہو؟"

"دس سال سے۔"

"اس کا فائدہ تم کو تنہا کر رہا ہے؟"

”ہاں“

”تم جانتے ہو اس کا نذر پر کیا لکھا ہے“

”ہی۔ لکھا ہے کہ دنیا میں جنگ بند ہونی چاہیے“

سیٹھ نے سا نذر دہرا کیا۔ تہرا کیا۔ چہرہ کیا۔ اس نے اُسے پھر آہستہ سے کھولا اور اتنے دیر سے

تک وہ باہل خاموش رہا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا

”کیا تم بھی شانتی سما کے ممبر ہو؟“

”ممبر تو نہیں ہوں۔ والٹیر ضرور ہوں“

”دنیا میں امن ہو یا جنگ ہو، تمہیں اس سے کیا۔ تم مزے سے اپنا کپڑا بیٹھے جاؤ“

میں نے سیٹھ کو ہیروشیا کے بارے میں بتایا۔ اُس نے میری کوئی بات ٹھن کر ہی کہا۔

”سیاست؟ سیاست۔ تم مزدور لوگ اگر سیاست کم کر دو اور کام زیادہ کرو تو دنیا میں کسی

قسم کی صحیح باقی نہ ہے۔“

میں نے کہا ”میرے پچھلے دس سال کا ریکارڈ دیکھ لو۔ کیسا کام میں نے کیا ہے۔“

سیٹھ ہلکا ”اہی نے تو تمہیں بھلا ہوں کوئی دوسرا ہوتا تو اُسے غرور کا دل دیتا“ آنکھ کرکاس

نے مجھے نصیحت دی، بلکہ گھڑا۔ جیسے اُنہیں دلنے کسی لڑم کو گھورتے ہیں۔ سیٹھ ہنسا۔ ”تم بہت چالاک

ہو۔ اچھا جاؤ۔ اب کی تمہیں صاف کر دیتا ہوں۔ مگر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا“ اس کے بعد اس نے وہ دستوں

والا فضلہ کے پھاڑ دیا اور مجھے اشارے سے کہا کہ اب مجھے چلنی ہے۔

”پھر“ مجھ نے اپنی ناک انھی سے دو تین بار منڈتے ہوئے پوچھا ”تم نے دستاویز

کر لئے؟“

”جی ہاں“ ایسا ہی کیا؟ مگر میں اب محتاط ہو گیا۔ میں نے جاکھاپنے مزدور بھائیوں سے

ہمارے بیٹے کیا کہتا تھا۔ کئی مزدور جہاں جو اس سے پہلے شانتی سماجی اپیل پر دستخط کرتے تھے انہوں نے
فرداً دستخط کر دئے۔

”کیوں“

وہ بولے ”بیٹہ اگر اس اپیل کی مخالفت کرتا ہے تو اس میں ضرور کوئی ایسی چیز ہوگی۔“

اس پر ایک قبضہ چلا۔ من بیت سنگو اللہ فضل خوب مذہب سے بنے۔ اکرم جواب تک اس کو کچھ نہ
سمجھتا تھا، مسکرا کر اس کو سختی ظاہر ہوں سے دیکھ رہا تھا اور کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھوے نے اپنی نیکر
کی جیب سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا۔ کہنے لگا ”پہلا کاغذ بریٹو نے پھاڑ دیا اس پر بڑی شکل سے
دوسرا دستخط ہوئے ہوں گے۔ بیٹو کے منہ کرنے کے بعد آٹھ سو لوگوں نے اس پر دستخط کر دئے۔ تھمے اگر
اس وقت ان لوگوں کے چہرے دیکھے ہوتے!“ دھوے نے ایک خاموشی ہو گیا۔ اس نے دستکوں والے
کاغذوں کا پلندہ مہربنت کے ہاتھوں میں دے دیا۔

جناہوں ”اس جنگ کی تو میں بات نہیں کرتی لیکن پہلی جنگ میں مجھے یاد ہے پہلی جے وینہ
مانگے نام سے جانتے تھے۔“

من بیت نے کہا ”اور اس کے بعد وہ خندق پر جا کے گولی کھا کے مر جاتے تھے۔ اسی طرح میرا
چچا مر گیا تھا۔ مجھے یاد ہے ہمارے گاؤں میں دیوالی کا میلہ تھا۔ اُس مذہب لوگوں نے نئے کپڑے پہنے تھے
ہمارے دونوں ہاتھ مشابروں سے بھرے ہوئے تھے اور میوؤں میں آتش بازی کا سامان تھا اور ہم پہلے
سے فریڈ کے لے جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر میرے والد کو مرنے لگا ہوا آیا۔ اور وہ تار پڑھ کے
میرے والد ہاڈ میں مار کے روئے لگ۔ پڑھے ”وہ پُپ ہو گیا۔ پھر من بیت نے سرخ کے کہا ”یقیناً
زندگی بہت اچھی چیز ہے۔ مجھے اپنا چچا ابھی تک یاد ہے۔ لام پر جانے سے پہلے وہ کس قدر خوب صورت
اور تندرست دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی کلاڑھی سرخ تھی، اور سرخ اس کے بال تھے، اور سرخ اس کے

کال تھے۔ اور وہ ایک برس۔ ایک بچی چھوڑ کر مر گیا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتا تو شاید میں اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتا۔ من جیت نے افسردگی سے سر ملایا۔

فضل نے کہا: ”پہلی جنگ کی بات تو میں نہیں کرتا لیکن اس جنگ کے دنوں میں بہتر بہت تھے تھے۔ میری ٹیکسی صبح سے شام تک چلتی تھی۔ ان سے زیادہ رات میں کمانا تھا۔ کوئی دن ہی ایسا ہوتا تھا جس دن ساڑھے تھوڑے نہ کما لیتا ہوں گا۔ اب؟ مشکل سے باتیں تھیں۔ روپے ہوتے ہیں۔“

جسوت نے کہا: ”جنگ میں دشمن کتنا تھا۔ شہرود پوں میں تم خرید کیا سکتے تھے۔ بنگال میں جنگ کے دنوں میں کیا ہوا۔ تیس لاکھ آدمی غارتے سے کیوں مر گئے کیوں کہ ساڑھا ناچ عاف جنگ پر جا رہا تھا اس نے ہمیں اور مجھے غارتے کرنے پڑے۔ صرف روپوں پر کوئی نہیں ہی سکتا ہے۔ لاکھوں کی زندگی ایک ٹیکسی کی کمانی سے ہزاروں بے بہتر ہے۔ مانتے ہو کہ نہیں۔“

فضل نے اثبات میں سر ملایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈک کے بولا: ”ایک اپیل بکے بھی دے دو میں ٹیکسی ڈرائیور یونین کے سائنسے رکھوں گا۔“

جسوت نے اپیل کا ایک چھاپا ہوا نمونہ لے دیا۔ پھر اس نے اکرم سے طے کر کے کہا کہ تم نمونہ مری میں اتنے بڑے بڑے نامور وادکاروں، حمایت کاروں، تقسیم کاروں کو جانتے ہو اگر تم ان لوگوں سے دستخط کرا سکو تو ہمارے کام کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

اکرم نے نمونہ دیکھا تو اس نے کہا: ”مگر اس میں ہے کیا۔ میں تو سمجھتا ہی نہیں۔ کون ایسا آدمی ہوگا جو اپنے ہوش و حواس میں ہو اور اس اپیل پر دستخط کر دے۔“

جسوت نے کہا: ”یہ چیز اس قدر آسان نہیں ہے۔ تم چھانبل کے سیٹھ کی باتیں تو سن چکے ہو۔“

”وہ سب تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ساری دنیا تھوڑی پاگل ہے۔“ اکرم نے ہنس لے کہا۔

”دنیا میں کئی خطرناک پائل موجود ہیں، جو پائل خلعے میں موجود نہیں ہیں۔ جگہ اونچے اونچے اور
 جہازوں پر اونٹناتے ہیں اور دن رات جنگ جگہ چلتے ہیں۔“
 ”ہوں گے! دوسرے ملکوں میں ہوں گے۔“ اکرم نے ذرا بلند لہجے میں کہا ”مگر ہمارے
 ملک میں نہیں ہیں۔ خود ہمارے ہر دو جان مستری کی پالیسی ہی ہے کہ دنیا میں کہیں جنگ
 نہ ہو۔“

”اس میں کوئی شک نہیں“ جسوت ہوا ”پنڈت نہرو کی غلط فہمی کو کششوں نے اس کی
 کاوش میں ہندوستان کو ایک تاریخی مقام بخانا ہے۔ مگر قسمی سے خود ہمارے ملک میں ایسے لوگ موجود
 ہیں جو طرح طرح سے پنڈت نہرو کی صلح جوتی کی پالیسی کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا موہنہ بند کرنا ضروری
 ہے۔ اور پنڈت نہرو کی اس پسند پالیسی کو آگے بڑھانے کے لئے عام کا تعاون دینا بھی بہت ضروری ہے۔“
 دھرمے نے بابرام کی طرف مسکرا کر کہا ”اپنے بابرام نے اپیل پر دستخط نہیں کئے۔“
 ”کیوں بابرام؟“ جسوت نے پوچھا۔

اب ہر شخص بابرام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بابرام کے لئے ان کی نگاہوں سے پناہ بے دخل ہو گیا
 پہلے تو اس نے اپنے ہاتھ اپنی پیشہ کی طرف کرنے گویا وہ خود نہیں اُس کے ہاتھ مجرم تھے۔ جنہوں نے اس
 انہیں پر دستخط نہیں کئے تھے۔ پھر اس نے دایاں پاؤں اٹھا کر انہیں پاؤں پر رکھا اور جب اس سے بھی کام
 نہ جاتا تو یکایک فٹے میں ہوا ”میری بھو میں نہیں آتا اکاؤ نش کرک کو جنگ یا اس کے سوال سے کیا تعلق ہے
 میرے لئے آنا بھاتا ہی کافی ہے کہ وہ اور دو چار روپے ہوتے ہیں۔“

دھرمے نے کہا ”کبھی کبھی دو اور دو چار پائی بھی ہوتے ہیں“ سی جیت سنگھ نے بابرام کے
 لہجے میں بائیں اس کی نقل کرتے اس طرح ہکا بکا سب کو سنہی آگئی۔

جسوت ہوا ”اور دو اور دو چار ہم بھی ہوتے ہیں۔ اور اگر ان چاروں میں سے ایک ہم ایشم ہم یا

ہائیدرد جن ہم کا ہوا تو تم اور تہا لایہ کارخانہ اور چراغِ ابرہہ غصہ سے شہر بھٹی ایک لمحہ میں فنا ہو جائے گا :

بابرام نے فتنے سے کہا " ہو جائے مجھے کیا۔ میں تو اس کی مٹری پر بدولہا ہستی میں —"

مگر وہ اپنا فقر و پرانہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں بے اختیار گی کے سوسے پر گھوم گئیں اور اس نے اندھے سانس اندھ کھینچی کر چہرے پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی اسی طرف دیکھنے لگے جدھر بابرام دیکھ رہا تھا۔

گی کے سوسے پر سے دو لڑکیاں چلی آ رہی تھیں۔ جان، چشم، سبک خوام، شفق کے لال بالوں کے پرے کے پرے ان کے سب منظر میں تھے جن سے ان کی ساڑیوں کے رنگ اور بھی بکھر گئے تھے اور ان کے سر کے گرد سرخ روشنی کے اے سے گھومتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس دنیا، کم از کم اس بستی کی مخلوق معلوم نہ ہوتی تھیں۔ ان کے روشن چہرے۔ ان کی سفید جلدیں ہنسی فضا میں ایک، سفید فاختہ کی طرح ڈونکی ہوتی۔ اور جب وہ چہرے کے قریب آتے آدمیوں کو دیکھ کر فحش گینس ترگی کے چھوٹے چھوٹے جوڑوں میں ان کی ساڑیوں کے رنگ قوس و قزح کی طرح پھیل گئے۔ بچا ایک ایک لے کے لئے وہ ہم ہی گئیں۔ پھر ان میں سے ایک نے خود سری سے زیادہ ہر شیا معلوم ہوتی تھی اپنی لابی لابی پگھلیں جب کے پرچا " جو نمبر کی جو نمبر کی کون سی ہے ؟ "

ایک لے کے لئے یا شاید ایک صدی کے لئے کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر جھانپنے آہستہ سے کہاں میری جو نمبر کی ہے چار نمبر کی۔ اس سے آگے والی کا نمبر پانچ ہے۔ اس سے آگے کی جو نمبر کی جو نمبر کی ہے "

ہولے ہولے قدم چڑھتے ہوئے چہرے کے قریب سے بدن چراتے ہوئے وہ دونوں لڑکیاں سڑی جھلٹاتے ہوئے آگے چلی گئیں۔

وہ لڑکی جس نے سوال پر چھا تھا اس کے بالوں میں بابرام نے دیکھا گلاب کا ایک پھول نکلا ہوا تھا۔ کتنا عرصہ — کتنا عرصہ ہوا اس نے گلاب کا پھول نہیں دیکھا تھا۔ ایک بے نام ہی ہنک

اس کے خنوں میں بھر گئی اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔

جبوت نے اپنی نگاہیں لڑکیوں کی طرف سے پھیر لیں اور باورام کے چہرے پر کاڑیوں - وہ
 یہاں نہان رہتا ہے وہاں خوب صورتی بھی ہوتی ہے۔ چاہے وہ یہی گڑی جتنی کیوں نہ ہو۔

باورام لا جواب ہو گیا۔ اس نے جبوت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا "وہ کاغذ بچے دو۔ میں
 دھنڈا کر دیتا ہوں۔"

اور کسی نے نہیں پہچانا تھا لیکن کرم نے پہچان لیا تھا۔ ان میں ایک رضیہ تھی، اور دوسری
 جس نے سوال پوچھا تھا وہ رضیہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں کرم کو معلوم ہوا رضیہ کی حالت ابھی نہ تھی۔ رضیہ
 اس کی مدد کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی کب تک کوئی کسی کی مدد کر سکتا ہے اس زمانے میں؟ رضیہ نے جھنڈی ہاتھ
 کا کرہ جھونڈ کر اس بستی میں چھنبر کی جھونپڑی کر لے کر پہنچی تھی، اور اب یہاں اپنی ماں اور اپنی مرحوم
 بہن کے پانچ بچوں کو لے کر آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ رضیہ کو ساتھ لے کے جھونپڑی دیکھنے کے لئے
 آئی تھی۔

بستی میں ایسی خوب صورت عورتیں۔ ایسی خوب صورت ساڑیاں۔ ایسے خوبصورت رنگ لاکھ
 کسی نے دیکھے تھے۔ وہ لڑکیاں صدیوں کے پہلے خواب کی طرح اچانک اس بستی میں نمودار ہو گئی تھیں۔
 اور کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ وہ لوگ بدبو، سڑاؤ، بد صورتی، کینگی، جنگ نظری اور جیچا دھارے اس قدر
 انوس ہو چکے تھے کہ ایک مکشیں چہرہ، ایک صاف تھری سازی، گلاب کا مہکتا ہوا پھول بھی ان کے
 لئے اجنبی تھا۔ ایک ایسا خوبصورت لہو تھا جو شاید پر یوں کی دنیا سے آیا تھا۔

تنگ و دھنگ بچے، غلیظ اور شرمہاتے ہوئے بچے، لالچے لالچے بال کھولی ہوئی عورتیں۔
 ننگے بچے پستانوں سے رپ رپ کرتے ہوئے بچوں کو دور دھاتی ہوئی جوتہ جوتہ چھوڑ کر
 کے سامنے آ کے کھڑی ہوئی گئیں۔

یہ خوب صورتی ناقابلِ یقین تھی۔ یہ لوگس زمین کا نہیں شفق کے رنگیں آسمان کا کھڑا تھا۔

بہت دیر تک لوگ کھڑے دیکھتے رہے۔ دیر تک دُفیعہ اندھیری جھونپڑی میں دُفیعہ کے ساتھ کھڑی اس کی دیواروں اور پتھروں کو دیکھتی رہی۔ مگر وہاں دیکھنے کی چیز ہی کیا تھی۔ یہاں آٹھ روپے کرایہ تھا۔ بسٹری بازلر کی کھول کا مٹائیس روپے کرایہ تھا۔ فیصل پہلے ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر دیکھنے اور سوچنے کے بعد دُفیعہ اور دُفیعہ ہولے ہولے جھونپڑی سے محلِ گلی میں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئیں، ساڑھی اٹھا کر جو پٹروں سے بچتی ہوئیں، اپنے خوشنما سینڈلوں سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئیں گلی کے سرے پر جدھر سے آئی تھیں اُدھر غائب ہو گئیں۔

یہ سب کچھ اتنا پاک، اتنا عجیب اور فوری طریقے سے ہوا کہ جیسی کہ باہر نہ ہوتا تھا کہ ابھی یہاں چند لمبے پہلے خوب صورتی آئی تھی۔ حُسن اُترا تھا۔ گلاب ہکا تھا۔ نسا جگمگاتی تھی۔ یہاں تو کوئی نہ آیا تھا۔

دی تنگ و تاریک گلی تھی۔ وہی اس کے بدنما جوڑے تھے۔ وہی رنگ آلود دیواریں۔ وہی بدبو دی بُرا ہوا سٹانا ۱۲۔ بچا یک گلی کے دوسرے سرے پر ایک آدمی اپنی بیوی کو زہد زہد سے پٹنے لگا۔ اکرم کے سارے بدن میں غبر غبری آئی۔ اس نے گھر کو آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر آسمان پر بھی شفق غائب ہو چکی تھی۔ آسمان پر صرف بار بار کی سیاہ راکو باقی رہ گئی تھی۔ اتنے میں جتنا اپنے کا پتہ ہوئے انھوں میں لاٹھیں روشن کئے آئی۔ ابد فضل نے لائٹیں اس کے ہاتھ سے لے کے نیم کے بیڑ پر لٹا دی۔ روشنی کا ایک اِلہسا جھونپڑے پر پڑنے لگا۔ جروگ اب تک خاموش تھے۔ دیر سے دیر سے باتیں کرنے لگے۔ آؤ۔ روشنی آؤ۔ کیس سے آؤ۔

اتوار کو غم سوز اور توبہ بند نہیں ہوتے تھے لیکن فلم کمپنیوں کے دفتر مزدور بند ہوتے تھے۔ اور اگر
 نہیں ہوتے تھے تو ان کمپنیوں کے جن کی شروعات اس روز کسی مشورہ میں جاری ہوتی لیکن ذمہ داری ہر دفعہ کشن
 سہاسر شونگ ہونے پر ہمیشہ کھڑا تھا۔ صرت باہر لاہور ان فطرتاً سے پیدا ہوا تھا۔ انہماک میں وہ بڑی بڑی
 بیڑوں پر بڑے زوردار کی مٹی تھی۔ میڈم کا نیل لگ تھا۔ بیڑہ باغیچہ کا لگ تھا۔ میڈم کی ٹیبل پر انہماک
 پرائیونٹ کی گیم ہوتی تھی۔ بیڑہ باغیچہ کی ٹیبل پر شہر کے بڑے بڑے سٹاپرز آتے تھے۔ وہاں ان پرائیونٹ کر
 کیا خاطر میں لاتے۔ وہ وہ پرائیونٹ تک تو وہ کرکٹ کلب میں انڈیا میں کھیل سکتے تھے۔ اس لئے بیڑہ
 بہت زیادہ اپنی ٹیبل پر پانچ سو پرائیونٹ کی گیم رکھی تھی۔ تاکہ کچھ توڑا آئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا تھا کہ
 محرمیں چلبے وہ لاکھوں کھانے والی بیڑہ تھیں کیوں نہ ہوں۔ کبھی بیڑہ کے ٹیبل پر نہ کھیلتی تھیں۔ وہ میڈم
 کے ٹیبل پر تاش لے کے بیٹھ جاتیں اور ان کے ساتھ دوسرے بیٹھے بڑے اماں یا سہو جوتی منانے والے
 حیات کار کبھی کبھار شاہ ہر جاتے۔ وہی گیارہ بجے دن سے شروع ہوتی اصطلاحات کے گیارہ بجے سے پہلے
 ختم نہ ہوتی تھیں۔ وہ ہر ہر کا کھانا شام کی چلبے۔ رات کی دس بجے اور کھانا سب ہی کچھ چلا۔ ساری خندا محرمیں
 کے گھر میں اور کھانے کی بڑے سمجھ رہا تھا۔ انھیں صرت تاش کے پتوں پر لگا رہتیں۔ کھانا، پھانے، روٹی

مگر یہ صحت اچھل کے نصیب ہو چلاں گے پہنچتے تھے آئیں اس وقت ایسے سالوں میں باہل بے کار تھیں۔ وہ دھڑاں گنگ دیکھ سکتی تھیں نہ مگر یہ کہ بلائے نہ چپائی کی صورت وہ صحت آتش کے پتے دیکھ سکتی تھیں۔

ایسے موقع پر اکرم کا شانتی بھائی پہلے کر پہنچا جانا ایک اذیت نگ بہت سے کم نہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے بڑا انا۔ مگر وہ آتش کے پتوں میں اس قدر تنگ تھے کہ اس وقت انہوں نے خاموشی سے اس پہل پر دستخط کر دینا ہی سب سے اچھا سمجھا۔ اگر کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ خوب اکرم پر جرح کرتے۔ بس سے سوال پر چلتے۔ اور اکرم خود ہی سوچ کے آیا تھا اور جانتا ہی کی تھا کہ سوال در جواب ہوں، گفتگو میں تنگ کئے بہت میں موضوع کھل کر سامنے آئے۔ ابھی طرح ہفت کے بعد وہ لوگ دستخط کریں۔ اس نے دو ایک بار اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش بھی کی۔ مگر آتش کھیلنے والے دی کے دیا کہیں اس وقت سیاست کی بات سننے والے تھے۔ ہاں۔ ہاں! ٹھیک ہے کہ کردہ جلدی سے دستخط کر کے اپنا بیجا پھڑکتے گئے۔ اکرم بہت اباؤس ہوا۔ اسے اس بات کی امید تھی کہ حالات یہ صحت اختیار کریں گے۔ یہ ایک اس کا بھی بابا کو مزید خلا حاصل کرنا بند کر دے اور اس مسئلے کو پھر کسی دوسرے ہفت کے لئے ٹال دے۔ مگر مصیبت تو یہ تھی کہ اسے آواز کے ہفت کے علاوہ کسی دن پہنچنے نہ ملتی تھی۔ صحت آواز کو ڈاک فائز بند ہوتا تھا۔ اور آواز کو کہاں ہر وہ سیٹھ بکھڑا کے دفتر میں رہی ہوتی تھی۔ اور یہی ایک جگہ تھی جہاں اندیشی کے تقریباً سب جڑے بڑے اداکار اکٹھے مل جاتے تھے۔ وہ ابوس ہر کے پہلے کردہ کر کے اپنی جیب میں رکھنے کا سوچ رہا تھا کہ اتنے میں حالات نے ہٹا دیا اور سیٹھ بکھڑا نے آتش کے پتے میز پر زندہ سے پیسنگ کر اپنی پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

”میں کہتا ہوں۔“ سیٹھ بکھڑا میز پر کھانا دے کے کہنے لگے ”جگہ خالی ہے میز پر۔“

ہر شخص سیٹھ بکھڑا کی طرف دیکھنے لگا۔ نعم اندیشی کا میری سیٹھ اس وقت سیاست مانو پر اپنی رائے سے نیا کو سفر گزار رہا تھا۔ ہر شخص نے اپنے پتے میز پر ہر دے دئے اور فہرے سیٹھ بکھڑا کی طرف

۱
دیجئے۔

اکرم نے پوچھا کیوں؟ جنگ میں سے کیوں ابھی ہے؟

”جہن۔ میرے بچے جہن۔“ اکرزائے اکرم کی طرف شفتانہ نظر اتار کر کہتے ہوئے کہا ہوا کہ بہت کھلا گرن چپ ہر کے بیٹھ کی باتیں سننے لگا۔

”جنگ سے پہلے میں کیا تھا۔ تم سب جانتے ہو جنگ کے دنوں میں مجھے ہار لائٹس تصویریں بنانا کئے تھے۔ ہار لائٹس کے نام لکریٹ میں سولا کروڑ لاکھ روپے کم نہیں تھے جب تک جنگ چھڑی تو لاکھوں روپیہ کا یا جب جنگ بند ہوئی حکومت نے لائٹس دینے بند کر دیے۔ جنگ کے دنوں میں میں نے تین ٹھوڑے خریدے۔ جنگ کے بعد میں نے ایک نئی گاڑی بھی نہیں خریدی۔ چیلنگ میرا تعلق ہے۔ مجھے جنگ نے بہت نامہ پہنچایا ہے۔ میں چاہتا ہوں دنیا میں پھر سے جنگ ہو۔ بہادر ہیں۔ لائٹس ملیں۔ میری ویس ہیرا ہو۔ میں بزنس میں ہوں بزنس کی بات کرتا ہوں بیٹا۔ برو کیا کہتے ہو؟“ اکرم نے کہا۔ سیڑھا سب آپ ایسے کتے لوگ ہیں جنہوں نے جنگ میں لاکھوں کائے ہیں۔ انھیں پوچھنا چاہئے ہاں کتے ہیں۔“

اکرزائے کہا۔ ”ایک بھڑی پر کیا موقوف ہے۔ این مارا روں سے پوچھو، تھارے سانے ہنرے بیٹھے ہیں۔ راج نا جنگ سے پہلے باغی ہزار ایک غم میں کام کرنے کا بیٹی تھی۔ اب پچاس ہزار سے کم میں نہیں آتی مثلاً سے پوچھو۔ سات ہزار بیٹی تھی۔ اب شہر سے کم کی بات فصل سے کرتی ہے۔ ویسے کار سے پوچھو، دیلا گند سے پوچھو، راج کھ سے پوچھو۔ سب لوگ تھارے سانے بیٹھے ہیں۔ ہنرے ہی سے پوچھو، یہ بھی میری طرح غم پر ہزار ہر ہیں۔ جنگ سے پہلے میں ملے ساتیس ہزار روپیہ ایک غم کا تھا، اب اسی ملے سے جنگ کے زمانے میں پچتر ہزار ملے لگا۔ اس ہوا تو پھر تیس ہزار جب کہیں ہزار ہی ملے گئے۔ بتاؤ اس جیک ہے کہ جنگ؟“

ہنرے ہی نے مسک کر کہا۔ ”اس صاب سے تو جنگ ہی اچھی تھی۔ جی میں بھی کہتا ہوں۔“

اکرم نے کہا۔ ”آپ کا طرح سر پہنے ملے کتے آدمی ہیں۔ ان پر بھی انھیں پوچھنا چاہئے ہاں کتے ہیں۔“

سیٹو جگت لال نے کہا " اس سالے میں میں کرم کام خیال ہوں۔ جنگ کے نانے میں میں پڑا ہوں۔
نے ہم ڈسٹری برٹوں کا خون پڑسا ہے۔ کتنے ہی ڈسٹری برٹ جنگ میں دیلائے ہو گئے۔"

سیٹو تترپند نے کہا " ہاں یہ تو ایک ہے۔"

اکرم نے کہا " دو کے خاتمہ دو۔"

راج بولی " کچھ بھی ہو جنگ بڑی چیز ہے۔ میں نے وہ طوائف نہیں دیکھی مگر یہاں غلطان بہت جڑا ہے
ہر صف بھی۔ کبھی سر ٹھٹھل ہو جاتی ہے۔ بڑی داہیات چیز ہے یہ طوائف۔"

ششار بولی " بے نام و نشان زندگی پسند ہے۔ بھئیاد ہے جب جاپانیوں کے کم لگتے ہو گئے تھے
تو میں بھی سے بدل گئے کی سوجھ بوجھ تھی۔ یہ سچ ہے۔ جنگ میں میری اماں کی قیمت بہت بڑی تھی۔ میں نے بھی
میں کئی بڑے تھیں بھی خرید لیں۔ مگر جن دنوں لگتے تھے میں کم پڑے۔ ان دنوں میں سوجھ بوجھ تھی۔ میری اس ماں کا کیا ہوگا
سختی ہیں، آج کل ایسا ایسا ہے کہ میں سے ہیں۔ راج تو ہی بتا رہی تھی بھئییک کم پڑے سے سلا شربک سے
اڑ جاتا ہے۔ اس میں باکھڑا سیٹو لاکھوں روپیہ کمانے کا کیا نامہ اگر آوری زندہ ہی نہ رہے۔"

" پاد" اکرم نے کہا۔

پھر اکرم سوار سے پر کھڑے ہو کے چوڑی کی طرف بھاگا اس سے کہنے لگا " پٹھ کے؟ تم بھی

پٹھ ہو گئے۔"

پٹھ کے نے اپنے بڑے بڑے دانت باہر نکال دیئے۔ بولا " میں غریب آوری ہوں۔ میں کیا

بولتا ہوں؟"

" نہیں۔ نہیں۔" اکرم نے کہا " ایسے موقعوں پر غریب آوری بھی کوئی یادہ بولنا چاہئے۔"

پٹھ کے چپ رہا اور خاموشی سے باکھڑا سیٹو مینی اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔

سیٹو باکھڑا نے سکوڑ کے کہا " ہاں ہاں ابھی۔ آج کل اشتراکیت کا نام ہے۔ ہندی حکومت بھی

اشترک ہوتا ہے۔ تم ہی کہہ رہی تھیں کہ !

پہلے کے کامیاب سفر سے شرم ہو گیا مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پایا، بہت سے بولے اب آپ اتنے عقل مند اور بیٹھے ہیں میں ایک باہل گنوا کر دیکھ گیا کہوں۔ جنگ میں وہ لوگ میرے دوزخ بڑے بہانوں کو فرج میں نہرہ سستی بھرتی کر کے لے گئے۔ بڑا بہانی تو لدا گیا۔ چھوٹا بہانی اندھا ہو گیا۔ میں گڑبڑ سے جاگ کر یہاں نہ آتا تو شاید اس وقت یہ بات کہنے کے لئے زندہ بھی نہ ہوتا۔

”کون سی بات؟“ سیٹر باختر نے پوچھا۔

”آدی مدھ کے بغیر زندہ نہ سکتا ہے۔ زندگی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

پہلے کے اتنا کہہ کے خاموش ہو گیا۔ سارے ہال میں قہقہا مچا گیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے دانش کیلئے دالے نامہ نگاروں نے سر ہابی نہ تھا کہ سولی آن پڑا، گاؤں سے آیا ہوا چیرا ہی ایسی سوجوڑ جھک بات کر رہا تھا۔

”کر مے کہا“ پانچ! اللہ کوئی بات کر رہا؟“

”میڈم ہلی“ تم نے سیدھی ہاکوں مدھ پے والی بات کا جواب نہیں دیا ہے۔“

”کر مے کہا“ پہلے کہنے جواب دے رہا ہے۔ میں اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا لیکن میں ایک سوال ضرور میڈم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ جولا کوں مدھ پے بیٹھنے کا کٹھن کے ہیں کیا یہ آسمان سے آئے ہیں؟ کیا یہ بیٹھنے والی ٹکڑی کول رکھی ہے؟ کہاں سے آئے ہیں آخر کسی نے عزت کی ہوگی کسی نے کیت میں ہی بلایا ہوگا۔ کسی نے کارخانے میں کپڑا بنا ہوگا۔ کسی نے بیٹے میں پیش لگائی ہوگی۔ کسی نے دفتر میں سچ سے شام تک کام کیا ہوگا اور پھر دس دس آئے کر کے نیوا کھٹ خریدا ہوگا۔ کیا یہ سچ ہے کہ پبلک کا اتنا ہاکوں مدھ یہ ایک آدمی کی تجوی میں آکے بند ہو جائے۔ ایک لاکھ آدمی ہر کے رہیں اور ایک آدمی کے پاس ایک لاکھ مدھ یہ کٹھا ہو جائے۔ میڈم کیا آپ نہیں دیکھ سکتیں کہ بیٹھا اس ہے جنگ۔

پا جتے ہیں مگر آرام سے ٹانس لے کے لاکھوں آدمیوں کی مددوں کی ایک لکڑیٹ کر لیں۔
 میڈم بولی " تو تم ماننے ہو کہ سینہ کو جنگل نے فائدہ پہنچایا ہے۔
 " ہاں! " اکرم نے انکار کیا۔

میڈم فتح مندانہ بچے میں بولی " قوتور۔ میرے دستخط لکھ دو۔ میں نے اس وقت ہی کے رش میں
 دستخط کر کے تھے۔ میرا درمیان پتروں میں تھا۔
 اکرم نے میڈم کے دستخط پر سیاہی کی کبیر پیرری پر اس نے میز پر پٹھے ہوئے دوسرے لکھن سے
 سکر لکے کہا " اے کوئی اپنا دستخط واپس لینا چاہتا ہے۔
 کوئی نہیں ہوا۔

اکرم نے کانڈہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر سیڑھی کی طرف واپس کے ہوا " میڈم میں پھر آؤں گا تب اسے پاس
 کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ تم میرے کانڈہ پر دستخط کر دے گے۔
 " کیوں؟ "

" کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ وہ کانڈہ کا کھڑا ہے جو میرا درمیان غریب۔ نیک اسد بد فرشتے اور شیطان
 دونوں کو اپنی زندگی گزارنے۔ اپنی قسمت آزمانے اسلئے اپنے انجام تک پہنچنے کا موقع دیتا ہے۔ جس طرح
 کاہن وہ انجام ہو۔ اس سے بھی غرض نہیں۔ لیکن جو جنگل ماننے نظر آ رہی ہے۔ اسے جیسے دکائی دے۔ وہ
 اسیر اور غریب۔ نیک اسد بد فرشتے اور شیطان میں کوئی امتیاز نظر نہیں رکھے گی۔ ہم سب قریب آئیں گے۔ مجھے
 سب بات کا یہی یقین ہے کہ اگلی جنگ میں تم لاکھوں بھی کاٹا نہ سکو گے۔ بلکہ پہلی دو جنگوں میں جو لاکھوں تم نے کٹائے
 ہیں وہ بھی اتنے سے کم ہو گے۔ یاد رکھنا اسکاں، ہیروشیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا ہو اس طرح کہ مرے لئے تھا۔ کوئی
 نہیں کہہ سکتا سیٹھ۔ ایک دن یہ بھی ہی اناساکی یا ہیروشیا سے بڑا الیہ بن جائے، ایک ہمارے تھلہری ساری
 بڑھائیں اسے سٹوڈنٹ ایک لے میں نہدم! "

” اعلان کے ساتھ تم بھی “

” اس نے میں تم سے کہتا ہوں سیٹھ۔ میں پھر آؤں گا۔ اور پھر آؤں گا۔ کیوں کہ اس جیل پر مجھے تھامے ایسے چور بدعاش، ایک مار کئے اور تنگ کے بھی دستخط نظر میں “

باغیڑی نے ہنستے ہوئے سیٹھ جگت لال کو کہنی مار کے کہا ” سنئے ہو۔ سلا جے کیسے کیسے غلبے سے نوازتا ہے۔ بس ایک اس کو میں نے جھوٹ دے رکھی ہے “

” کیوں “ سیٹھ جگت لال نے آندوہ ہو کے پوچھا۔

” مسلم نہیں کیوں؟ شاید کبھی کبھی دوسرے کے سونہ سے اپنے متعلق بچ سنا اچھا مسلم ہوتا ہے “ باغیڑی نے اقرار کیا اور پھر اس نے نوا کر جاتے ہوئے اکرم کو آواز دے کے کہا ” اکرم ابو عمر اکرم بنو شاید تو ٹیک کہتا ہے۔ اگلی جنگ میں کچھ نہیں بچے گا میرے تے۔ جا کہاں دستخط کروں؟ “

جب اکرم کاغذ میپ میں ڈال کے باہر کی طرف چلا تو خشتا نے راج کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا ” اے مجھے بڑا اچھا لگتا ہے یہ اکرم جب بات کر رہا تھا تو کیسے معصوم بھورا لگ رہا تھا اس کے تپا پلا بالوں کی آئرش پوڈل کی طرح — آئرش کتے مجھے بہت پیارے لگتے ہیں نا! “

راج نے دبے دبے لہجے میں اُسے جواب دیا ” کہو تو اسے پیغام بھیج دوں کہ تم کسی کو بہت پیارے مسلم ہوتے ہو “

خشتا نے آہ بھر کے کہا ” نہیں۔ بالی۔ وہ اُس مشرت کے واقعے کے بعد دہلی واناں بہت محتاط ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے میں ایک آئرش پوڈل ہی خرید لوں گی “

عرب اکرم اہل سے باہر آگیا تو اسے دوسرے ملا جو دروازے کے پیچھے کھڑا کھڑا یہ سب گنگوٹس رہا تھا اس نے بڑی جیت سے اکرم کی طرف دیکھ کے کہا ” تم نے اسے ایسی کھری کھری سنائیں کہ میرا تو خیال تھا، وہ جیس کھڑے کھڑے کھڑا لے گا “

اکرم نے کہا "اگر میں اے کمری کمری زشتا تو وہ کبھی دستخط نہ کرتا۔ میں اے غریب جانتا ہوں۔"
 ستیا رائے نے اس کی بیٹی پر چڑھی دے کے کہا "وہ اوسے میرے شیر۔ جھنڈے گاڑوئے تو نے
 آج۔ تو نے جھنڈا ہالیہ سے اٹھایا اور ایشیا پر گاڑ دیا۔ کیسے تو نے اس سینہ کو رکھا، باندھا، تاکہ کیا پا اور
 ہر کھینچ کے چھوڑ دیا کہ بازو بیٹا نکلے رہو۔"

سن جیت سگھو نے پوچھا "اچھا اب کہاں چلیں گے؟"
 اکرم نے کہا "تقریب ہی راج محل ملوڑیو ہے۔ دیکھیں وہاں اگر کسی کی شوٹنگ ہو رہی ہوگی تو
 دستخط کرالیں گے۔"

اکرم جس وقت راج محل سنڈویچس اپنے ساتھیوں کو لے کر پہنچا، اُس وقت جوشی جی کی کچر کی ٹرنگ بھر دی تھی۔ مگر اُس وقت اتفاق سے ٹرنگ بند تھی۔ کیوں کہ جوشی جی اور سوڈیش پرانچے ایک لائنڈین کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا۔ بڑی معمولی سی بات تھی۔ جوشی جی نے سیٹ پر ایک ناچنے والی لڑکی روضی کا بوسہ لے لیا تھا اور اس قسم کی چھوٹی موٹی حرکتیں سنڈویچس اکثر بوجایا کرتی تھیں اور لوگ مام طرے سے اس طرف سے آنکھ بند کر کے کام کرتے تھے مگر آج سوڈیش پرانچے بگڑ بیٹھا تھا۔ ایک معمولی لائنڈین تھا۔ روضی کا عاشق بھی نہ تھا۔ پھر اُسے بچہ میں بولنے کا کیا حق تھا۔

جوشی جی بریم بوسہ دے تھے "سلا دو ٹکے کا آوری۔ ہم پر رباب کرتا ہے" جوشی جی نے بہتیا زبان میں کہا۔

سوڈیش پرانچے نے کہا "سلا دو ٹکے کا بویا چار ٹکے کا تم کو اس سے کیا۔ ہم تم کو بتا رہے۔ تم ناگزیر رہے۔ تو سیٹ پر شرف سے کام کرو۔ سلا دو ٹکے کا بویا۔ کوئی ہاں نہ کہو گناہ نہیں ہے۔"

"یہ روضی تمہاری اس گھٹی ہے؟" جوشی جی نے نصیحت سے پرچھا۔

سوڈیش پرانچے بولا "یہ نہ ہماری مال ہے۔ یہ نہ دوست۔ ہماری کچر بھی نہیں ہے۔ ہماری عورت

تو ہے۔ صحت کی جنت کرنا شکنا ہم کر۔

”بڑا آیا عزت کرنے والا۔ سائے گریہ جیسے برساتی ہے تو توڑنے میں اُرم ملنے والا کون ہوتا ہے۔“
 ”سوال مری کا نہیں ہے۔ سوال اصل کا ہے؟ کل کو یہ قبیلے ماتو سیٹ پر سونے کے لئے تیار
 ہو جانے لگی تو کیا ہم اس کی اجازت دیں گے؟ کبھی نہیں۔“ سوڈیش پرائیجے نے بڑی مضبوطی سے انکار
 میں سرعہ کیا۔

”تم کون ہوتے ہو حکم دینے والے؟“ جوشی بی نے اپنی ٹھوڑی آگے بڑھا کر پوچھا۔ اس کی نیوٹے
 کی سی آنکھوں میں فتنے کی ہری دھند گئیں۔ ”میں اس سیٹ کا ڈائریکٹر ہوں جو جاہلوں کو سکنا ہوں، جسے پاہلوں
 کان سے پکڑ کر ابر بھال سکنا ہوں۔ گٹ کاؤٹ یو بیڈی سوائن؟“ جوشی بی نے انگریزی میں کہا۔
 ”یو بیڈی ڈاگ؟“ سوڈیش پرائیجے نے بھی اُسی جیسے میں تنک بترک جواب دیا۔

جوشی بی اور ان کا اسٹنٹ بٹا پارہا دوسرے لوگ میرٹ میں رہتے تھے۔ ایک ڈانٹ بین انگریزی
 بول رہا تھا ان کے بار کی انگریزی۔ جوشی بی نے ایک نئی نکرے سوڈیش پرائیجے کی طرف دیکھا۔ سوڈیش پرائیجے
 ایک ٹھکی ٹھکی غما کی قبض پہنے اپنی جگہ پر غما خوش کھڑا تھا۔ اگر ہنے اس کی گھنی ہونٹوں کے نیچے کی دھن آنکھوں
 کو دیکھا۔ اُس کے اُبھرے ہوئے موٹھی رخساروں کے نیچے کے مضبوط جڑے کو دیکھا۔ گردن کے نیچے کے مضبوط
 صدفی جنم کو دیکھا۔ سوڈیش پرائیجے کا رنگ کھٹا ہوا گندمی تھا جواب فتنے سے بھر اسٹنٹ بٹا پارہا دوسرے
 تھا کہ سوڈیش اپنے آپ پر تباہ ہونے کی بہت کوششیں کر رہا تھا۔

جوشی بی بولے۔ ”میں بطور ایک ڈائریکٹر کے نہیں حکم دیتا ہوں۔ سیٹ سے ابر چلے جاؤ۔“

سوڈیش پرائیجے ایک لمحے کے لئے نہ ہوا۔ پھر گھوم کر سینے سے ابر چلا گیا۔

جوشی بی نے کیمرہ میں سے کہا۔ ”وائٹ فکس کرو جلدی سے۔“

کیمرہ میں اندر سے پٹایا۔ ”وہ سولہ ادھر لاؤ۔ بے بی ادھر کو کھینچو۔ بھانڈپ دہانی ٹکس کرو۔“

گر کسی لائٹ میں نے گروہ میں کی ہدایات پر عمل نہیں کیا اور سب لوگ سر جھکائے روشنیوں کے پاس سے
کھٹک گئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سیٹ کے باہر چلے گئے۔ شو ٹنگ بند ہو گئی۔

رضیہ اور نصیر، رفیضی، سلوچنا، ماریا، دلزبا اور دوسری ناپچھنے والی لڑکیاں اور ان کا استاد
ابراہیم سب حیرت سے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ————— یہ ایک رفیضی کے معلوم ہوا کہ شوٹروں میں مرکزی
فرد خود ڈاکٹر کفر نہیں ہوتا ہے۔ ایک معمولی لائٹ میں ہوتا ہے جو دن رات شوٹروں کی روشنیاں اور سرے اور
اور دوسرے اور سرے جاتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو ایک منٹ میں شوٹروں کو بند کر سکتا ہے۔

دوسرے خود مزید تھا اس نے اُسے اس واقعے میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ————— ملے خیر ایک
کے باہر جہاں سوڈیش پرائیجپٹ اور دوسرے اس کے لائٹ میں ساتھی کھڑے تھے، خود بات چیت کرانے کے لئے پہلا
گیا اور ان سب سے باتیں تفصیل سے پوچھنے لگا۔

سوڈیش پرائیجپٹ کہنے لگا: "ایک ترقی یافتہ ملک چکار نہیں ملتی ہے۔ دوسرے ہم لوگ ان کی رنڈی
باجی بھی دیکھیں۔ نہیں چلیگا؟" سوڈیش پرائیجپٹ نے بڑی مضبوطی سے سر ہلایا۔ "ہم کو ان کی پرائیڈ لائٹ
سے کوئی گرت نہیں ہے۔ مگر یہ اور سیٹ پر آم کر اپی پرائیڈ لائٹ نہیں دکھا سکتے۔ نہیں چلیگا؟" اس
نے پھر مضبوطی سے سر ہلایا۔

"سلا بکٹ!" دوسرا لائٹ میں براہ میں سامنے کا سر قوت دیتا بڑا آیا کہیں کا ڈاکٹر کفر
سوڈیش نری سے براہ "سر قوت نے کام نہیں چلیگا۔ سیٹ پر پھندہ، دھندلا بند ہونا
چاہئے۔ بس!"

دھوے نے پوچھا: "کیا تمہاری یونین ہے؟"

"ہاں" دوسرا لائٹ میں براہ "اکتھا بچی کی یونین ہے۔ پہلا سوڈیش اسٹس کا دائرہ

پرائیڈنٹ ہے۔"

دوسرے لائٹ میں نے بڑے فخر سے سودیش کی طرف دیکھ کر کہا: اکرم نے سودیش سے ہاتھ ملایا۔
 ”تم نے بہت اچھا کام کیا۔ ان لوگوں کی بہت بڑی حالت تھی“
 سودیش ذرا سا مسکرایا۔

لستے میں ان لوگوں نے دیکھا کہ کونے کے ایک اپ دروم سے بہت سی لڑکیاں بھٹیں اور دھیرے
 دھیرے ان کی طرف آتی گئیں۔ ہر دھیرے لوگ کھڑے تھے۔ بہت سی لڑکیاں جہاں محسوس کر رہی تھیں اور ایک
 دوسرے کو ٹھوکا دے کے آگے چلنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ یا ایک دوسرے کے پیچھے ہر کے ہنسنے کی کوشش
 کر رہی تھیں۔ جیسے لڑکیاں ایسے موقعوں پر کرتی کرتی ہیں۔ رضیاء اور رضیہ ان سب میں آگے تھیں۔ رضیہ
 بولی ”آپ نے اس وقت بہت اچھا کیا“

رضیہ بولی ”آپ ہمارے لئے کھڑے ہو گئے مالا کہ ہیں خود یہ لڑائی لڑائی چاہئے تھی میں تو ان لوگوں
 کو فک کہ بھاتی مہل گرا ہی ہڑل ہیں۔!“

معدی کرب سی ایک کونے میں کھڑی تھی اب وہ ہنٹ کر کے آگے آئی۔ اس نے سودیش سے ہاتھ ملایا
 مگر کچھ کہا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

سودیش نے کہا ”تم جاری رہنا ہوا، چل رہی ہے اس طرف منظر ہو، چاری ہی طرف دلائل خراب سپینہ
 ایک کر کے تمہارے اپنے دانے اچوں میں کام کر کے اپنی روٹی کھاتی ہو، اس کے اوپر سے اگر کوئی تھاری بے گنجی کرے
 تو تم کو خود مت کرنا چاہئے۔ ایسا بھی کیا؟“ سودیش کے لیے میں بڑی شہادت تھی۔

رضیہ نے اس کے ہاتھ کو ٹھوکا دے کے کہا ”اب کے ایسا ہی ہوگا۔ چاری آنکھیں کل گئی ہیں۔ ہم
 نے دیکھ دیا کہ ایک ایک الگ الگ رہنے سے دھڑل کی شرافت پر مجبور کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم نے ابھی
 میک اپ روٹ میں اپنی یونین بنائی ہے اس لیے کوئی پناہ نہیں دی بھی جن دیا ہے اور اب ہم میں کوئی ایسی شرافت
 ہر گ سب کی سب دھڑل کر جائیں گی“

”بس!“

سودیش مسکرانے لگا۔ اس نے رضیہ سے کہا: ”بس سٹوڈنٹس تم سے کوئی ٹیوٹر کر کے لے کر کوشش کرے، مجھ سے کہو۔ وہاں کے کسی بھی لائٹ مین سے کہو۔ سالے ہم سٹوڈنٹس میں ہڑتال کر دیں گے مگر یہ بد ساشی نہیں پنپنے دیں گے! نہیں چلیگا! کتھم!!“

اکرم کو سودیش کا ”کتھم“ بہت پسند آیا۔ اس نے سودیش سے پوچھا: ”تم کہاں رہتے ہو؟“
 ”اہم کاندے کی بھونڈیوں میں“ سودیش نے اسے بتایا۔

”بڑے ککے سلوم ہوتے ہو“

سودیش پُپ ہر ہا۔

اس کے ایک ساتھی نے بڑے فخر سے اکرم کو بتایا: ”ہلا اسودیش بڑک تک پڑھا ہے۔“

اتنے میں رضیہ نے کہا: ”پلو لڑکیو بیک آپ اٹنڈو۔ مگر پلیس۔ تھوڑے عرصے میں یہ خبر سارے سٹوڈنٹس میں پھیل گئی کہ صرف لائٹ مینوں نے بلکا ناچنے والی لڑکیوں نے ہی ہڑتال کر دی ہے۔ جوشی جی کا اسٹنڈنٹ بھنا چاریہ دھڑکا دھڑکا ان کے پاس آیا۔ اپنے ہوتے ہوا: ”رضیہ بولی۔ رضیہ بولی۔ کیا گب کر رہی ہو۔ سیٹ لگا پڑا ہے۔ آج کام ختم۔ ہوا تو میرا گونا پڑے گا۔ دس بجنا کا نقصان ہو جائے گا۔“

”ہم سے کیا کہتے ہو۔ اپنے اس اجاز نامی بے جوشی گئے کہو کہ کو بہاری لڑکی کو چیر پڑا تھا۔“

”رضیہ بولی۔ آپ کی جانے دو۔ جو غشی دل میں بہت خرسندہ ہیں۔“

رضیہ نے اپنی اٹھیاں پھلاتے ہوئے کہا: ”دل میں خرسندہ ہونے سے کام نہیں ہے۔ سب کے سامنے سمانی ناگنی پڑے گی۔ سیٹ پر جتنے آدمی موجود تھے جن کے سامنے جوشی جی نے یہ بڑی حرکت کی ان سب کے سامنے انہیں روزی کے پاؤں چھو کر سمانی ناگنی پڑے گی۔ باز اپنے ناسرکڑے کہہ دو۔“

بھنا چاریہ موہن دھاکے ہوتے جوشی جی کے پاس چلا گیا۔ ان کے ہانے کے بعد لڑکیوں نے غصے

مائی بھائی جو اپنی نئی ملاقات کو سوس کر کہ بہت خوش تھیں۔ بچوں کی طرح شروع اندہ ہی سے سموز نظر آتی تھیں۔
تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے آلی بجا بجا کر گانا اور ناچنا شروع کیا۔ شیخ فہر ایک کے لان میں سامنے لائٹ مین
اور دوسرے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ سلام ہوتا تھا سٹوڈنٹس میں سٹرائیک نہیں ملے ہے

کوئی ایک گھنٹے کے بعد بیٹا چارو بڑا سفید، ماسو نہ بنائے اس بلکے کے قریب آیا "اندہ چلے۔ جوشی
جی سانی مانگنے کے تیار ہیں"

جمع میں جوشی کے غم سے بند ہوئے۔ ٹریاں فضا میں اچھلیں۔ لڑکیوں نے ناچ کا آخری چکر بند سے
ختم کیا۔ پھر ب لوگ اندہ سیٹ کی طرف بھاگے۔

اندہ سیٹ پر جوشی جی سٹریٹ پر سٹریٹ پی رہے تھے۔ ان کے قریب کمرہ مین اور اس کا اسسٹنٹ
کھڑے تھے۔ اندہ ابوریل ڈانس، سٹرائٹ، تمام لائٹ مین اور ناچنے والی لڑکیاں اور دوسرے بھی کئی تماشائی اندہ
آگئے اور سب ڈانسیں سے کھڑے ہو گئے۔ دیکھیں اب جوشی جی کیا کرتے ہیں جوشی جی کی بھویں تپتی ہوئی تھیں
ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ انہوں نے سٹریٹ کنڈے سے فرش پر پھینک کر اُسے زور
سے اپنے جوتے سے مسل دیا۔ رونا کال کر اپنے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ پھر کہا "اے میری غلطی تھی۔
مجھے صاف کر دیا جائے" پھر وہ بیک آگے بڑھے اور انہوں نے روزی کے پاؤں چھوئے "اب زندگی
بہتر کسی ایسی حرکت نہیں کروں گا"

جوشی جی کی آواز پر غموس تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سوریٹش کی طرف نظر اٹھاس
نے کہا "میں نے تمہیں گال دی۔ اور میں نے تمہیں"۔ سوریٹش نے انہوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا "باتو
حار" جوشی جی نے اتر آگے بڑھایا۔ سوریٹش نے بڑی مضبوطی سے مصافحہ کیا۔ سارے سیٹ پر تائیروں
کی جھنجھٹ نائی دے گئی۔

کمرہ مین نے ہٹا کے کہا: "اے! وہ رانیٹل اور حار! اس پیچھے پر بجا ڈوب اور وہ سپاٹ

کہ مرے !

لائٹ میں روشنیاں اُدھر سے اُدھر لے جانے لگی۔ سائنڈ نے ناچ کے گیت ۲ پلے ایک

شروع کیا۔

وکیاں پاؤں سے تال دینے لگیں۔

۴ شروع ہو گیا۔

شوٹو یو سے باہر آ کے تیراٹے نے اتوا دھاکا کر کے دھڑ سے چٹکے کہا "جینڈا اٹھ دیا۔ ہمارے

دشمن کی استریوں نے۔ ہالیوے اٹھایا اور ایشیا پر جینڈا اٹھ دیا۔"

"اتنا شور نہ کرو۔ اکرم نے خمیدہ مدہو کے تیراٹے سے کہا۔ "تم نہیں جانتے آج ہمداری

ایڈٹری میں کتنی منظم تحریک نے جنم لیا ہے۔"

یو ایک اکرم کو رمزا ہی یاد آگئے وہ جو پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کی سب باتیں۔ ان کی ٹمن مہی،

گجراٹ۔ تاریکی۔ خداس کا اوتھوں میں سرچنے کے بیڑہانا۔ راستہ؛ راستہ کہاں ہے۔ یو ایک اکرم کے

دل میں بہت سی باتیں سامنے ہو گئیں۔ اب اسے یو ایک معلوم ہو گیا کہ راستہ کہہ رہے جاتا ہے۔ پہلے اس کا

خیال تھا کہ راستہ شاید شانتارام۔ محبوب۔ کاردار۔ محروبی۔ اور ایسے جیسے بڑے رگ اُسے بتائیں گے۔

یو ایک اسے معلوم ہو گیا کہ یہ راستہ تو نعم کے بہت معمولی افراد کے دلوں اور زندگیوں سے ہو کے گزرتا ہے۔ ایک

فلسفے میں۔ ایک ناپنے والی۔ ایک غم ایکسٹرا۔ جہان سے پرکھتا ہوا چپڑا۔۔۔۔

زور سے اس سے کہا "یہ نفا میں ہے۔ یہ نفا میں ہے!"

ہیا؟ "اکرم نے پوچھا۔

"سب کچھ جو ہر دے کس نے انہیں بتایا تھا؟ ہم لوگ تو لگ لگ ان سے رہے۔

کبھی ان لوگوں سے بات بھی نہیں کی۔ مرقہ ہی نہیں دیا۔ مگر یہ تو نفا میں ہے۔ تم اس طرح کے خیال

کہنے والوں کو قید کر سکتے ہو۔ اس پوری فضا کا، ہوا کو کیسے قید کر دے؟“ چمکتے ہوئے نور کی بجلی سی جھلک
 دُھوے کی آنکھوں میں تھی۔

پیدل چلتے ہوئے وہ لوگ ابکا بہت ڈھنڈھنے ہوئے گئے کہ ایک لڑکی ان کے قریب آ کر رک گئی۔
 اللہ کی نوا میں تھوڑے جہاں "سزا کرم" "اکرم نے سزا کرم دیکھا۔ رضیہ اس سے خطاب ہوئی "سزا کرم! رضیہ
 بولی "ولایت یگم کو آپ جانتے ہیں گئے۔ وہ آپ کی بچہ میں کام کر رہی تھی وہ شہر کے اسپتال میں بہت بڑی
 حالت میں بیمار پڑی ہے۔ اُسے دیکھنے چلے گا۔"

اکرم نے لڑکی کے اندر کھانا ڈال۔ پیچھے کی سیٹ پر رضیہ کے ساتھ رضیہ اور رضیہ بیٹھی تھیں۔ اکرم
 نے اپنے ساتھیوں سے اجازت مانگی اور پٹ کھول کر آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
 لڑکی ہل دی!

اکرم نے فخر کے پوچھا "کیا ہوا تھا اُسے؟"

لڑکیوں نے شرم سے سر ہٹا دیا۔ لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اکرم کچھ تو بھگ گیا۔ پھر اس کے ذہن
 میں ولایت یگم کے اس کی آخری ملاقات اُجھڑ آئی۔ اس نے انہیں وہ واقعہ سنایا۔ کس طرح وہ عشرت
 کی انہیں کے پیچھے رہنے پر آمادہ کرنے کے لئے آئی تھی۔ عشرت کا نام سننے ہی اکرم نے دیکھا کہ رضیہ دُعا
 پڑھتی۔ پھر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ گردہ کچھ بھونکا۔ اُسے یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی مگر اُس نے اس کی بات
 نہ مان لی۔

رزدی بولی "وہ دل کی بڑی نیک ہے۔ مگر! —" رزدی چپ ہو گئی۔
 قصوڑی درجک خاموشی رہی۔ پھر رزیہ بولی "آپ آج کل کوئی پتھر نہیں بنا رہے ہیں؟
 سب جانتی تھی پھر بھی اُس نے یہ سوال پوچھا۔

"نہیں"

"کیوں؟"

"وہ جن لوگوں کے ہاتھ میں خسیاں ہیں۔ وہ بے میری مرضی کا موضوع نہیں بنے دیتے۔
 اس نے —" اکرم نے ہنس کر کہا "اس نے اب میں دلہہ پوٹ آفس کے باہر غلط فہمی کرتا ہوں"
 رزیہ نے حیرت سے پوچھا "آپ خوش ہیں اپنے اس نئے کام سے؟"
 "اتنا ہی خوش جتنا کرتی ان حالات میں خوش رہ سکتا ہے"

رزدی بڑی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ اس کے بھرے ہوئے
 ریلے ہرنٹ واقعی اس قدر خوب صورت تھے کہ کسی بھی مرد کو بوسے کے لئے پاکی کر سکتے تھے۔ اکرم نے سوجا
 پر رزدی کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کتنی خشکی ہے۔ جیسے آدمی جولانی کی تپتی ہوئی لڑکھوڑ کر کسی
 منڈے چشمے کے کنارے آ بیٹھے۔

بالا رستے میں خاموشی رہی۔ مگر اکرم نے محسوس کیا جیسے رزدی بار بار اس کی طرف
 دیکھ رہی ہے۔

ہسپتال میں ولایت گیم کے کمرے کے باہر ایک بیچ پر بے۔ ابا جلال الدین۔ اور شفیق
 بیٹے تھے۔ پریشان حال چکے ہوئے مرد اور ادا اس۔ گروان میں عشرت کہیں نظر آ یا اکرم کو بڑی
 حیرت ہوئی مگر بعد میں اسے شفیق سے معلوم ہوا کہ ولایت گیم کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں نے
 عشرت کو گھر سے نکال دیا تھا۔ مگر پھر بھی، اکرم نے سوجا، عشرت کو یہاں آنا چاہتے تھا۔

پت کو تک نہی تھی۔ وہ کسی کو پہچان نہ رہی تھی۔ وہ صرف پت کو تک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ کہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت ہی دیر دیر سے سر کوٹھی میں اس کے ہونٹوں سے آواز نکلی "میرا بچہ! میرا بچہ..."

رفیقہ کا دل کانپ گیا۔ وہ کہنے عرصے پہلے کی ایک رات میں کو گئی۔ جب وہ اور ولایت راج تھا کے مگر ابھی تھیں جب وہ عشرت کے لئے اس قدر اوس تھی۔ اور ولایت نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح اس کا دل ایک بچے کے لئے تڑپتا ہے۔

وہ ہونٹ بند ہو گئے۔ وہ آنکھیں دیکھ پت کی ساج کو دیکھتی رہیں۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ ایک ایک ایک شدید جان کا، کوشش کے بعد ولایت بچہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ زس جیت میں رہ گئی اس نے ولایت بچہ کو لایا چاہا مگر اس کے چلے ہوئے بازوؤں میں نہ جانے کہاں سے اس وقت طاقت آگئی تھی کہ اس نے اپنے بازوؤں سے زس کر رہے کر دیا۔ وہ آنکھیں سیدھی غلامیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ تیزی سے اٹھے اور سینے کی طرف گئے۔ ولایت بچہ نے اپنے سینے پر دو ہتھوڑا کر ڈالے۔ ہونٹ لگے سے چلا کر کہا "ربا۔ کیا میں ہمیشہ آدمی محبت رہوں گی۔ کیا میری چھاتیوں میں کبھی درد نہیں اترے گا؟ ربا بڑا کیوں نہیں تھکتا۔ بچہ جی۔ اور اس کی آواز ایک نئی ابلیس کی طرح دائروں میں پھرتی رہی گئی۔ پھر اس نے ایک بار دوبارہ زس سے اپنے سینے پر دو ہتھوڑا کر ڈالے۔ پھر ایک وہ پیچھے کو بستر پر گر گئی۔ اس کے دونوں بازو بے جلی ہو کر دائیں جانب گرے۔

زس جلدی سے آگے بڑھی۔ مگر وہاں اب کوئی نہ تھا۔ ولایت بچہ کی دونوں آنکھیں بے نور اور بے جان تھیں۔
 ہنر سبیل کی طرح —————

زس نے اسے لٹا لٹا کر منگی میں سوچنے لگا۔ میرے پیارے قرب صحت شریف ساج! تم نے
 ولایت بچہ کو پہلے تو ایک سیاحی چوس کی طرح استعمال کیا۔ پھر اسے گھنٹے توڑنے کی طرح بڑا۔ اور آخر میں ایک

خلیقا جھاڑن جو کرست کے ٹوڑے کرکٹ میں پھینک دیا۔ لیکن جب تک میری جان میں جان ہے اور میرے آئینوں میں طاقت ہے اسی آئینوں میں خود ہے اور داغ میں سورج اور بجھ کی ایک رقی بھی موجود ہے میں فرماؤں گا اس اندھی شیطنت، غم اور غم نگہ بے انصافی کے غلط۔ ایک بار نہیں دس بار نہیں۔ میں دس لاکھ بار اپنے فراموشی گھڑی سے تمہارے آئینے جڑوں کے غلط کرکٹ تکراروں کا۔ بلکہ کبھی کبھی وقت کی طرح تو تمہارے اندھے داغ میں کہیں سے روشنی کی ایک کرن پہنچے۔ اے گندے، گندائے، خلیقا، حرام غلام تو تمہارا چہرہ لے کر چلنے والے ساج۔

کبھی وہ پتھرے اپنے تھے۔ کبھی ان کی ترش بھی اچی تھی۔ مگر اس وقت وہ گندے بنے پچلے
 سے دکائی دے رہے تھے۔ سینہ چوڑی ٹاہل بہت دیر تک مشرت کے ارجھائے ہوئے چہرے کی طرف تھکے
 دیکھتا رہا۔ مگر مشرت کی ناخوش خبر سہولت پر پریشان نہیں اور ہیلیاں بھی کھلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ رات بھر وہ بخار
 سے ٹھنڈا ہوا تھا۔ کئی راتوں سے اسے بخار ہوا تھا۔ ٹھنڈا تھا۔ جسم کو جھلکانے والا بخار۔ یکایک صبح کرنا سب
 ہو جاتا تھا۔ جسم کی ہڈی ہڈی لڑی ہوئی۔ ہر مسرتانی جگہ سے الگ الگ ملحق میں پیاس کی شدت سے کانٹے۔ مشرت
 نے کانچ کے ٹوٹے ہوئے گلاس سے دو تین بارل سے پانی پیا۔ خلیا، اندھ کتنی صحت۔ ہے۔ پیٹ میں پانی کی
 ایک پوری تنگ چاہئے۔ ان دو تین گلاسوں سے کیا ہو گا۔ پانی پنی کر اس نے زندگی کا منظر اپنے محلے
 کے گرد بیٹھا۔ اتنے میں درنگ دینے بغیر تمام اندھا گیا۔ تمام کمانی پور کا مشہور دوا تھا، اور بائیں دلواری دکائی
 دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر غلطی نہیں کما سکتا تھا۔ کوئی اسے کسی اعتبار سے کسی حیثیت سے شریف انسان نہیں سمجھ
 سکتا تھا۔ اس کی پوری زندگی، اس کا پیشہ، اس کے خصائص، اس کا کردار اس کے چہرے پر کھل ہوا تھا۔ نام
 بلڈنگ کے الگ کی طرف سے کولیوں کا کرایہ وصول کرتا تھا۔ اور کوئی کچھ بھی کہے، ایک مکان کے انتخاب کی
 دادرینی پڑتی تھی جس تم کے لوگ ان کولیوں میں رہتے تھے ان سے کرایہ وصول کرنا تمام ہی کا کام تھا۔ تمام
 سے اس پاس کی تین بلڈنگیں اپنے نفع کے رکھی تھیں۔

قاسم نے پرچا "میں پیسے بٹے؟"

قاسم جواب میں جانتا تھا۔ پھر بھی چپ رہا۔ — عشرت نے آہستہ سے سر ہٹا دیا

"تین ہفتے ہو گئے کھول کا کرایہ تم نے نہیں دیا۔ ایسے کیسے چلے گا؟

"آج جا رہا ہوں دارا شاید آج وہاں کام مل جائے"

"تین ہفتے سے تم یہی کہہ رہے ہو۔ تین ہفتے سے میں نے ممبر کر رکھا ہے۔ کھانا اپنے پاس سے

کھلا ہے۔ کھول کا مہیانا نہیں لیا۔ اور کیا کہاں کہاں سے ٹومنڈ کے قاترا ہوں۔ اپنے بیٹے کی طرح رکھا ہے

جیسی۔ مگر تم نے اب تک کچھ کر کے نہیں دیا۔ میں تم سے کہتا ہوں۔ یہ کام رام کو نہیں دے گا جیسے۔ کب سے

نہیں بھرا ہوں میری ٹول میں آ جا۔ خرچہ کرے گا؟

"بس دو تین دن اور دیکھئے دو"

قاسم نے اپنے شانے ذرا سے ہلاتے۔ جیسے کہ رہا ہو، سب بے سود ہے مگر یہ بھی کر کے دیکھو۔

"دارا انجیکشن"

"نہیں ہے؟"

"دوا مر باؤں عمو" عشرت گڑ گڑانے لگا۔ اس نے قاسم کے ٹھٹھنے پھٹنے عشرت کی آنکھوں

میں تھپی کوئی ہچک۔ تھی۔ اسی بے فہمی ہو رہی تھیں۔

قاسم مسکرایا۔ ہوا "اسے پاؤں کیوں پڑتا ہے۔ تیری زندگی بے کے آیا ہوں"

قاسم نے اسے انجیکشن دیا۔ عشرت اب رہ گیا۔

اس وقت چھیدی مال کے ماسٹرنے بیٹے ہوئے عشرت چا رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح آج اسے

کام مل جائے کیسا بھی کام ہو کوئی بھی کام۔ وہ اسے قاسم کی شرماتا ہو گی۔ قاسم کی ٹول میں شاں ہونا

پڑے گا۔ اور قاسم کی ٹول میں شاں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگلے دو تین دن اسے مل جائے پڑے گا۔

کیوں کہ قاسم نے اسے بتایا تھا کہ آدمی جرائم کی دنیا میں رہ کر اتنا ہوشیار نہیں ہوتا۔ پانچ سال تک آدمی باہر جرم کرتا رہے تو اسے اسی گڑباد سے نہیں چلتا جب تک وہ جیل نہ جلتے جیل کے اندر ہی وہ تمام اسرار و رموز ایک ایک کر کے کھتے ہیں جن پر گناہوں کی دنیا پٹی ہے۔ وہ ایک سے ایک ڈرامہ سنا رہا ہے، جس نے ساری زندگی کی ریاضت سے یہ فن حاصل کیا ہے۔ اس نے قاسم نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ جوں ہی کوئی نیا آدمی اس کی ٹولی میں شامل ہوتا، وہ اسے دو ایک ماہ میں جیل بھرا دیتا اور یہ جیل بھرانے میں ایک اور بات بھی تھی۔ جیل جا کے آدمی پھر اور مرادھر کی نہیں سرتھا۔ وہ میں اور میری کا ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کے مددگار اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور اس دنیا کے نیچے جو دنیا بتی ہے اس کے مددگار اس کے لئے گھٹ جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جیل جا کے آدمی کی بے چین رُوح اطمینان حاصل کر لیتی ہے۔ اسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے عرفان دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو نیکی اور پاکیزگی سے آتا ہے۔ اور جس کی سراج جنت ہے۔ دوسرا وہ جو بدی اور فحاشیت میں ڈوب جاتے سے آتا ہے اور جس کی انتہا جہنم ہے۔ وہ لوگ جو شب و روز جہنم میں رہتے ہیں ان کے لئے آگ کے شعلے تجھڑوں کے ڈنک ادا تپتے ہوئے لوہے کے دایر اور جلتے ہوئے گوشت کی ہڈی کہہ سکتی ہیں۔ وہ تو روزِ موت کی بات ہے۔ وہ لوگ جہنم سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے جنتی ہنر کے کلاسے ٹپل رہے ہوں۔ کم از کم قاسم کو دیکھ کر اس کے سکون اطمینان اور اس کے ضمیر کی محنتِ تشفی کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا۔ ان چند سالوں میں عشرت کے ضمیر کی کمال بے حد سرفرازی، کھوڑی اور بے حس ہو گئی تھی۔ تو بھی کچھ باقی تھا، عشرت محسوس کرتا تھا کہ ابھی وہ وہاں تک نیچے نہیں اُترتا۔ جہاں تک اسے گناہ کا عرفان حاصل کرنے کے لئے نیچے اُترنا چاہئے۔ بس ایک معمولی سی جھجک تھی۔ کہیں پر اس کے ضمیر کی سرفرازی کمال کے اندہ کوئی چیز بھی تک زندہ تھی۔ حرکت کرتی تھی کبھی کبھی اسے پریشان کر دیتی تھی۔ وہ جب نیچے دیکھتا۔ تو اسے گہرائی سے ہنسی ملتا۔ جاتے دور نیچے اس سانچوں کے بل میں کیا ہو۔ نیچے جانے کی کشش بھی اس کے دل میں تھی کیونکہ اب اتنا نیچے آچکا تھا کہ جب وہ اوپر دیکھتا تو زمین اسے اتنی دُور اور بے نظارتی جیسے وہ کبھی گہرے کنوئیں میں

گر چکا ہو۔

عشرت دوتیں ہاتھ سے کمانا، پسینے کے ترڑے اُس کے ماتھے سے چھوٹنے لگے۔
عشرت نے جیب میں رسال ٹٹولا۔ رسال کہیں نہ ملا۔ اس نے کٹ کے آئین سے ماتھے کا پسینہ دیکھ لیا۔
اس حرکت سے اس کے ذہن رسالوں پر مبنی چھا گئی۔

سیٹھ چیدی دل بڑے "آخری مرتبہ میں نے نہیں راج کے ہیں ایک پارٹی میں دیکھا تھا۔
بہت عرصہ ہو گیا۔"

عشرت خاموش رہا۔

"تم بہت ہل گئے ہو"

عشرت پھر بھی خاموش رہا۔

اُن دنوں راج نے تہاری سفارش کی تھی کہ تمہیں میں اپنی تصویر میں ہیرو لے لوں مگر کسی نہ کسی بہرے میں وہیل منٹھے نہ چڑھ سکی۔

عشرت کمانا۔

"یہ کمانی بہت بڑی ہوتی ہے۔ سچ کر۔"

عشرت نے کہا "مجھے کام چاہئے"

"مجھے سلام ہے" چیدی دل نے بناوٹی ہمدردی سے کہا "مگر مصیبت یہ ہے کہ میری دونوں
تصویریں ختم ہو رہی ہیں اُن میں تو کوئی کام نہیں ہے۔ پھر بھی ان تصویروں کے ختم ہونے کا اثر نہ کرنے، منظر کو
دکانے اور نئی تصویر شروع کرنے میں چوہا تو ضرور لگس گے"

عشرت نے مذکر کرتے ہوئے کہا "مجھے آج کام چاہئے"

چیدی دل ہنسا کہ نہیں سکتا۔ تم وہ کام کر گئے ہی تم ہیرو بننا چاہتے تھے! انجینیئر ہیں

نے چٹکی بجا کے اپنے جتنے ہوئے گھٹ کی راکھ خاک دھن میں گر گئے ہوئے کہا " میں نہیں ہیرو بنا سکتا ہوں
 مشرت حیرت سے اس کی طوط دیکھنے لگا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سینٹر چیدی وال نے جانے اُس
 وقت راج کے کہنے پر بھگے ہیرو نہ بنایا۔ آج خود بخود کسی مندرش کے بغیر بھگے اس حالت میں ہیرو بنانے کے
 لئے تیار ہے۔ مشرت کی ماضی تیز تیز بٹنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک آگئی۔ کیا اوتی چیدی
 نے یہ کہا تھا۔ ایک لمحہ پہلے اس کے کان بجا تو نہیں رہے تھے۔

چیدی مشرت کی حیرت اور مسرت کا غارشی سے لطف اٹھا رہا۔ پھر کہنے لگا " اس میں حیرت
 کی کوئی بات نہیں۔ میں نہیں اپنی نئی فلم ۲ ہیرو بنانے کے لئے تیار ہوں۔"
 " اُس فلم کا نام کیا ہے؟ "

" اسرارِ محبت۔ عورت کو رکائی کہانی "

چیدی لال نے معنی خیز نگاہوں سے مشرت کی طوط دیکھا مگر مشرت کی بگو میں کچھ نہ آیا۔

" اللہ ہیرو بن کر بن ہی گئی؟ " مشرت نے پوچھا۔

" ناہاپارا "

" ناہاپارا۔ مگر وہ تو اب تین چار سال سے کسی جگہ میں ہیرو بن نہیں آئی "

" پیچھے جا پڑی ہے " چیدی نے سر ہلکے کہا " میں جانتا ہوں آج کل اس کے پاس کوئی کام

نہیں ہے۔ مگر میں اسے بھی یا حیرت سے رہا ہوں "

مشرت نے رک رک کر کہا " یہ ————— میں ————— یعنی کی ————— کیا ہوں ————— بیٹو۔ تم

آری نہیں فرشتے ہو "

چیدی لال نے اپنی آنکھوں پر پھیل چلائے ہوئے کہا " تم اپنے سامنے کبھی فرشتے کو نہیں دیکھا ہے

ایک بزم میں کہو کچھ رہے ہو "

عشرت نے سوائے انہوں سے بیڑ کی طرف دیکھا۔ بیڑہ چیدی لال نے ندا آگے بھج کے کہا: ”ایک بلوغت ہو گی“

”ہوئے نغم“

”ہاں سب کپڑے اندر کے کام کرنا پڑے گا۔ اب وہ کام جس طرح سے کہوں گا اسی طرح سے کرنا پڑے گا۔ پنڈت کو کا کا کوک شاستر زندہ کر دیں گا اس نغم میں“

جیسے بچی کی تہ نے عشق کو چھو لیا ہو۔ وہ چوٹا۔ اس نے نغم سے کڑی کر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ چند لمحوں کے لئے کڑی، میز، آس پاس کی دیواریں، تصویریں، چہرے سب اس کی نظروں میں گھوم گئے۔ اُن کے سیدھے ہونے گئے۔ اُسے سمت کا۔ ندا بے جا۔ وقت کا جگا۔ کوئی اس میں نہ رہا۔ اسے اپنے لمحے میں کوئی چیز بچی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ باہل خشک سے ہو گئے۔ جیسے کسی نے ان کا سلا خولی چوس لیا ہو۔ اس نے ہر خشکی پر نہاں پھیرنی چاہی مگر اس کے حق میں کوئی طالب نہ تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہر خشکی پر نہاں نہیں کوئی ٹوکھا سا برش پھیر رہا ہو۔ گپ کا مطلب ہے کہ۔ کہ۔ کہ۔

— عشق اپنا فقر و پردہ کر سکا۔

”ہاں ہاں۔ باہل خشکی نغم۔ اسے ان دوسری غلوں میں کیلک لگا ہے۔ چارہ کہ خرچہ کد کوئی بھروسہ نہیں پاس ہو غیل ہو۔ مگر جو نغم کوئی ٹیل نہیں ہوئی۔ اس میں بیڑہ بھی کلاتے ہیں۔ کرٹش بھی۔

ہاں اپنے عام شریف انداز کا بار دیوی روڈ پر بہت سے اپنے بھائی بند ہیں جو پاخانے ہزار میں ایک نغم کا پرنت اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ پھر دوسرے شہروں کے بڑے بڑے سینڈ ہیں۔ دولت مند لوگ ہیں۔ رہے ہمارے تو بے چارے ختم ہو گئے۔ ہندو جناب پاس پاس ہزار میں لے ایک راجہ سے ایک بلوغت کے پرنت لایا ہے۔ اب بھی پرانے عکسوں میں دس بارہ اپنے مشتق لوگ تریں۔ میں تم سے کچا کہتا ہوں عشق۔

جو نغم بیسا سدا چھری نغم اندھ شری میں کہیں نہیں ہے۔ مطلب تو معمولی معمولی لوگوں میں بھی اس کے لوگ پیدا

ہر گئے ہیں۔ میں دعاؤں کر رہی تھی وہ فلم کی شہ پر دیتا ہوں۔ سارے کئی سی وہ لوگ دوسرے دوسرے گھومتے
ہیں اور جہاں کوئی مخصوص جگہ دیکھیں وہاں فلم بلا کے دکھاتے ہیں۔ اسے میری کئی بڑی بھینس بسلو جوبی ترکیا
گولڈن جوبیاں سناچی ہیں۔

”مگر؟“ فرشتہ کہہ کئے وہ تھاکہ چیدی وال نے اس کی بات کٹ کے وہیں پر کب دیا؟ اگر
عزیز کیا۔ بات تو یہی ہے جو دوسری فلموں میں کی جاتی ہے۔ وہ لوگ اسے کپڑے پہنا کر لگا ہوں میں چپکار طرح
طرح کے ڈانس گیت اور سالوں میں لگا پورا کہتے ہیں اسباب ہزار فٹ میں کہتے ہیں۔ میں ایک ہزار
فٹ میں یا دو ہزار فٹ میں کہتا ہوں۔ اور کپڑے اس کے ساتھ ساتھ کہتا ہوں کوئی ٹی بیٹھی نہیں۔ برو
منظور ہے؟“

فرشتہ اپنی ٹھٹھکیا ہوا آنکھ اپنے ماتنوں کے کٹنے کا پورا نے کاتے بہتے ہاتھوں کی حرکت
دیکھا۔ پورا نے سینہ چیدی وال سے پوچھا ”اس کا پورا؟“

چیدی وال ہنسا۔ ہلا ”تم کیا کہتے ہو۔ وہ بے چاری پچھلے تین چار سال سے جو بے کار ہے
ترکیے اب کس زندہ ہے۔ وہ برابر میری بڑی بھینس میں کام کرتی ہے۔ اسے بے چارہ نہیں ہے اس کے
گٹھ کا۔“

”آٹھ؟“ فرشتہ نے اپنے دل ہی دل میں سوچا۔

چیدی وال نے اپنی ٹی بیٹھی کی حرکت دیکھ کر کہا ”جیسے تھوڑی دیر میں سینہ کتر چند کے ہاں جاتا
ہے۔ مگر تم کو منظور ہو رہا ہے۔ اپنا ایڈانس بھی لے جاؤ۔ ایک ہزار دو سو بیسوں کا۔ پانچ دن کی شوٹنگ
ہے۔ سو دیر یا بھی ایڈانس لے جاؤ۔ کل سے حاضر ہو جاؤ۔ ایک ہفتہ میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ جہاں جہاں
جو دوسرے جاؤں۔ تم بول نہیں سکتا۔ میں کسی کا بھروسہ نہیں کر سکتا ہوں اس بات میں۔ تم کو میں گھننے سے
ساتھ رہنا چاہیے گا۔ سدا یونٹ۔ تم۔ میں۔ ماہ پورا۔ کیرہ میں۔ اس کا اسٹے سب لوگ اکٹھے رہیں گے۔

سات دن تک کرنی آدمی اپنے گھر نہیں جاسکتا۔ کبھی کو میری اجازت کے بغیر بیرون میں نہ کر سکتا۔ خدا نہیں کہہ سکتا۔ ایک ہفتہ دو پہر دوں گا۔ سو رہا بیواؤں! ابھی لے جاؤ۔ منظر ہے۔“

عشرت نے بیواؤں کے لئے اپنا کام چاہا ہوا تم آگے بڑھایا۔ ”منظر ہے“
 بیٹھنے لگنے بیواؤں۔ ایک چہرہ افسانہ آیا۔ بیٹھنے چہرہ کو کہا۔ ”خوابی کو اندھ بچا دے۔“ خوابی افسانہ بیٹھ
 لے کہا۔ ”عشرت کو ایک سو رہا بیواؤں نے دے دو۔ اندھ بچہ پر دستخط لے لو۔“
 ”کیس سب ہیں؟“

”بچوں کی اخلاقی تربیت کی ڈاکٹر میٹری جو بن رہی ہے اس کے حساب میں۔“

جب خوابی چلا گیا تو عشق حیرت سے بیٹھ کا رو نہ دیکھنے لگا۔ بیٹھ نے منہ کر کہا۔ ارے
 بھائی۔ غم نہ آتا ہوں۔ قیس پیسے دیتا ہوں تو اس کا کبھی سبب بھی رکھوں گا کہ نہیں؟ سو آج کل ایک
 ڈاکٹر یزن مسعود کر رہی ہے۔ ”بچوں کی اخلاقی تربیت۔“ دو ایک شاٹ اس میں بھی تیار ہے ہر باتیں گئے
 عکس کی گئی نہیں۔ گورنٹ تو آج کل اپنی ڈاکٹر یزن بناتی ہے۔ وہ میری ڈاکٹر میٹری کہاں سے خریدے گی۔
 میں تو بھی حساب رکھنے کے لئے شاٹ پیٹ کے کسی طرح وہ ڈاکٹر میٹری عقل کر دوں گا۔ اور اس سے جو غم کا سہارا
 خریدوں ہر ڈال دوں گا۔ ارے کیا کریں عشق بھائی۔ آج کل سیدھے دھندے کا سنا ہی نہیں رہا۔
 ”بچوں کی اخلاقی تربیت!“

”اسرا بہت عورت کو کاکی کہانی“

عشرت جب چھیدی وال کے دفتر سے باہر نکلا تو اس روزوں غمازوں کا غصہ طنز اس کے ذہن میں
 بیدار ہوا۔ مگر اس کی عیب میں سو کا نوٹ بھی تھا اور اس سو کے نوٹ کا مطلب تھا۔ روٹی، کھول کر لے
 لاف۔ شراب اور بے بڑی بات یہ تھی کہ وہ تمام کے پنجے سے نچ جانے کا ایک ہزار
 روپیہ! ارے وہ اس میں سے پانچ سو اپنی آں کر نہیں لگنے میں بھیج سکتا ہے۔

ہاتھ کر جب تمام اس کے پاس آیا تو عشرت نے پچھتر روپے نکال کے اسے دے دیتے اپنے پاس سونے کی کڑیاں رکھے۔ تمام ٹرا حیران ہوا۔ جب عشرت نے اسے بتایا کہ اسے ایک غم میں کام لیا گیا ہے وہ بہت حیران ہوا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ نوٹ لے کر خاموشی سے چلا گیا۔

عشرت نے اپنی جھنگلی چارپائی پر لیٹ کر اپنی بہن کا خط شاید بیویں مرتبہ پڑھا،

پیارے بیٹا!

تمہیں بھی جانتے ہوئے یہ تیسرا سال جا رہا ہے۔ اماں بہت پریشان رہتی ہیں۔ کیا تم کچھ کام کر سکتے ہو؟ ایک بار میں اپنی اماں اور اپنی چھوٹی بہن اور بھائیوں کو دیکھنے کے لئے نہیں کوئے۔ یہاں میں نے سب سے کہہ رکھا ہے کہ تم غم میں ہیر کا کام کر رہے ہو۔ مگر تین سال سے اب تک تمہاری کوئی غم نہیں گھنٹ میں نہیں آئی۔ اس لئے میری بہنیاں اب مجھ سے مذاق کرتی ہیں۔ وہ نہیں سمجھتی کہ تم واقعی کسی غم میں ہیر کا کام کر رہے ہو۔ کچھ بتا دینا بیٹا۔ تم کسی غم میں ہیر کا کام کر رہے ہو۔ وہ غم نہیں گھنٹ میں کب کئے گی؟ تمہیں دیکھتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب تو اگر میں تمہیں غم میں دیکھوں تو دیکھنے ہی رو پڑوں گی۔ جلدی بنا۔ اچھے بیٹا۔ تمہاری غم کب ختم ہوگی۔ ہمارے رئیس گھنٹ میں کب آئے گی؟ اس غم کا نام کیا ہے۔ میں اپنی ساری سہیلیوں کو لے کر آئے دیکھنے جاؤں گی۔ اور وہ جو خاں صاحب مگر عشرت آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک زور کا کھوکھلا قبضہ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ عشرت۔ ہیر کا۔

ایک روز غم کا!

پھر یہ ایک آنسو تیزی سے اس کی آنکھوں میں اُتر آئے اور اس نے اپنی بہن کے خط سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور چارپائی پر اُتر دھا ہو کے گر گیا اور سبک سبک کر رونے لگا۔

دوسرے دن شام کے غمٹ چٹے میں کاشمی پودہ پولیس لائن کے پیچھے پارل کے تختوں میں بے کام اپنے غم کو لے کر آئے شام کے حساب لے رہا تھا اور قہقہے دھول کر رہا تھا۔ کسی نے اس کے شانے

پر ہاتھ رکھا۔ تھام لے چوٹک کر پیچھے دیکھا۔ یہ عشرت تھا۔ مگر تھام اس عشرت کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ عشرت کے چہرے پر غنیمت کا ایک قطرہ تھا۔ وہ ایک مردہ لاش کا چہرہ تھا۔ آنکھوں میں کوئی چمک نہ تھی۔ اور جب عشرت بولا تو ایسے بولا گویا کنوڑی میں سے بول رہا ہو۔

”کیا ہے؟“ تھام نے نڈاؤ دے دیا۔

عشرت نے کہا ”دلا میں تمہارے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ جو بھی تم دو گے کروں گا۔“

تھام ان سے تو بہت خوش ہوا مگر اوپر سے اس نے وہ درشت ہوا اختیار کئے رکھا۔ بولا ”کیا ہمارا جہاں کام ملا تھا۔ ملک کو کام پسند نہیں آیا؟“

”نہیں“ عشرت کے ہنٹ کا پیچھے لگے ”ہم — میں — وہ کام کر نہیں سکا۔“

”اُسے بے درخت کسے پتے۔ کام کرنے سے آتا ہے۔ ایک دوبار کوشش کی ہوتی۔“

”بہت کوشش کی دادا۔ مگر مجھ سے ہوش نہیں ہو سکا۔ بیٹھنے نہ مارا۔ بکر کھجے جان دیا۔ بہت غصا تھا۔ بیٹھ۔ کہتا تھا میرا ایک دن کیا برادر ہوا۔ ہزاروں کا نقصان ہو گیا۔ اُس کے آدمیوں نے مجھے دھتکے لے کے کال دیا۔“ عشرت کے ہنٹ کا پیچھے لگے ”وہ مجھ کا سامنظر تھا۔ تاریکی میں کھڑا ہوا۔ تاریکی کے اندر شعلے کی طرح جھڑکتا ہوا۔ زہری کی سانس لیتا ہوا۔ وہ اُسے بھول جانا چاہتا تھا۔ رُوح کو پرے پرے ہیشہ کے لئے غائب کر دینا چاہتا۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر بار آ جاتا تھا۔ بار بار ٹلنے سے جی آ جاتا تھا۔ اُس سے وہ ہی بھول نہیں سکتا تھا۔ جیسے کسی نے دیکھتے ہوئے سب کے گرم سانس سے اس کی رُوح پر وہ منظر کھینچ دیا۔ وہ جانتا تھا۔ وہ زندگی بھر کے کسی نہیں بھول سکے گا۔“

اور پھر وہ بھی۔ بے شرم۔ بے باک۔ بے حیاءیت کی جی ہنسی۔ بار بار اس کے سہم پر کڑے لگا

پانی شرب۔ بھنگ۔ چرس۔ دنیا۔ مصلحتی امراض کے بھلائے ہوئے کپڑوں کا کھایا ہوا کھوکھلا جسم۔ زینب نے اس کی ہڈی کا آخری گوشہ بھی کھایا تھا۔

یہ ایک انہوں نے مجھے باہر پینک دیا۔ ایک پٹری سے ہرے کی طرح! آئے خدا!

محول جاؤ عشرت۔ آئے محول جاؤ۔

عشرت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لڑکھڑکھ کر نام کے قدموں میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ایک رات کو کاناگانے کے بعد چوتھے پر پڑنے ہوئے اکرم احمد حوئے کے درمیان بڑے
 زندگی بھر کی بحثیں جی بٹ بڑھتے بڑھتے (احتمالی) ختم ہوتی مگر موت، اس جیت چکے، فضل احمد حوئے کو
 کہیں سے نہ بچا سکا۔ کہتے ہیں کہ وہ بڑے بڑے بھائیوں کے پاس سے بھی مدد مانگے مگر کسی نے
 مدد نہ کی۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر میں ہی انتقال فرمایا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائیوں نے
 ان کے جنازہ میں شرکت کی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائیوں نے ان کے جنازہ میں شرکت کی۔
 ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائیوں نے ان کے جنازہ میں شرکت کی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے
 بھائیوں نے ان کے جنازہ میں شرکت کی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائیوں نے ان کے
 جنازہ میں شرکت کی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائیوں نے ان کے جنازہ میں شرکت کی۔

دوسرے کہا: "جے تم لوگوں کی تصویریں دیکھ کر مجھے بڑا غماز ہے کہ سب کی سب
 انہیں اس حد تک پرست ہوتی ہیں۔ قبلی تصویریں کا مزہ ہے تو اس قدر پایا ہوا، گناہ، غم، دہم کا
 ملا ہوا کہ کبھی جنتا ہی نہیں ملے گا۔ یہ کہتا ہوں کہ یہ جگہ نہیں ہے۔ یہ حقیقت نگاری کے خلاف ہے۔ اس میں
 کوئی شبہ نہیں کہ ہم پر بہت غم کا ستم ہوتا ہے۔ ہوتے ہیں۔ مگر ہم اس تصویریں سے بڑھتے ہوئے
 دیکھ نہیں دیتے ہیں۔ ہمیں تصویریں میں دیکھتے ہیں۔ ہم غم کا جواب اپنی بھرپور ممانعت سے دیتے ہیں
 ہماری جود جود بہت ہی سخت۔ اکیسے مگر ہماری زندگی میں ہر روز خدا کی لکھی ہوئی باتیں ہیں۔ یہ سب سچا ہے
 ہے۔ اس میں غم کے قطرے سکتاتے ہیں۔ جب جنت کی نگاہ پر جاوے گا تو جی ہے جب ہم گیت گاتے ہیں

اے ہمارے بچے خوشی سے دُحس میں پھلتے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو کیوں بھول جاتے ہو؟

اکرم نے کہا "اُن لوگوں کی موجودگی سے میں اٹھ نہیں کرتا۔ غریب لوگوں کی زندگی میں ایسے لمبے عرصہ آتے ہیں۔ مگر یہ لمبے بڑے مختصر ہوتے ہیں۔ جو غالب حقیقت ہے وہ غریب آدمی ایک تنگ و تنگ ایک احوال کی ہے۔ اے غالب حقیقت کو بڑا کر کے دکھانا ہمارا فرض ہے"

دوسرے نے کہا "تہا سب سے پہلا فرض ہے کہ تم ایسی تصویریں بناؤ جو ہم دل چسپی سے دیکھ سکیں۔ تہا دی غمیں دل چسپ نہیں رہیں۔ وہ سوکھے ہوئے کانٹوں کی طرح تنگ ہوتی ہیں۔ سالی یہ بھی کوئی تصویر ہے۔ بیرون دیکھو تو لباس تا تاڑ شکل ایسی کہ بچہ نہ بھائی آئے۔ ہر روز دیکھو تو کیلک بٹری کا ٹیڑھا رنگ۔ جہاں موقع ملے نہ ملے تقریر جھاڑ دیتا ہے۔ اے بھائی ہم سنیا میں تقریر سننے نہیں جانتے۔ تقریریں بھی بہت سننے ہیں۔ کامکار میدان میں ہمارے ٹیڑھے یونین کے دیند میں غریب کے متعلق تم سے زیادہ اعلیٰ درجہ پر جانتے ہیں۔ مگر ہم سنیا میں اعلیٰ درجہ پر دیکھنے نہیں جانتے۔ دن بھر کے تھکے اے۔ کام اہم وہ بھی اس گندے ماحول میں جاں گسل کام کرنے کے بعد جب ہم سنیا میں جاتے ہیں تو کوئی ایسی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں جس سے ہمارے تھے ہوئے مصیبت کو سکون پہنچے۔ آنکھوں میں طراوت آئے۔ دل کچھ اس طرف اُٹل ہو کہ یہ دنیا اپنی تمام حقیتیں اے محرومیوں کے باوجود اتنی بڑی جگہ نہیں ہے کہ وہ سنیا ہاں سے نکل کر خود کشی ہی کر لیں جاتے۔ اے میں تم سے کچھ کہتا ہوں۔ تہا دی بہت سی تصویریں کہہ چکے کہ واقعی خیال ہوتا ہے کہ یہ دنیا اتنی بڑی ہے۔ حالات اس قدر پریشان کن ہیں۔ محانت کوئی کام باز اس مسئلہ سے کہ خود کشی کے سوا کوئی اے چارہ ہی نہیں۔ میں تم سے کچھ کہتا ہوں اکرم بھائی۔ تم لوگوں کی تصویر ڈاکٹر میں آؤ میں دیکھ کے اُٹھا آؤں"

اکرم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے تھنے دو تھن بار تیزی سے ۲ پنے۔ اے اے اپنا فون تیزی

سے گھنٹیوں کی طوط جاتا ہوا معلوم ہوا میں تہا سب سے ایک پڑے کھے باشعور مزید سے ایسا

ہیں مٹ رہا ہوں، جو کہ تم کبہ رہے ہو اس کا تریہ مطلب ہوا کہ زندگی کے صحیح حقائق سے موڑ ہو کر دلچسپ تصویریں بنائیں، یعنی ایسی دلچسپ تصویریں جن سے تمہارے نکلے ہوئے عقاب کو سکون ملے تو بلا غلطہ دل دلاؤ گی تصویریں کا غلطہ ہے۔“

دوسرے نے غصے سے کہا: ”تم میری بات نہیں سمجھ رہے۔“

گرا کر مرنے لڑک کے کہا: ”میں خوب جانتا ہوں یہ دل چسپی کا غلطہ، سکون اور اطمینان کا غلطہ فراہم کا غلطہ ہے جو زندگی کی غالب حقیقت جیسا کہ اس سے موڑ ہو کر دلچسپی کہانیاں، پیہم پہنچاؤ یا امداد حال کی تصویریں بناتو۔ جتنی ترغیب دینے والے ناچ گانے رکھو۔ وہ آنکھوں کو بہت جلدے ملوڑ ہوتے ہیں۔ یا بعض خوشنیل فینڈا سی بناؤ۔ اور دین کا بیٹا، جنداد کا سندی، شاہی حرم، کنوڑی کینڑ، ایسی زندگی جو خود آج کے عرب ملکوں میں کہیں نظر نہیں آتی، اس کی دکھائی کر کے دوسرے ملکوں کے کچھری بے عزتی کر کے اپنی جیبیں بھرو۔ تم کیا۔۔۔۔۔“

دوسرے نیچے میں ہل اٹھا، تم بات کو سمجھنے نہیں، نیچے میں کھاس کر کہنے لگے:۔۔۔۔۔“

”کھاس تم کرتے ہو“ اکرم نے جواب دیا۔

دوسرے کی آنکھیں پلک پلک کے شہرہ ہو گئیں، پھر وہ غصے کو پکڑ گیا، پھر اس کے پیسے پر ایک۔۔۔

بیبی سکواٹ آئی، وہاں سے ہلا، اکرم بجائی یہ کھاس نہیں ہے، تم مرنے اپنے کتابی ذوق کے بل بوتے پر، اپنے کتابی علم کے بند پر تصویریں بناتے ہو اور اس نے ہام رہتے ہو۔ کس نے قبلی اور جلد سے دوسرے ساتھیوں کی تصویریں ہام رہی، کہیں تم نے اس کے بارے میں سوچا یا تو تم نے صاف میں اپنی ہامی کی بر تصویریں گھر رکھی ہے جس میں تم لوگ اپنے آپ کو ترقی پسندی کا شہید سمجھتے ہو، اس سے ملک بٹ کر سچنے کے لئے تم باہل تیار نہیں ہو، میں تم سے کچھ کہتا ہوں تم شہید نہیں ہو سمان فرمائیے گا آپ لوگ شہید نہیں ہیں، اپنے تمام علم کے بل بوتے آپ جاہل ہیں اور میں یہ ثابت کر سکتا ہوں۔“

دوسرے نے اپنی ایسی پہلی پھاڑیں ادا کر لیں کہ کچھ پھر متوجہ نہ کیا ہوں سے فضل میں دیر نہ
 باہرام احمد دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔
 "مہبت کرو" اکرم بلا۔

"کتنا ہیں۔ مگر پہلے میرا نام سے ایک سوال کر لیں۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ جنس میں کیا بڑی چیز
 ہے۔ ایک مرد۔ ایک عورت۔ جراثیم، زہنگی میں پہلی بار جنس سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہنچتے
 ہیں۔ اس میں کیا بڑی بات ہے۔ کیوں یہ ایک ایسی غم کا نملہ نہیں بن سکتا۔ آج احمد جاننے کے تم سب
 لوگ اس قدر غلط نظر آتے ہو۔ تم سب لوگ اسی بات پر متوجہ نظر آتے ہو کہ ایسی تصویر بنائی جانے میں ہیں
 کہ تم نے کم آج احمد جاننے ہیں بلکہ اگر اس کی زبان تو وہ سب سے زیادہ تعلق پسند غم ہوگی۔ سیٹ جتنے
 بڑے ہیں گے، پکڑے جتنے پکڑے جتنے پکڑے ہیں گے، سنا دھوا سنا جتنا زیادہ ہوگا، سنا سنا جتنے تم کی ہیں گے
 اتنی ہی زیادہ تعلق پسند غم ہوگی، احمد حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی جانے گی۔ تم یہاں کیوں سوچتے ہو میں تم سے
 پر جو کتنا ہیں آج احمد کا زور میں کیا بڑائی ہے۔ ہمارے کچھ کھلیک شاندار حد میں یہ پڑانے لوگ آج
 احمد شگیت۔ تم ان غلوں لطیف سے ہمارے لوگوں کو اپنی غلوں میں ان سے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہو۔ لوگ
 آج ہمارے کے ہمارے جنس سے متعلق نہیں ہیں۔ لیکن کہیں میں بھی تو اس میں کیا بڑائی ہے۔ کیا تو ایسی عورت
 کی بہت۔ کیا جنس کی عمروری یا اس کی نشاۃ الہیہ کیفیت ایک آج میں ظاہر نہیں کی جاسکتی یہ کس قسم کی ترقی
 پسندی ہے۔ تم کہنا چاہتے ہو یہی نگاہ ہندوستان کے مزدور احمد کلاس اس قدر پہلے ہوئے احمد کھٹے ہوئے
 ہیں ان کی زندگی میں مدنی کی جود جود اس قدر شدید ہے کہ انہیں ہنسنے کے لئے آج احمد جاننے سے
 جفا خانے کے لئے نہ تو ان کے پاس وقت ہے انہاں کے پاس اس کا طریقہ ہے۔ مگر وہاں انہیں
 غلام ہیں احمد میر پرستان ہیں۔ اس لئے تہلری تصویریں چلادی احمد کی حاصل کرنے میں اکثر ناام
 رہتی ہیں۔"

اکرم نے کہا "تم پر اہم تبدیلی طرح تصویریں دیکھنے والوں کے اندر خرابی گھنٹی تصویروں
زیر سرائیت کر چکا ہے۔ جو حقیقت ہم اپنی تصویروں میں بیان کرتے ہیں وہ بے حد متغیر ہے۔ تم لوگ نہ
گول نہیں کرتے۔ مگر ایک وقت آئے گا۔"

کب وہ وقت آئے گا؟ دوسرے نے جفا کے کہا "اگر تم آج کے سان کی کویتے ہو آج کے
لوگوں کو ان میں سے کچھ نیکو دل بھی ہونی چاہئے۔ جب یہ سان ختم ہو جائیں گے تو انے والی نسلوں کو
ان میں صحت تدبیر کی دل بھی نہ جانے گی۔ مگر یہ غریب۔ یہ بے مدد کی۔ ساشی پریشانی آج کے حقائق
ہیں جن میں کاج کھانے کے لوگوں کو گہری دل بھی ہونی چاہئے۔ پھر وہ کیوں تبدیلی نہیں نہیں دیکھتے
کیونکہ دوسری نسلوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سارا باطل مانت ہے۔ تم ان نسلوں کو جمع نہیں کر سکتے
نہیں پیش کرتے اس لئے وہ غیور چپ اور خشک رہتی ہیں۔"

"دوسرا مکر، ایچ کے بہت سے کھلے ہیں اس طرح کی تصویریں بنا رہی ہیں۔ جو رت
نے بحث میں حصہ لے کر کہا۔"

"دوسرے کھلے کی نقل میں بخلی پر بخلی سے لے کر دوس میں سر کی میں بدمانیہ میں اٹلی میں
لوگوں کی دل بھی کہتے اور بہت سے سامان ہیں۔ دوس میں تھیرا اسیلے بہت ترلی یا نہ مات میں
ہیں۔ پھر ان کھلوں میں ٹیلی ویژن ہے۔ بھڑک اہل میں۔ اور پیرا اڑس میں۔ گنتی تھیرا ہیں۔ ٹھیکت اور
ناج کی پڑیاں ہیں جو کائنات اور حیوان میں جا جا کے ہاں کے لوگوں کے فن اور ذوق کی تکیس
کرتی ہیں۔ یہاں پر کیا ہے؟ تھیرا۔ ٹیلی ویژن۔ ٹھیکت پائی۔ نہ ناج کا انتظام لے دے کے محدود
طریقے پر ایک نیلہ گیا ہے جس میں دس گنے فرخ کر کے عوام بلکتے ہیں۔ اس لئے دس آڑوں میں
اگر یہ چاہتے ہیں کہ ناج بھی دیکھ میں۔ گانے بھی میں۔ زندگی کے تلخ خبروں کے ساتھ تھوڑا سا
اس جو میں۔ تھوڑا سا جنس بھی میں۔ مگر وہاں تمام باتوں کو ایک ہی غم میں لپکا ہوا ہے۔ کچھ پاپا ہے

پڑے اور بحث ختم ہو گئی۔

اور سب کے لئے تو بحث ختم ہو گئی تھی لیکن دو آدمیوں کے لئے یہ بحث ختم نہ ہوئی تھی۔ راست کے سناٹے میں جب سب سرگئے تو اکرم دیر تک جاگتا رہا اور اس بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ موضوع کے انتخاب اور انداز بیان کی چٹائی میں اس کے ہاں اور اس کی طرح سمجھنے والے دوسرے دوستوں میں کوئی کمی نہ تھی مگر کوئی کمی تھی کہ کیا کہ وہ لوگ اپنے جوش میں یا تجربے کی کمی کے باعث یا دونوں باتوں کی وجہ سے جود کہتا چاہتے تھے اُسے صحیح فہم نہ تھی کہ نہیں پاتے۔ دوسرے اور حیرت نے آج جو باتیں کہیں ان میں بہت چٹائی تھی۔ ہر ایک کے اپنے مخصوص حالات ہوتے ہیں اس کی اپنی کچھری ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اس کے فنون لطیفہ کی ایک مخصوص قوی ہوتی ہے۔ ایسی چیز جو دوسرے کو ملے یا تو اس سے مستعار لی جائے اُسے بھی دوسرے ملک میں جا کر وہاں کی زندگی میں اپنی جڑ پکڑنا پڑتی ہے۔ ورنہ وہ مڑھا جائے گی۔ اکرم کی تمام خبروں کی طرح ——— اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اکرم نے غصہ کس کیا۔ اس نے بہت شدید غصیاں کی ہیں۔

اکرم دیر تک یہی سوچتا رہا اور بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک اور آدمی بھی برابر جاگ رہا ہے۔ وہ بھی اس کی طرح سوچا نہیں۔ اسی بحث کے مختلف پہلوؤں پر وہ بھی غور کرتا رہا ہے۔ وہ ستیہ رائے تھا۔ . . . اکرم کو بڑی حیرانی ہوئی۔ جب ستیہ رائے نے اس کا نام لے کر پوچھا کہیں کہ اس پوری بحث میں ستیہ رائے نے اب تک کوئی حق نہیں پایا تھا۔

”اکرم؟“

”ہاں۔“

”جاگ رہے ہو؟“

”اں۔“

”اس بحث کے حلق میں ایک بات سرخ رہا تھا“

”کیا؟“

”تیرے کدوٹ بدل کے اکرم کے قریب ہو گیا۔ سرگوشی میں دوا بنگ دوسرے سونے والے جگ نہ جائیں۔“
 ”جیسے کوئی دل چاہی نہیں تھی۔ تبدیلی غلوں میں یا جس طرح کی غلیں تہلے دھت ہلاتے ہیں۔ میرا
 مطلب ہے کہ ذہنی دل چاہی تو نہیں مگر کرشن اقبلے جب غلیں اکرم پر نے گلیں تو ایک بے چارہ ہر کہ
 دلال کیا کرے گا“

”دوست ہے اکرم بلا۔“

”مگر۔۔۔“ تیرے نے ایک بے وقوف کے بد کہا ”مگر آج کی بحث سے میرا یا خیال ہوتا
 ہے کہ اگر میرا مطلب ہے ٹھیک طریقے سے یہاں دوسرے اور محنت کتے ہیں۔ ٹھیک طریقے سے ان
 باتوں کو رکھا جائے۔ ایک غم میں تو بھائی نکلن ہے وہ غم کامیاب ہو جائے۔ چانس زیادہ ہے۔“
 اکرم چپ ہوا۔

تیرے نے بلا ”کیا کہتے ہو“

”اول۔ ام“ اکرم نے جواب دیا۔

تیرے نے آہستہ سے ہنسا ”ہر نہیں ماننا چاہتے خیر ٹھیک ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اب کے تم
 ہم ل کے ایک تصویر بنائیں۔ ایسی ہی۔ ان نئے خیالوں کو اسی طریقے سے پیش کریں؟ کیا خیال ہے؟“
 اکرم نے کہا ”کل کی روٹی کا تو کچھ پتہ نہیں تصویر بنانے چاہیے۔“

تیرے نے کہا ”میا۔ تم تیرے کو نہیں جانتے بنگالی ہیں کا سنتھ۔ دنیا کو ہر دور کا ایک ہننے
 میں دو ٹیری ٹیری (خمی طاتے) بنگالوں کا۔ اور بڑی ٹیری ٹیری (مستند پار کے طاتے) توڑوں ہنگی
 بجاتے جاتے گا۔ اور اس کے بعد بنگال۔ بنگال میں اہر نیر گھوش ڈسٹری بیوٹر میرا پناہ دوست ہے۔“

جب وہ ٹیری ٹریاں حل گئیں تو ہرزناس مابیل کنایا شکل ہے۔ رکھا۔ بازو ۱۱۰۔ کیپٹا اور کنگھے کے
پھنڈیا کر جاتو بیٹا گلے پر۔

اپنی انیم سرگشی میں بیان کرتے کرتے تیریلے اس قدر جوش میں آگیا کہ اس نے آخری فقرہ
بہل چلنے کے بعد اس کی پاٹ دلاؤ دوس کے پرستے پرستے ہوئے دوسرے ساتھی بلکہ اس پاس کے
ہستے لوگ جاگ گئے اور چہرہ کی صدا میں بند ہو گئے۔ مگر کرم نے ہنس کر سب کو بتادیا کہ کچھ نہیں ہوا
تھا۔ تیریلے خواب میں بھلا ہوا تھا۔

”دیکھتے جاتو۔ میں بھلا نہیں ہا ہوں۔ ایک صف میرے خواب نمود پڑا ہوا“ تیریلے نے سالہ صرچ کے
ساتھ سر ملاتے ہوئے کہا۔

اور واقعی صرچ سے ایک ماہ گزرا ہوا کہ تیریلے اپنی تصویر کی مدد ٹیری ٹریاں بیچنے میں
کامیاب ہو گیا۔ جیسا اس نے وعدہ کیا تھا ایک تو اسے سیر اور دوسری جمال کی ٹیری ٹریاں نے بھی
دی اور کانٹریٹ کے کرم کو دکھایا۔ اس کانٹریٹ میں تصویر کا نام تھا ”طوفان“ اور اس کا ڈائلنگز
کرم تھا۔

کرم بولا ”مگر تم نے مجھے بتایا نہیں اور غم کا ہم رکھ دیا“ طوفان کی کہانی کیا ہوگی؟
”اب میں کیا جانوں“ تیریلے نے بڑی معافی سے کہا ”اب کہانی تم بتاؤ۔“ ہٹری پرٹر کہانی ۱۲۳
پرچھا تھا۔ ہم تارے فریزر کانٹریٹ کیسے ہو سکتے ہیں۔ غم کی کہانی ہم بھی دینا چاہتا۔ میں نے اپنا نام نہ دیا۔
تیریلے ہنسنے لگا ”نہرا“

”اے کہنی کا پتہ؟“

”صرف فٹ پاتہ یعنی فی احوال قوی پتہ ہے“ متیلہ نے ہنس کر کہا ”مگر تم دیکھتے باز وہی طرح ایک
نہ ایک سڈنڈا ناس بھی ماسل کر لوں گا“

”سپ سپ ہڑے!“ اکرم اندر سے بولا۔

”خانی مت کرو، معاملہ بہت عجیبہ ہے“

”ہوں؟ کیسے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ اکابر لڑی روڈ پر ایک سنگی سیٹھ کی بیڑی ہے۔ میں وہاں بیڑی پر گیا تھا۔ سیٹھ نے
کہنے لگے وہ سیٹھ پوڈیوسروں کو پکڑ کر دی رکھ کر اس پر روپیہ دیتا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔
ہلکی پکڑ کو فانس کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس نے مجھے کہانی بھی سنی۔ کہانی اسے بہت پسند آئی
اکرم نے کہا ”تم نے اُسے کہانی بھی ساری۔ کیسے؟“

”بوسرے ہی میں آیا میں نے بڑا چڑھا کر اُسے سنا دیا۔ ان معاملوں میں تم جانتے ہو جب میں اپنی باتوں
پر آجاتی تو کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے ایسے گرجتے گونجتے افلا میں اُسے کہانی سنائی کہ وہ دھکیا پر
چت ہو گیا۔ اس نے میرے گھٹے پکڑ لئے۔ ستیہ بابو ایسی کہانی میں نے زندگی میں نہیں سنی۔ میں نے
کہا تم کیا جانتے ہو۔ یہ کہانی کسی جھوٹے موٹے فلمی مشی کی کہانی نہیں ہے۔ اسے یہ کہانی انٹرنیشنل شہر
پانڈاویب اور شاعر ہندوستان۔ پاکستان چین۔ جاپان اور افغانستان کے عظیم فن کار جناب اکرم بابو کی ہے۔
اکرم بابو تم مجھ کو مدعو۔ میں نے جہلا جہلا فٹ پاتہ یعنی اٹھایا۔ بھالیہ پر ملا دیا۔ بھالیہ اٹھایا ایشیا
پر ملا دیا“

”مگر کہانی کسے سنائی تم نے؟“ اکرم متحیر ہو کر بولا ”کہانی تو“

متیلہ نے اس کی بات کاٹ کے بولا ”گھبراؤ نہیں اکرم بابو۔ کہانی وہی تیار ہوگی جو تم چاہو گے۔ ان

یہ سب کچھ کہانی کہاں یاہو تھا ہے، اور گریا رہے گی بھی تو کہہ دیں گے ہم نے بعد میں بدل دی۔ اس وقت بہت سا جڑا کام تو فائنس حاصل کرنا ہے۔ سراپہ۔“

”مگر سراپہ کیسے حاصل کیا جاتے۔ یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے“ من جیت سنگھ نے کہا۔ ”ایک ہے سردار گورکھ سنگھ۔ کڑی کاٹھن کھڑا تھا کسی زمانے میں۔ مگر وہ صرف ٹیکسیوں پر روپہ دیتا تھا“

”ارے ان دو چار ہزار سے کیا ہر گا“ ستیہ رائے نے مسکرا کے کہا۔ ”من جیت سنگھ ہی یہاں تو لاکھوں کی بات ہو رہی ہے۔ کم از کم ایک لاکھ ساٹھ ہزار چاہئیں۔“

جسوت نے کہا۔ ”تم اس پڑھی دے سینکڑی بات کر رہے تھے۔“

”ہاں! وہ تیار ہے ڈیڑھ لاکھ دینے کے لئے۔ مگر ایک ٹیری فوری ادھک ہائے جب دے گا۔ کہتا ہے شالی ہند کی ٹیری فوری بیچ کے دکھاؤ۔“

”تو بیچ کے دکھاؤ“ دھوتہ بولا۔ ”دو تو تم نے بیچ ہی ڈالی ہیں۔۔۔۔۔“

”ارے میرا پس چلے تو میں سینکڑی بیچی ہی بیچ کے دکھا دوں مگر میرے ہاتھ میں بھی تو کچھ ہو چکا ہے شام تک مگر سینٹ، اپنی بیڑی کا خرچ نہیں چلا۔ خیر وہ سب چھوڑ دو۔ ستیہ رائے یہ کہہ کر گھٹک گیا اور سنجیدہ ہو کے بولا۔ ”بات یہ ہے دوستو کہ پچاس فی صدی کام ہو گیا ہے۔ اب پچاس فی صدی کام باقی ہے۔ اس میں کچھ تھوڑی سی حد تک گدگد کر دو تو جینڈا ایشیا پریگر جائے۔“

”کیسے؟“ فضل نے پوچھا۔

”بات چیت چکر کہ خیم کے بارے میں ہو رہی تھی اس نے جتنا بالکل غامض سنائی تھی۔ اس فلم کا تذکرہ میں کر رہا تھا۔ پچاس فی صدی تھی۔ اس نے ابھی ابھی سردھریا تھا۔ اس نے اس کے بال کٹھے اور گیلے تھے۔ اور وہ اس ساری گنگو کو غور سے سنتے ہوئے بار بار تو کہتے تھے اپنے بالوں کو کسکائی جاتی تھی۔ باہر ادم کی بھی دندیدہ کھاہوں ہے اس کی طوت دیکھو جیتا۔ اس کا چہرہ اس وقت ایکسو تم کتے

کی طرٹ لاپٹی دکھائی دے رہا تھا۔ بنانے کے بعد جہانِ موت کی رنجت میں جہانِ زندگی اور بھلا آ جاتا ہے اس نے باہر دم کو بالکل بہت سا گھرا دیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس کی جلد کی خوشبو تک سونچ سکتا ہے۔ وہ بار بار نظر فرما کر اس کی طرف دیکھ لیتا اور جب دیکھتا تو سر سے پاؤں تک اس کے بدن میں اُک سی لگ جاتی۔

”دیکھو میں غمِ بزمِ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں،“ ستیا رائے نے سب کو بھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تیسری ٹیری ٹوری اس طرح نہیں کہے گی جیسی یہ پہلے دو کہ گئیں۔ نہ پٹری ولا سیٹھ اس طرح خاص کرے گا۔ اب وہ موقوفہ آگیا ہے کہ نہیں بلڈنگ ہاسٹنٹی میں ایک کمرہ دیا جائے گا۔ وہ غمی دفنوں کا گڑھ ہے۔ ہم ڈسٹری بیوٹر لگ رہا ہوں پر دفن آتے ہیں۔ پندیاں دفن لینا چاہے۔ میں نے بلڈنگ کے نمبر سے بات بھی کی تھی مرن تن، ماہ کا کرایہ مل گیا دینا پڑے گا۔ پونے پانچ سو روپیہ، پھر کچھ خرچ ہو جی چاہئے، وہ تو خیر کرائے پر آ سکتا ہے ایک چھڑی رکھنا پڑے گا۔ پہلے دفن میں دن دفن کھولا جائے گا اس دفن کا ہوسٹ بھی ہو گا۔ میں بہت سے ڈسٹری بیوٹروں کو جازوں گا۔ اس دن پٹرے بانٹے جائیں گے۔ ایک پاس روپے کا درخت اس درخت کا میں جتنا ہوں ہمارے پاس اگر شمس مات سوٹھے ہوں تو ہم مل سکتا ہے۔ تیسری ٹیری ٹوری ایک سکتی ہے۔ پھر رہنا سکتی ہے۔ جمنڈا گڑ سکتا ہے۔“

”مات سوٹھے اکٹھے کرنا ناممکن ہے۔“ اکرم بولا

”کیا ناممکن ہے؟“ فنیہ نے جوش سے کہا۔ ”پانچ روپے میں دیتی ہوں۔ جس روپے میری پہلی رضیہ خریدی میں روپے میری پہلی رضیہ کا موقوفہ گا۔ چھتیس روپے تو ابھی میرے نام لکھو۔“

”مہترے“ جسوت کالی بھالکے بولا۔ ”تھی محنت شرم دلا رہی ہے۔ اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

کیوں دھوئے؟

میں چاند پے دلوں کا۔۔۔ دھوئے اتا باٹا سو فکڑ کر بولا۔ ”لیکن میں اپنی جلی میں بات کروں گا

اگر مزدوروں کی بھرمیں بات آگئی تو ————— پہلی تاریخ بھی قریب آ کر چھا ہے جس میں کہیں جاے گا۔
 یہ سفتیس چار آٹا لیس " اکرم ہوا۔

فضل ہوا " میں اکٹھی رستم تو نہیں دے سکتا لیکن ہر روز کی کٹائی سے ایک روپیہ دے سکتا ہوں۔ ایک
 ہینڈ بک۔

" فضل؟ تیس روپے؟ ابے سالے! " سن بیت ننگو جلدی سے تازہ گاکے اٹھا اور وہ کوئی بہت بڑی
 رقم برتنے والا تھا کہ یکایک اسے اپنے چھوٹے بھائی کرنا کا خیال آیا اور اس کا منہ کھلے کاٹھارہ گیا۔
 اس کا چہرہ جواس وقت شاہیں اور ایک سترت آمیز بک سے تاہاں نظر کر رہا تھا یکایک بجھ گیا۔ ایک سایہ
 سا اس کے چہرے پر آگیا۔ اس نے یکایک اپنا کٹھا ہوا منہ بند کر لیا، سر جھکا لیا اور ہوا " میں ————— میں
 ————— دس روپے سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔ وہ بھی بیٹے بھر میں وہاں کی طرح میرا بھائی
 کرتا رہے گا۔ " وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ فضل نے اسے گلے سے لٹکایا۔ اس کی پیٹھ پر تھپی دے کر
 ہوا " ابے ڈھونگی کے دس روپے کم میں کیا؟ تباری طرٹ سے میں تو نکلیا ہوں۔ تیرے لپوڑ کرنا کی
 پڑھائی کا خرچہ ہے۔ کیا ہم نہیں کہتے ہیں؟

جنون ہوا " آٹھ آنے روز کر کے ایک بیٹے کے لئے بھر سے بھی لیتے جاؤ "

" واہ! واہ! " رفیع نے زور سے نالی بھائی۔ پھر وہ باہرام کی ملن دیکھ کر بولی " اور تم ————— تم کیا
 دو گے؟ "

باہرام ددرو پے کہنے والا تھا کہ جب اس نے رفیع کو مخاطب ہوتے دیکھا تو وہ بالکل کھڑا
 سا گیا۔ اس کی زبان بند ہو گئی۔ رفیع کا میٹھا خرتم سراں اُسے اُٹانے کا " تم کیا دو گے؟ " تم کیا
 دو گے؟ " اس کی آواز اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔

یکایک باہرام نے ہفتہ کے کہا " بس روپے " وہ اتنی زور سے بولا کہ اسے خود بھی اپنی آواز پر حیرت

ہوئی دوسروں کو اس کی آواز پر نہیں اس کی نیا نئی پر حیرت ہوئی۔ باہرام میں روپے۔ وہ لے لگائے؟
جسوت نے کہا ”کچھ کم کرو۔ جگہ بہت میں زیادہ بول گئے ہر شاید“

”نہیں نہیں“ باہرام نے اڑکے کہا ”میں میں ہی دوں گا۔ چاہے اس پہلی کو لے لو“
”اور جتنا دیر ہی تم؟“ رفیع نے مڑ کر جیسے پرچھا اور باہرام کو بے مدافعتی ہوا کہ رفیع نے اس کی
نیا نئی اور حرکت پر تالی نہیں بھائی۔ وہ لے اس طرح بھول گئی جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ لے دوسرے
لے میں اپنی حماقت پر بہت نفرت آیا۔ وہ خواہ مخواہ میں روپے بول گیا۔
”اسے یہ کیا دے گی“

من جیت سنگھ جواب تک نیم دراز حالت میں چوتھرے کے ایک طرف بیٹھا ہوا تھا ایک ایک کھڑا
ہوا۔ سب جانتے تھے کہ من جیت سنگھ کو جیسے بڑی نفرت ہے۔ وہ جب ہی کا پڑھنے والا۔ تو جاپاٹھ کا
پر سیا باقاعدہ دگر دوسرے ہانے والا۔ دھرم کرم کا سچا سادہ لوح بلکہ تھا۔ اُسے جیسے اس کے انہی کی
وجہ سے سخت نفرت تھی۔ ہاں سچی میں بھی جب اس نے دیکھا کہ وہ کتنی کٹھن ہے اور کس طرح ایک ایک
پانی پر جان دیتی ہے تو اس کی نفرت اور بھی بڑھ گئی۔ مگر اس کے ساتھ اور دوست اس کے اس دینے
کو چند نہیں کرتے تھے اور وہ جیسے جہاں تک ہو سکے بستی کے دوسرے عام لوگوں سے بہتر سلوک
کرتے۔ اس نے من جیت سنگھ بھی اس کی موجودگی کو چوتھرے پر برداشت کر لیا تھا۔ پھر گرجنا پیسے
ہست پر جان دیتی تھی مگر ان کے کئی طرح کے کام یوں ہی کر دیتی تھی۔ لافین کو صاف کر کے چوتھرے پر
لٹکانا۔ چوتھرے پر بھاڑ دینا۔ ان کے کروں کی مخالفت کرنا کیوں کہ وہ سب لوگ تو اپنے کام سے باہر
پلے جاتے تھے تو وہی ان کی جھونپڑیوں کا خیال رکھتی تھی۔ ان میں سے اگر کوئی بیمار پڑ جائے۔ اور یہ کام
ہوتا تھا۔ تو وہ دوا دار دلاتی تھی۔ ان کی تیمارداری کرتی تھی اور یہ سب بالکل خاموشی سے۔ چپ چاپ
ایک لٹکا ہونے بغیر عوام جیسا اس قدر خاموش رہتی تھی گویا اس کے سونہ میں زبان ہی نہیں۔ بس خالی

ہوں ہاں یا نہیں سے اپنا کام چلائی تھی۔ اس کے برعکس نے بنائے پوچھا تو پشیمین اس کے کہنا پر بڑی
 من جیت لنگھنے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اسے یہ کیا کہنوس نکلی فرس عہدت کیا دے گی اس
 اس کا دمن ست اور ستیہ باو تہاری پکھر نہیں ہو جائے گی۔ یہ تو درجیلے دھیلے پر جان اڑتی ہے۔“
 سب نہیں پڑے کیوں کہ یہ سچ تھا۔ بننا واقعی مدپے پیسے کے معاملے میں بڑی کہنوس تھی۔

”اب مت کہو“ فضل نے بنا کو ٹھپاتے ہوئے کہا۔ ”ہاری بننا گزٹلنے پر آجائیں تو تہاری ساری
 پکھر غور بننا ڈالیں۔ جھونڈے میں اتنا ڈھیر بارود پیرا بارک کا ہے۔ جانے مرنے کے بعد ہم میں سے
 کس کے نام وصیت کر کے جائیں گی۔“

پھر سب ہنسنے لگے مگر رنیمین نہیں، بلکہ اس کے اٹھے پر نہیں پڑ گئے۔ اس نے ہنسا پر پکڑنے کے
 کہا۔ ”اجھا مذاق جانے دو کہی۔ بولو بننا دوی کتنے مدپے دو گی تم؟“ رنیمین بڑی ہاجت سے بولی۔
 بنا کے ہونٹ کاٹنے۔ اس نے اپنے سونگے ہوئے بوٹوں پر نہان پھیری۔ آتش بار تھا ہوں سے اس
 نے من جیت لنگھ کی طرٹ دکھا اور اپنی ”ایک روپیہ“

”انقلاب زندہ بار!“ من جیت لنگھ دونوں ہاتھ اور پراٹھا کے بولا اور پھر اکرم کی طرٹ کے کہنے کا غضب
 ہو گیا اکرم بار۔ یعنی میں تم کو انقلاب لے آئے۔ ابھی تک بنانے ایک روپیہ تو کیا ایک چھلام تک کسی نیک کام
 کے لئے نہیں دیا تھا۔ یہ تم نے کیا کر دیا۔ میرے خیال میں تو یہ بڑھا تم پر۔۔۔“

”جی! جی!“ رنیمین نے اسے ٹوکے ہوئے کہا۔ ”من جیت لنگھ گوا پنا فقرہ پڑا نہ کر سکا پھر ہی بنانے پر
 یا تھا کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ فضل سے اٹھ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد رنیمین نے کہا۔ ”تھیں ایسا نہیں کہنا چاہتے تھا۔“
 ”ہاں! ہاں! یہ بہت بڑی بات کی تم نے!“ ایروام نے رنیمین کی تائید کی۔
 ”اجھا یاد۔ من جیت لنگھ ہمارے بولا۔“ آخرو نہیں کہوں گا۔ اب تم آگے چلو۔“

وہ ہمیشہ ہی کہتا تھا آئندہ نہیں کہوں گا مگر پھر کہنا تھا۔ لوگ اس کی طبیعت کی کڑھری سے ہمت
 نہ تھے، چپ ہو جیسے۔ اکرم نے کہا "میں ابھی کچھ نہیں دے سکتا۔ مجھے مہینے کے بہت سے روپے ادا
 دینے ہیں۔ اس رقم کے چکاوٹ کے بعد البتہ . . ."

ستید رائے نے چٹا کے فوراً کہا "ارے تم سے تو بہت سے کام لینے ہیں۔ کہانی میگزین پر مکالمے، ڈیٹ
 کاری سب تمہاری ہوگی۔ تمہیں تو ہم اپنے پاس سے کمروں کے "پھرو پٹ کے ہول" سلب کرو کتنی
 رقم ہوتی ہے۔ یہ سب رقم میں دوستوں کو واپس کروں گا۔ ایک ایک پانی۔ سود میت۔ پھر سنسر ہو جانے
 کے بعد میں پروڈیو سروسوں گا۔ اکرم ڈائریکٹر ہوگا۔ رقص کا ایک شاندار رول ہوگا۔ اکثر لوگوں پر ایک
 پانی فریج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بستی کے سب لگ جالے ساتھ فلم میں اکثر لوگوں کا کام کریں گے
 وہ ریو سات یوں نکل جائے گا۔ ایسا پرجنڈا اگڑ جائے گا"

اکرم کا نذر پر حساب کرنے لگا۔ رقص نے توڑے سے دو ایک باروں کر جنک کر جنک کرتے
 ہوئے ان کا بوجھ باندھ لیا۔ باہرام اس کی گردن کے صراحی وار غم کو دیکھنے لگا اس کا بھی چاہا کہ وہ اس
 غم پر آہستہ سے اپنی انگلیاں پھیرتا پھلا جائے۔ اتنی زندگی گزر گئی تھی۔ آج تک کسی جوش محبت نے اس کی
 طرف منکرا کر نہ دیکھا تھا۔

اکرم نے کہا "ایک سو پندرہ روپے جوتے ہیں۔"

"اب ہمیں چاہئیں سات سو روپے" ستید رائے نے بڑی آوازی سے کہا۔ جیسے اس کی بلند بواہر اسیلا
 کا قصر یکایک زمین پر آگیا ہو۔

سب چپکے ہو گئے۔ پانچ، دس، بیس، سو کی بھی بات ہوتی تو وہ لوگ کچھ کرتے مگر اس
 چور سو روپے۔ بہت زیادہ فرق تھا خواب میں اور حقیقت میں۔ اتید میں اور سلامت میں۔ آسمان میں
 اور زمین میں بہت زیادہ فاصلہ تھا۔

سب کے چہرے ایسے انداز اس نظر آنے لگے۔

اکرم نے وہ کاغذ کا پرندہ ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے ترش رو ہو کر کہا ”ہٹاؤ۔ گولی مارو“

لیکن اس کے چند ماہ بعد جب نئے ماہ کی پہلی تاریخ کو دھوئے نے اکرم کو تین سو روپے لاکے دئے تو وہ چونک پڑا۔ دنگ رہ گیا۔ اور جب دھوئے نے لے لے بتایا کہ یہ تین سو روپے مزدور دن نے اپنی خون پسینے کی کمائی میں سے دو دو پار پار کرنے کر کے دئے ہیں تو اکرم کی آنکھوں میں آنسو گئے۔ اکرم نے روپے گننے کے ستیرائے کو دئے۔ ستیرائے کا چہرہ اس طرح کھل گیا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں کے اندر کچھایا ہوا لب آکر کر نیا لب روشن کر دیا ہو۔ اس کا چہرہ اچھلا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ”مجنتا کا لڑیا!“

رفعیہ بولی ”میں نے اپنے ہاں ڈالسنہ زونہ میں بات کی تھی۔ وہ لوگ ہماری تصویر میں منت کام کریں گے“

”بھڑے!“ اکرم نے تالی بجائی۔

”اے ہاں۔ یہ دس روپے رفیعہ نے دئے ہیں“ رفعیہ نے اکرم کو دس روپے دئے۔ اکرم نے ستیرائے کو دئے۔

”ذمائی تین سو روپے اکرم نے سوچتے ہوئے کہا ”کہاں سے آئیں گے؟“

”سوہیں گے! سوہیں گے!“ ستیرائے نے خوش ہو کر کہا ”غیر باز۔ میں کل جاکے نہیں بڑھنگ

کے سینہ سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ کم ایڈوانس یعنی پیرا منی ہو جائے ؟

وہ رات بہت تاریک تھی۔ آسمان بادلوں سے گھلا ہوا تھا۔ بارش کم تھی مگر ہوا کے زور سے اس قدر تیز فزٹوں میں آتی کہ لوگوں نے بستی میں اپنی سمونڈریوں کے دھواڑے بند کر کے تھے اور اندھ پڑے ہوئے تھے۔ صوف اکرم کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ رات کے سناٹے میں اپنی سمونڈری کے دھواڑے پر کھڑا دھواڑا سناؤں کی طرف نگہ داتا تھا جہاں طوفان کوکڑا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی، اور ہوا بارش کی بوجھاڑیں اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے سلسلے شہر میں ایک دیوانہ وار سستی کے عالم میں ناچ رہی تھی۔ اکرم خیالوں میں گھوڑا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چڑھا جب اس نے دیکھا کہ جہاں اس کے پاس کڑی ہے اور ایشین اٹھانے اس کے چہرے کی طرف نگہ رہا ہے۔ اکرم کو معلوم تھا کہ بنا رات کو نہیں سوتی ہے۔ پھر بھی وہ اس طرح جہاں کو اپنے سلسلے دیکھ کر چمک گیا۔

جہاں نے اپنے بے دانت کے سوزھوں سے مٹکاتے ہوئے پوچھا: "نیند نہیں آئی؟"

"ہاں! ——— ہاں!"

اکرم ان باتوں میں گھوڑا گیا۔ وہ بڑھتی پتلیاں جنہوں نے جہاں نے کسی کسی زندگی دیکھی تھی۔ وہ چکوں کے بغیر پورے کبھی ان آنکھوں میں دھندلی دھندلی تھی۔ ان آنکھوں پر کبھی صفت آواز سے پکس آہستہ سے اٹھ کر، اگر کر۔ اٹھ کر، اگر کر، تو جہاں دلوں کو سنا کر دیتی تھیں۔ جہاں کو سناؤں کی سہنے والی تھی؟ شاید اس کا کوئی باپ بھی تھا۔ کوئی ماں۔ کوئی بہن۔ کوئی بھائی۔ ———؟ پھر کیا ہوا ———؟

اکرم ان باتوں میں گھوڑا گیا۔

جنانے اپنے پروڈن کو چپتے ہوئے جو اکرم کو بڑے ملکہ خیز سے معلوم ہونے، آہستہ سے کہا "تم کسی کہانی
سوق سے ہے؟ اپنی فلم کہئے۔۔۔۔۔؟"

"ایک کہانی ہے۔ کسان اور اس کی زمین کے متعلق"

"کسان؟۔۔۔۔۔ زمین؟" جنانے آہستہ سے سوالیہ نظروں میں ڈھرایا۔ پھر اپنے آپ سے کہنے لگی
"میں ایک کسان کی بیٹی تھی"

پھر وہ چپ ہو گئی، تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا "اور اس کہانی میں لڑکی بھی ہوگی۔۔۔۔۔ یا لڑکیاں
ہوں گی؟"

"ہوں گی؟" اکرم نے جواب دیا۔

"تم کیسے ان کے ساتھ ملوک کرو گے؟" جنانے لاپتہ برنی آواز میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟" اکرم نے پوچھا۔

جنانہ بولی "میرا مطلب ہے۔ وہ کیسی لڑکیاں ہوں گی۔ خرووں کے کھلونے یا انسان؟"

اکرم نے چونک کر حیرت سے جنانہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا ہی گیا۔ دیکھتا ہی چلا گیا۔

"جواب دو! جنانہ کی آواز میں خدا کی نکتہ تھی۔"

"انسان؟" اکرم نے آہستہ سے کہا۔

جنانے وہ لائین اوپر اٹھائی، اوپر اٹھائی، لائین بائیں اکرم کے چہرے کے سامنے آگئی۔

اتنے میں بجلی کا ایک چمک اٹھی۔ زندہ کا کڑا ہوا، بجلی کا کڑا شہر کے پاروں طرف پھیل گیا۔ اکرم کی آنکھیں
بے اختیار بند ہو گئیں لیکن جب کھلیں تو وہ پھر اسی بڑھیا کی لائین دیکھ رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد بڑھیا نے سانس لے کے کہا "بجے نہیں ہے۔ بجے نہیں ہے! تم ان

انسانوں کا ساتھ نہ کرو گے۔"

پراس نے واٹس نیچے کر دی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی چوٹی میں ہاتھ ڈالا اور تین سو کے نوٹ
شمال کے اکرم کے ہاتھوں میں دے دئے۔ "باز غم بناؤ۔ جگوان نہیں کامیاب کریں۔" اور وہ جلدی
سے قدم مڑے تیزی تیزی اپنے جھونپڑے کی طرف چلی گئی۔ یکایک بارش کے ایک تیز تھپڑے سے
واٹس جھجھکی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

مگر اس رات بہت دیر تک اکرم جھونپڑے کے دروازے پر کھڑا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ اس
کے ذہن میں سیڈم آئی۔ اور پھر یہ صورت جس کا نام جتنا تھا۔ وہ سیٹھ میں کا نام باغیڑا تھا۔ اور
یہ کیسی ڈرامہ میں کا نام فضل تھا۔ میں جیت نکلا تھا۔ وہ بچن دت جس نے اپنے نوک گیتوں کو بچ دیا تھا۔
اور دھوئے اور موت کتنے ہی چہرے تھے اور پڑانے قطار اندھ قطار۔ آنے مارنے اس کے سامنے
کھڑے ہوتے گئے۔ اور وہ ان دونوں دنیاؤں کے بیچ میں دروازہ پر کھڑا رہا اور حیران ہوتا رہا۔
آپ دھند میں بجلی کے کونے کی طرح اس کی جگہ میں آگیا کونے کے دروازے پر؟

یکایک دروازے کو چھوڑ کر اکرم باہر گئی۔ بارش کے تیز تھپڑوں نے اُسے فرما
جھک دیا۔ مگر اکرم نے ذرا پرانا کی۔ یکایک ستر کی ایک رکبتی ہوئی لہر اس کے سارے جسم میں پھیلی ہوئی تھی
گئی۔ اور جب بادل گرجا تو اس نے اپنے سینے کے ٹٹن کھول دئے اور اپنے دونوں ہاتھ خوشی سے کمان
کی طرف اٹھا دئے اور بے تھوڑ کے الفاظ میں کہا "میں آ رہی ہوں اس لئے میں بادلوں کی طرح
گرجوں گا اور اتنی ہی گیسیر، بلند اور لاندل اور سستی تھیر کر دوں گا۔"

وہ دن کتنا عمدہ اور آسودگیوں سے بھرپور تھا جس دن ستیہ رائے اور اکرم نے اپنی کمپنی کے دفتر کا نیس بلڈنگ میں ہوسٹ کیا۔ ان کی جان پہچان کے فلم کے بہت سے لوگ اس موقع پر موجود تھے لیکن ایک نیا عنصر بھی موجود تھا جس سے پہلے ایسے موقعوں پر کسی نے نہ دیکھا تھا۔ یعنی من حیثیت سنگہ یٹسی ڈائیوڈ۔ دھوئے ٹیکسٹائل مزدور جمونٹ ٹاپسٹ۔ بابو رام۔ فضل اللہ بستی کے بہت سے مزید کارکن۔ ان موقع پر موجود تھے۔ چھانڈکی دکرز یونین نے اس موقع کے لئے اپنے تین نمائندے بھیجے تھے۔ ڈنسرز یونین۔ اسٹریڈ یونین اور اسٹریڈ یونین کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اور ان لوگوں کی تعداد شارک سکن کی چٹوان اور دو گھوڑا بول کی قیص اور اسٹریڈ یا نقلی سونے کے ٹن پہننے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ لوگ بول چال، مزاح اور ہنگ دھپ کے اقبال سے بھی گھروڑے، اکثرے، سخت اور نرمند نظر آتے تھے۔ لیکن آج یہ سب گنگے حد خوش نظر آتے تھے۔ دفتر کا کمرہ ان لوگوں کے سنی فٹشوں سے معمور تھا۔

ایک کمرے میں ہناسیدہ دھوتی پہنے ہوئے مٹائی مٹھی تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج وہ دن کو بھی جاگ رہی تھی۔ اس نے پہلے تو آنے سے انکار کیا تھا۔ مگر ستیہ رائے اور اس کے ساتھی نہیں مانے زندگی میں جانا کے لئے شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ بہت دیر سے اس طرح عرصے سے بیٹھ رہی

تھی۔ بار بار اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ انہیں آہستہ سے اپنی سفید دھرتی کے اُبھرتے پتے پر چھپاتی۔ سستی میں تو وہ اگر غلیظ نہیں تو کم از کم بے حد میلے پتروں میں رہتی تھی۔ ہاں یہاں پہلی مرتبہ جانے کتنے سالوں کے بعد وہ ایک سفید دھرتی کی کڑائی تھی۔ اسے ان لوگوں میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے خود اس کی مَدِخ سفید اور اُجلی ہو گئی ہے۔

جب دفتر کا مہورت ہو چکا اور بیڑے بنٹ چکے اور لوگ اکرم اور ستیہ رائے سے ہاتھ جلا کے مبارک بارے کر چلے گئے تو سودیش پر اپنے اکرم اور ستیہ رائے کو دفتر کے باہر چھتے ہوئے برآمدے میں لے گیا اور کہنے لگا: "تم جانتے ہو، سیٹھ نے سٹوڈیو کے ملازموں کو چار مہینے سے تنخواہ نہیں دی۔" ہوں "اکرم نے کہا۔

"ہاں کسی نہ کسی طریقے سے ان چار مہینوں میں ہم کام چلائے رہے۔ مگر جب پانی سرے گزر گیا تو ہم نے سیٹھ کو ہڑتال کرنے کی دھمکی دی۔ سیٹھ بلا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم کچھ سٹوڈیو تیار ہے تم اسے چلاؤ۔ اس کا خیال تھا شاید ہم اسے چلائیں سکیں گے۔ ہم لوگوں نے ایک منگ کر کے سٹوڈیو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔"

"مگر تم کیا اسے چلا پاؤ گے؟" ستیہ رائے نے پوچھا۔ "ایسا نہ ہو۔ جیٹا کیس بہت ہی سے اٹھے اور کچر میں گر جاتے۔"

سودیش نے مسکرائے کہا: "نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ ہم نے بہت سوچ بچ کے ایسا کیا ہے۔ ہم نے سٹوڈیو درکنز کی ایک کاپری ٹیو بنائی ہے اور یہ کاپری شراب سٹوڈیو کو چلائے گی۔ ایک سال کے لئے ہم نے یہ بھی سوچا کہ سیٹھ سٹوڈیو کا کرایہ بہت لیتا تھا۔ ساڑھے سات سو روپے روزانہ تھی بہت زیادہ ہیں۔ ان کو لڑنا تھا لوگوں کو۔ جس کوئی لڑنا تو ہے نہیں۔ ہم نے سٹوڈیو کا ریٹ گھٹا کر چھ سو کر دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا" اکرم بولا۔

”سودیش نے کہا۔“ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ کس طرح یہ تصویر بنا رہے ہو۔ کس طرح کے تم لوگوں کے عزائم ہیں۔ کون لوگ تمہاری مدد کر رہے ہیں ہم بھی مدد کرنا چاہیں گے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم لوگ ہمارے شوڈیو میں تصویر کی شوٹنگ کرو تو ہم تمہیں پچاس فی صدی امداد دیں گے یعنی چھ سو روپے۔ ان میں سے تمہیں ایک شوٹنگ کا صرف تین سو دینا پڑے گا۔ باقی تین سو منہرہ کے بعد۔“

اکرم نے دوبارے سودیش کا ہاتھ پکڑ لیا اور سودیش نے اس کا۔ اور دونوں نے سیدھی گھاہ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک بڑا ہی مضبوط معاہدہ تھا۔ اکرم کو معلوم تھا کہ شوڈیو کے مزدور کتنی ہیرانی کر رہے تھے۔ اس تصویر کے لئے اپنی مزدور کی ناکافی تنخواہ میں سے بھی میں ہزار کا امداد اس کے لئے دے رہے تھے۔ ستیہ رائے، اکرم اور سودیش دونوں سے منسلک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے اور اس نے ہلکے کہا۔ ”کالڈیا جتنا بلا دیا۔ نہیں بلڈنگ سے اٹھایا اور ساری نغمہ انڈسٹری پر لا ڈیا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت میں شکست نہیں دے سکتی۔“

وہ اتنے زور سے چلایا کہ آہیں پاس کے دفاتروں کے باہر بیٹھے ہوئے بہت سے اونٹنٹے ہوئے چراسی جاگ گئے اور چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کئی لوگ تو اپنے دفاتروں سے باہر نکل آئے۔ سودیش پر اپنے مسکرایا اور وہ ستیہ رائے کی ہنسی میں ہاتھ ڈال کر اسے واپس دفتر کے اندر لے گیا۔

شام کے قریب جب اکرم وہ سبہ کر کے چرچ گیٹ جانے والا تھا، جہاں سون جی رہتھوڑی میں بڑی بڑی چائے کی دکان دی تھی ایک لاکھ اس کے دفتر میں آئی۔ اس کی ٹھوڑی چھوٹی تھی۔ ہنسنا چپے ہوئے لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور روشن۔ وہ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اجازت سے یہ کہنے لگی۔ ”مجھے کام چاہیے۔“

”ہوں!“ کرم نے جواب دیا۔

”میں کھا سکتی ہوں، ناچ سکتی ہوں، کھالے بول سکتی ہوں۔ تیرا گھوڑے کی سواری کرنا۔ بائیسکل چلانا پیسہ کام کر لیتی ہوں۔ کالج کے ڈراموں میں اکثر کام کرتی تھی“

”ہوں“ کرم نے میز کی دواڑ کھول کے اس میں سے چند ورق کھالے اور اس لڑکی کو پڑھنے کے لئے دے دئے۔

”پہلے انہیں پڑھ لیجئے اور پھر اس صورت کے کھالے آپ پڑھ لیتے۔“

چند منٹ کے ملاپ کے بعد اس لڑکی نے وہ کھالے سنائے۔ طرزِ ادا بہت عمدہ، شستہ و رشتہ گداز میں جان، اس اور ڈرامہ۔

”آپ کا نام؟“ کرم نے پوچھا۔

”آہ پارا“

”گھروالے تو یہاں نام نہیں رکھ سکتے تھے“ کرم نے مسکرا کے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ میزائلی نام ہے۔ میزائلی نام تو بھلا ہے۔“

”بھلا کیا بڑا ہے۔“

وہ لڑکی خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی ”تو آپ مجھے کام دیں گے۔ آپ کو مجھے کام دینا ہی ہو گا۔“

کرم نے سوچتے ہوئے آہستہ سے کہا ”ایک چھوٹا سا رول ہے۔ ایک ماہ میں آپ کا کام ختم ہو جائے گا۔ صرف ڈھائی سو روپے میں گے یوں کام کے لئے۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس بجٹ نہیں ہے۔“

”مجھے منظور ہے۔“

کرم نے صورت کی طرف دیکھ کر کہا ”بھئی! ان کا انٹریکٹ ٹائپ کر دو۔“ پھر کرم نے آہ پارا کی طرف۔

”ٹائپ ہو کے کہا۔“ آپ اپنا ٹائپ میں پورا پتہ وغیرہ۔ اب انہیں بتا دیجئے۔ وہ آپ کا انٹریکٹ ٹائپ۔

نہایت میں۔

جنوت نے شام کے دو گھنٹے اپنی فلم کہنی کے دفتر کو دینا منظور کئے تھے۔ وہ اپنا ٹاپ راتر یہاں اٹھا کے لے آتا تھا اگر فلمی کانٹریکٹ واکاروں کے، فنانسر کے، ڈسٹری بیوٹروں کے منتقلی کا تذکرہ ٹاپ جوئیں۔

جب کانٹریکٹ ٹاپ ہو کے آہ پارا کے سامنے آیا تو اس نے اسے پڑے بغیر دستخط کر دئے اکرم نے دستخط کرنے کے بعد کانٹریکٹ کی ایک نقل آہ پارا کو دی، آہ پارا نے اپنے پرس میں ڈال دی اس کے بعد بھی دو کرسی پر بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی "ایڈوانس؟"

اکرم نے جنوت سے کہا "بھئی انہیں تیس روپے دے دو۔ دیرید لے لو"

تیس روپے لے کر لڑکی نے اپنی پرس میں ڈال لئے۔ اس کے چہرے پر نہ کانٹریکٹ پر دستخط کرتے وقت نہ ایڈوانس لیتے وقت کسی قسم کی خوشی کے جذبات ابھرے۔ وہ تھریک لٹے جس حرکت کری پر بیٹھی رہی

اکرم نے سوچا خطاب وہ پہلی جائے گی، خود بخود مگر جب چند منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہیں سے نہ گئی تو وہ غور پڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کیوں کہ اسے دیر ہو رہی تھی۔ ہندی لون جنی میں اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اکرم نے جنوت کو دو ایک کاغذ ٹاپ کرنے کے لئے دئے۔ دفتر کی چابی اس کے حوالے کی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اکرم نے کوئی زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن جب فیس بلڈنگ سے باہر نکل کے ہاسٹل کی بجلی کی طوت جاتے ہوئے بھی اس نے اس لڑکی کو اپنے ساتھ پایا تو اس نے تجسس کاہوں سے اس کی طوت دیکھ کر کہا "فرمائیے"

وہ لڑکی اس کی فٹنور، آپ ڈانس سے ملے لڑکی ہیں۔

”کیا مطلب؟“ اکرم نے پرچیا

”آہ پارلے بڑی حقارت سے اس کی طرف دیکھ کے کہا“ آپ نے اپنا کام کر دیا، اب میری باری ہے، زیادہ بنئے نہیں، میں سب بھتی ہوں۔ رات کو آپ مجھے جو پرے جانے کہنے آئیں گے۔ اس وقت آپ کو بھی میرا ٹیڈریس ڈھونڈنے میں کوفت ہوگی۔ مجھے بھی مہرگی۔ میں اس وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ جہاں آپ چاہیں“

اکرم نے کہا ”میں چاہتا ہوں آپ اپنے گھر چلی جائیں۔ میں آج نہیں آؤں گا“
”اوہو۔ تو آپ کل آئیں گے“

”کل بھی نہیں۔ پرسوں بھی نہیں۔ کبھی دن بھی نہیں۔ آپ کو اس کہنی میں نہ میرے ساتھ نہ کسی دوسرے کے ساتھ جو ہو جانے کی ضرورت پڑے گی۔ آپ ایمان داری سے اپنا کام کیجئے۔ ہم ایمان داری سے آپ کو آپ کی رقم دے دیں گے بس! یہی آپ کا ہمارا کانٹریکٹ ہے“

”لیکن کانٹریکٹ میں ایک شرط بھی تو ہوتی ہے جو لکھی نہیں جاتی مگر ہوتی ہے“

”س آہ پارا“ اکرم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا ”میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ ہمارے ہاں آپ سے کبھی کوئی بدسلوکی نہیں ہوگی“

آہ پارہ آب دیدہ ہو گئی۔ اس نے زور سے اکرم کا ہاتھ پھڑپھڑایا اور گھوگر آواز میں بولی ”آج میں ہر بات کہنے تیار ہو کے آئی تھی۔ مہینوں تک اس کے لئے کبھی تیار نہ ہوئی تھی، جس جگہ جاؤ جس سے بات کرو، وہی اشارہ، وہی کنایہ۔ وہی سوال۔ آخر میں۔۔۔۔۔ وہی ایک سوال میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تک گئی تھی، آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔ دو دن سے بھوک تھی۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ آپ مجھے۔۔۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ اس طرح۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، اس طرح کام دے رہے ہیں گے۔۔۔۔۔ میں ایک غریب سندھی لڑکی ہوں۔ میرا سب کچھ تھا۔۔۔۔۔ اب تو کچھ نہیں با۔۔۔۔۔

ہائے اکرم صاحب۔ میں نے کتنی بڑی بڑی باتیں سونچ لیں آپ کے بارے میں۔ آپ کو دل ہی دل میں بہت سی گامیاں دے ڈالیں۔ مجھے کیا معلوم تھا آپ اتنے شریف آدمی ہیں۔“

اکرم نے کہا ”میں پیلا شریف آدمی نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے درجنوں اچھے آدمی اس انڈسٹری میں موجود تھے۔ آج بھی سینکڑوں کیا ہزاروں ہیں۔ اس سے پہلے بھی صرت کام کی خوبی پر کئی لوگوں کو کام ملا ہے۔ میں آہ پیرا آگے بھی بٹے گا اور مٹا جائے گا۔ اور یہی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے گی جو صرت آپ کے کام اور آپ کی فنی صلاحیتوں کی بنا پر آپ کو کام دیں گے اور ہر ایک صف وہ بھی آجائے گا اس آواز جب اس شمع کی بڑی باتوں سے خرابانہ مشن کا دامن یک سرہا یک جہاں لے گا مجھے اس کی پوری امید ہے۔“

تب آہ پیرا نے ایک عجیب و غریب بات کی۔ اس نے اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے گھسیا اور فوراً پٹ کر جاکتی ہوئی چلی گئی۔

مولان جی میں رہ گئے۔ اکرم اور وہ بھی بیٹے جیسے ہاتھ پر خوش گیتیاں کرتے رہے۔ پہلے کئی میٹروں سے وہ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ کھنی کے کھنی سے کچھ نہ کیا تھا۔ لیکن سن دوڑنے میں سے ہر ایک پر محسوس کرتا تھا کہ دوسرے کی جانب کھنسا جا رہا ہے۔ مگر انہی کچھ کچھ کے ہاؤس میں نہیں تھا۔ کچھ محسوس کرنے کا ٹوٹے کا۔ سوچنے اور جیسے ہاؤس تھا۔ دوسری اکرم کی کامیابی سے بے حد خوش تھی۔ مسرت سے اس کی آنکھیں تباہوں کی طرح چمک رہی تھیں اور شعلوں کی جی بجھ گئے۔

پر تھی۔ اس نے سیاہ مکرٹ پہنا ہوا تھا اور اس سیاہ مکرٹ پر سنہری کام کا لہریا اس کے بازو تک جاتا تھا۔ یہ سنہری پل اس کے سینے سے اس کے گھٹنوں تک کھینچی ہوئی اس کے جسم کے دل آویز خطوط ابھار رہی تھی۔ دیوار گیر۔ دم دم نیلی نیلی روشنیاں مرن بنی کے ڈانٹوں میں چاندنی کا سا پُرکیت منظر پیش کر رہی تھیں۔ ملام اسٹیلیٹا اپنے گہرے ہونٹوں سے ہلکے ہلکے اشاروں تک چٹکاتے، ایک دوسرے کی باتوں کے ان کے انگوٹوں میں ایک نازک سی گینٹار تھی۔ ان کے پیچھے ایک بہت بڑا گلاب کے رنگ کا میپ ٹیڈ تھا جس کی روشنی مہن کران کے بالوں اور ان کے ہاتھ میں تھامے ہوئے گینٹار پر پڑ رہی تھی۔ اسٹیلیٹا کی ٹیم بڑا بچھیس گینٹار پر جبک گھنٹیں اور دم دم مام تاج کا ڈولنا ہوا تو گینٹار کی آوازوں سے پھوٹ پڑا۔

خاموشی سے کرم اور دوزی لٹھے اٹھنا چہنگے۔ دوزی اکرم کی بانہوں میں تھی، اور ناپتے ناپتے اس نے ایک لمبے کے تے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کا سر کرم کے سینے سے لگ گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں کے گتے پر ناز رہی ہے۔ ہرے بھرے مرغزاروں میں۔ برن پوش پہاڑوں کے دامن میں کسی اجنبی بھیل کے حامل پر ناز رہی ہے۔ گھائیوں پر کھڑے ہوئے درختوں کی ہرشادہ وائیلن ہے اور ہوا اسٹیلیٹا نے اور ان ہزاروں وائیلنوں کے آکر کھڑے ہو جوتی نامبر رہی ہے۔ ان سے دو دائرے، دو دھول، دو افرو، گھومتے گھومتے ایک دوسرے کے گرد طواف کرتے ہوئے آپس میں یوں گھل گئے ہیں جیسے اب موت ایک دائرہ ہے، ایک دل ہے، ایک فرو ہے۔ موسیقی کی ایک لے ہے جو ہزاروں لاکھوں وائیلنوں سے جتنی محبت منادی ہے۔

اور مغربی موسیقی کی دھن کے ساتھ ناپتے ہوئے اکرم نے سوچا۔ کبھی ہماری مشرقی موسیقی کے فن کار بھی کوئی ایسی دھن بنائیں گے جن پر وہ محبت کرنے والے ناز چکیں۔ ایک دوسرے کی کر میں ہاتھ ڈالتے جسم سے جسم ہاتھوں میں آنکھیں ڈالتے اپنے جسم کی تے گورو دھن کی تے، سوتے ہوئے موسیقی کی گتے پر ایک دوسرے میں کھو جائیں۔ ایسا تو جسے ایک نیا مہم نے کہا

مٹی پھری کٹھاک! کھک۔ بھارت ناٹیم — نہیں نہیں۔ بھارت ناٹیم ہی نہیں، محبت ناٹیم بھی چاہئے
 صوف کٹھاک ہی نہیں، محبت کی گلی بھی چاہئے۔ مگر کیسے؟ ہزاروں برسوں سے ہم نے، ہمارے آباؤ اجداد
 نے محبت کی۔ مگر محبت کو ایسا جال بھ کر۔ سوہ کر دیوں کا جنجال بھ کر۔ رُوح کی ضرورت بھ کر نہیں۔ تو کیا ہم
 لوگ کبھی محبت کی موسیقی نہ پاسکے گے۔ ہمارے ہاں ایک کے لئے موسیقی ہے اور دس کے لئے بھی
 ہے۔ لیکن دو کے لئے؟ ایک مزار ایک عورت کے لئے۔ ایک اکرم اور ایک ذی
 کے لئے؟ اے خدا۔ اس ملک میں محبت کرنا اتنا بڑا گناہ کیوں ہے۔

وہ دن ختم ہو گیا۔ کتنا خوب صورت دن تھا۔ کتنا بھرپور میل، ٹھنڈا، سورج کی ڈھکی ہوئی
 شاموں کا لباس پہنے ہوئے۔ آج بچی میں بھی ہر کوئی خوش تھا جیسے آج کوئی قوی میل ہو جس
 میں ہر فرشتے، ہر خیال اور ہر مذہب کے لوگ حصے لے رہے ہوں۔ جیسے آج بچی میں قوس و قزح
 اترا آئی تھی اور اس نے اپنی رنگارنگی سے دلوں کو شاداب کر دیا ہو۔

کھانا کھا کے سب لوگ آج جلدی سے سو گئے۔ بون بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ ستیہ رائے
 بھی اگلے دس سال کی بچہروں کا پردہ گرام بنا کے سر گیا۔ جنا بھی جو آج دن بھر نہ سوتی تھی، آج کئی ہزاروں
 کے بعد رات کی مہربان آغوش میں اپنے بازوؤں کا بچہ لے کے سو گئی۔ صرف اگر مہربان اور دیرینہ
 جاننا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ آج بہت سے پرانے دوست اُس سے چھوٹے گئے تھے
 اور نئے ساتھی اسے ملے تھے۔ ایک زندگی کا دروازہ اس پر بند ہو گیا تھا اور دوسری دنیا نے اپنے
 بٹاس کے خیر مقدم کے لئے کھول دیے تھے۔ کامیابی نئے کی طرح تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دل میں
 خدا سا خوف لہو تھا۔ ذرا سا روپا چاہتا تھا۔ یہاں سے اب وہ کمر مچائے گا۔ اس کے دل میں ایک
 عجیب لمبلی سی تھی۔ ایک طرفانی چھائی کیفیت۔ یادوں کی، خیالوں کی، جذبوں کی، بھگہروں کی تصویر
 کی لہروں کی پرچائیاں اس کی روح پر ایک کو۔ نے سے دوسرے کو نے تک چھائی ہوئی تھیں اور

مرحبا پابستا تھا۔ بلاک یک چوتھے پر رقصہ آکے بیڑ گئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک پھول تھا۔
اکرم نے پھول کی طرف دیکھا، پھر رقصہ کی طرف۔

رقصہ بولی "یہ بابرام نے مجھے دیا ہے۔"

اکرم سکرایا۔ مگر رقصہ فدا بھی نہ سکرائی۔ وہ بہت آداس تھی۔

اکرم نے کہا "تھیں تو خوش ہونا چاہئے۔"

پھر اس کے آٹھ ہے۔

"کیوں؟"

جواب میں رقصہ نے اس سے ایک سوال کیا "تمہارا کیا خیال ہے۔ بابرام کی کیا عمر ہوگی؟"

کوئی اذان تہین برس کے قریب ہوگی۔

"میں اس خبر میں نہیں برس کی ہوجاؤں گی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

ہرگز ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے۔ رقصہ نہیں کے بولی۔

وہ نہایت مسکے فخر بائیں کرتا ہے۔ کسی طرح سے کوئی بھی دوست اس سے بھت کر سکتی ہے؟

کیا ہوا؟

وہ آج شام کو جب تم لوگ یہاں نہیں تھے میرے پاس یہ پھول لے کے آیا۔ پہلے تو بہت دیر تک۔

اموش بیٹھا رہا۔ ہاتھ میں پھول کو پھول کی طرح نہیں چمتی کی طرح پھلے ہوئے۔ رقصہ زندہ نہیں

میں نے پوچھا کیا ہے۔ برا۔۔۔۔۔ یہ گلاب کا پھول ہے۔ میں نے کہا اتنا رنگے بھی گمانی

بات ہے۔ اس پر وہ بے چارہ چپ ہو گیا۔ اور اب اس نے اس پھول کو اپنے ہاتھ سے یوں نیچا کر لیا

یہ آدمی کسی منزل پر پہنچ کر چلتے کو نیچا کر لیتا ہے۔ تو بھی پھول اس کے ہاتھ میں تھا پھر اس نے کہا

میں زنیہ — کبھی — میں — مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرا مطلب ہے صاب کی کتابوں کے سوا۔ پھر میں نے تجیس دیکھا اور — — — — — ایک عرصے کے بعد کہ نہیں مکتا کتنے عرصے کے بعد میں نے آسمان کو دیکھا۔ اور مجھے آسمان بڑا خوب صورت دکھائی دیا۔ کیوں میں نے اتنے عرصے تک آسمان کو نہ دیکھا تھا۔ کہہ نہیں سکتا۔ تم جانتی ہو یا کیوں ہوتا ہے۔ میں تو ہنسیر جانتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ نہ پ ہو گیا اور اپنی ہاتھ کیوں پر پھول کر ایسے گھمانے لگا جیسے جولا سے سوت کی آفتی گھماتے ہیں۔ ”زنیہ نہیں۔ پھر ہونی“ مگر میں بار بار ام کی بہت بڑھانا نہیں چاہتی تھی اس لئے خاموش رہی۔ یہ میری خاموشی اس کے لئے کتنی تکلیف دہ تھی۔ خود اس کی گویائی اس کے لئے کتنی پریشانی کا باعث تھی۔ یہ میں بھی طرح سے دیکھ چکی تھی۔ دو بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا۔ اور دو مرتبہ اس نے ماتھے پر سے اپنا ٹھنڈا سپند صاف کیا جو — — — — — اس کے آواز میں گنت بھی تھی۔ اور پھر اس نے بڑی جنت سے کام لے کے کہا۔ ”میں کی طرف جاتے ہوئے ہیں۔ وہ میں پھول والے کی دوکان سے گزرا کرتا ہوں۔ شاید عجیب تھیں یہاں سے گزرا ہوں۔ مگر مجھے یاد نہیں کبھی میں نے پھول دیکھے ہوں۔ میں نے کبھی اس دوکان کی حالت نظر بھی نہیں ڈالی۔ میرا دل اپنے صاب کی کتابوں میں تھا پھولوں میں نہیں اور میں زنیہ میرا کام بھی ایسا ہے کہ روز ہی آنے پانی کی غلطی ہو جائے تو سینہ میرا صاب برابر کرے گا۔ کو کچھ دنوں سے تمہارے۔ میرا مطلب ہے تم آئیں۔ اور میں نے پھول دیکھے۔ خوب۔ خوب۔ چہا چہا چہا۔ پھول ہی پھول تھے جو اس دوکان میں سجے ہوئے تھے اور کتنی سال سے میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ یہ۔ تو۔ — — — — — تو۔ — — — — — تو میں۔ — — — — — آج یہ پھول لے آیا۔ تمہارے لئے۔ اور اس کے بعد اس باون برس کے بندے نے وہ پھول اس طرح شراٹے لہاکے انہیں جھکا کے مجھے دے دیا۔ جیسے وہ مجھے پھول نہیں اپنی ماری زندگی دے رہا ہو۔“

”وہ تم سے بہت کتنا ہے۔“ اکرم نے ترس کھاتے ہوئے کہا۔

”میں یا کروں“ رضیہ ایک آہ بھر کے بولی ”وہ اگر باون برس کا نہیں تیس برس کا بھی ہوتا جب بھی میں اس سے جنت نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔ اور اگر میں کسی اور سے محبت نہ بھی کرتی ہوتی تو بھی اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔“

”بائے وہ کس قدر مشکل خیز ہے۔“

”بالکل بڑے اٹوکی طرح میری ذات دیکھتا ہے۔ آ جاؤ!“ رضیہ پہلے نشی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی بولی ”دیکھتا تھا جب میں نے اس سے پوچھا تھا میری عمر پچیس برس کی ہے۔ وہ کہتا تھا میری عمر پچیس برس کی ہے۔ دیکھو تو نہ سے لے کسا صورت بولا۔“

اکرم بولا ”وہ نہیں اس کی محبت بہت بڑھ رہی ہے۔“

یہ ایک وہ دونوں آدمیوں سے ہو گئے۔ باہرام کی باون برس کی بھراؤ اور بے معنی زندگی پر سیدہ جیسے کی طرت ان کے سامنے پہنچی پہلی گئی۔ اس زندگی میں کہیں ایک ہلچل نہ تھا۔ پھول کی ایک کی نہ تھی۔ پھولوں سے لہری ہوتی ایک ڈرائی نہ تھی۔ سرت روپنے آنے پانیوں کے اعلیٰ و شمار ہزاروں۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد ریت کے قدموں کی طرح اس کی زندگی کی سطح پر پھیلے ہوئے تھے۔ باون بے شکایت دہلے طریں برس ریت کے خلیسے ہوئے ٹیوں کی طرت باہرام کی زندگی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھڑے تھے۔ ایک نقل تو وہ ہوتا ہے جس میں آدمی کو گولائونٹ کر مار دیا جائے لیکن یہ کس قسم کا قتل ہوتا ہے جو باہرام ایسے لوگوں کی زندگیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ کیوں یہ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ ایک دن نہیں۔ دو دن نہیں ساہل سال ایک ہی آدمی کو گٹکا گٹکا کے مار دے رہتے ہیں کہ پھر کوئی امید نہیں رہتی۔ کوئی سکڑا ہٹ نہیں رہتی اور کوئی یاد نہیں رہتی۔ اور کہیں پر کوئی پھول دکھائی نہیں دیتا۔ اور کہیں پر کوئی آسمان نظر نہیں آتا۔ سرت مع، تفریق، ضرب تقسیم، سرت مع تفریق ضرب تقسیم۔ . . . !

رضیہ نے آہستہ سے کہا ”جب میں نے پھول لے کے بھی اس سے کہہ نہ کیا اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔“

اکرم نے چوبیسویں میں تصویر نکل کر لی۔ اس نے اسی کا نام رکھا۔ اس کے سر کے کئی، اور چند بے نیت پروڈیوسروں کی دہلی بی سرگوشیوں میں چلنے والی مخالفت کے باوجود اگر یہ تصویر سنانے کے بعد سے میں نکل ہو گئی۔ تو اس میں اکرم کی دن رات کی ان محک محنت کے علاوہ اس کے پرنٹ کے لوگوں کی پرجوش خدمت اور سٹوڈیو کے مزدوروں کی پر خلوص مساعی کو بڑا دخل تھا۔ انڈسٹری کے جو چھوٹے چھوٹے لوگ تھے۔ وہ ایک طرح سے اس تصویر کو اپنی تصویر سمجھتے تھے۔

اس دفعہ اکرم نے بھی پوری کوشش کی تھی کہ وہ بیت اوپن نہ اٹھے۔ ان تمام غلطیوں کا اعادہ نہ کرنے جو اس نے پہلی تصویروں میں سرزد ہوئی تھیں اس بار جو مسئلہ اس نے اپنی تصویر میں اٹھایا تھا۔ شہری مسئلہ نہیں تھا۔ کسان اور اس کی زمین اور جاگیر والی۔ زمیندار کی نظام نہ پایہ ترقی پاتی مسئلہ تھا۔ مگر ہندوستان دیہاتیوں میں جوہر تھا۔ اس لئے اکرم نے یہ سیکھا اٹھایا مناسب سمجھا۔ مگر اس بار اس کے کردار تقریری نہیں کرتے تھے۔ اپنے عمل سے اور حرکات و سکنات سے بولتے تھے اب کچھ بار اس کا گاؤں ایک جی کا گاؤں تھا۔ کسان کچھ کچھ کسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ فحش کسان نہ تھے۔ اس کی ہیر وئی بھی کھیتوں میں کام کرنے والی یہ وہی معلوم ہوتی تھی۔ ہر چیز حقیقت کے اس قدر

قریب تھی کہ گاؤں کی زندگی سے مربوط اس باراکرم کے کردار بالکل سیادہ اور مفید نہیں تھے وہ انسان
 تھے اپنی تمام کامیابیوں کے باوجود چھوٹے چھوٹے انسان۔ ان کی زندگی بڑی تلخ اور بڑی مصیبت کی
 تھی مگر اکرم نے کہیں بھی کوشش نہ کی تھی کہ وہ مصیبت کو اتنا بڑھا چڑھا کر دکھائے کہ زندگی کے
 دوسرے پہلو اس میں چھپ جائیں۔ یہ تو مرکزی نقطہ تھا یعنی زمین اور اس پر کام کرنے والے کسان
 مگر آندھروں کے درمیان بنی بھی تھی۔ چاندی کی گھنٹی کی طرح سر ٹپنی بنی۔ جو کبھی تو زندگی کے چھوٹے
 چھوٹے دکھوں کو اپنی شاداب آوازیں گلاتی ہے اور کبھی جیسے دکھوں کو تھاندے زیادہ اُبھارتی ہے
 لیکن اب کے یہاں اس تصویر میں بنی بھی تھی۔ صاف ستھری زندگی سے بھرپور۔ محبت کرنے والی بنی
 اور گیت۔ گاؤں کے طبیعت گیت۔ کھیتوں میں گلنے جانے والے۔ چڑھا ہوں میں گونجنے والے۔ بچے کی گھر گھر
 اور سیادہ کی پر شور جھل پہل میں گلنے والے گیت زمین اور زندگی کے ساتھ بندھے ہوئے گیت اور مذاق
 اکرم نے اس سے قبل اپنی کسی تصویر میں تاج نہیں رکھے تھے مگر اس نے دھواں لے دھواں کی کیفیت سے
 فائدہ اُٹھایا تھا اور نتیجہ ایک ایسی تصویر کی صورت میں نمودار ہوا تھا جو اپنی تمام غامبیوں کے باوجود ایک
 چھوٹے سے ہندوستانی گاؤں اور اس کی زمین اور اس کے کسان کے مسئلے کی ایک جیتی جاگتی انسانی
 دستاویز تھی اکرم کو سنسکرت کا بیت خوف تھا۔ اگر سنسکرت نے اصل موضوع ہی سے اتفاق نہ کیا تو اس کی
 ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ موضوع کے انتخاب سے اس میں سیاست کا بھی دخل تھا اور وہ لوگ
 جو زمیندار تھے اور جاگیر دار تھے اور صدیوں سے ہندوستان کی پچھتر فی صدی آبادی کی معاشی، سماجی اور
 تہذیبی زندگی پر قبضہ کئے بیٹھے تھے وہ کس طرح اس تصور کو چلنے دیں گے۔ اور اکرم نے جہاں تک
 مرکزی نقطہ پر کھینے کا حق تھا۔ اس پر ٹپری بے باکی سے، بڑی فن کاری سے مگر صاف صاف کہہ دیا تھا
 کہ زمین کسانوں کی ہے اور جو غاصب ہیں انہیں زمین اور کسان کے بیچ میں سے ہٹا دینا چاہیے اس
 مرکزی نقطہ پر اکرم نے کسی قسم کا بھجوتہ نہیں کیا تھا، اس لئے وہ سنسکرت رائے سے بہت

ڈر رہا تھا۔

مگر یہ دیکھ کر اُسے ایک گونہ حیرت اور پھر نہرت بھی ہوئی کہ سنسنے اس کی تصویر پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پوری تصویر ایک فط کاٹے جانے کے بغیر پاس کر دی۔ نہ مرث پاس کر دی گئی، بلکہ سنسنے نے اکرم کے اقدام کو سراہا۔ اُسے ذاتی طور پر مبارکباد پیش کی۔ کہ اس نے اتنے بڑے قوی مسئلے پر ایسی جرأت کرنا تصویر بنائی اور فٹوں کے تمام رجحان کے خلاف ایک نہایت صاف ستھری شستہ مذاق کی خوب صورت تصویر تیار کی۔

اکرم اس تعریف سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ یہ تعریف خلاف توقع تھی لیکن کچھ کوفتائیں کرنے والے سیٹھ کمر چند کا چہرہ اتر گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور جب نمائش کا دسے واپس آئے ہوئے اکرم ادا ستیہ رائے نے سیٹھ سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے غصہ سے چلا کے کہا۔

”تم نے مجھے ڈلوایا۔ کہانی کچھ سبب نائی اور اب کچھ بنا دی۔“

”کیا مناسب کیا؟ ستیہ رائے نے پوچھا۔

”سننے نہیں سننے سنہ کیا کہہ رہا تھا۔“

اکرم نے کہا ”وہ سب تو تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے دس سال میں پہلی بار ایسی تصویر آئی ہے۔“

سیٹھ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کے کہا ”جس کی سنسنے تعریف کرے مجھ کو اس تصویر کی قیمت پھوٹ گئی۔“

”کیا بات کہتے ہو سیٹھ جی“ ستیہ رائے نے برا فروختہ ہو کر کہا۔ ”ہم نے جھنڈا....“

”مجھے دوا پہنچے جھنڈے کو“ سیٹھ کمر چند نے فوراً ستیہ رائے کی بات کاٹ کر نہایت ہی غصہ سے کہا

”بڑے آگے جھنڈے خاں کہیں کے ہیں دس سال سے انڈسٹری میں بھاڑ نہیں جھونک رہا ہوں

میں نے پچاس بار دیکر لیا ہے جس تصویر کی سنسٹر تعریف کرے جس میں سے کچھ نہ کائے۔ مجبوراً تصویر
 فوٹو ایک دم ہنڈل ہیل۔ اور جس تصویر کی سنسٹر رائی کرے اس میں سے کاٹنے کو کہے وہاں شوٹنگ
 کو کہے۔ مجبوراً تصویر اتنے دانی نہیں ہے۔ کم از کم سنسٹر جو بی تو نہ ہر شے کی۔ تم نے کیا کہا سنسٹر
 کہتے تھے سالیں انہوں نے اسی صاف سنسٹر فلم نہیں دیکھی ہے۔ تو سمجھو۔ دس سال میں اس سے بڑا
 فوٹو بھی کسی نے فلم انڈسٹری کو نہیں دیا ہوگا۔ تیسرے دن ہی ریوائی سے اُتر جائے گی۔ میں تو سمجھتا
 ریوائی میں اُسے لگا تاہی نہیں۔ کیوں خواہ مخواہ میں چالیس ہزار اس کی پیسٹی پر خرچ کروں میں اسے
 کسی دوسرے درجے کے تعمیر میں دھنچنے کے لئے باغ و دوں گا؟

”یہاں غضب نہ کرنا میسٹر جی“ اکرم بولا ”ایک بھی قومی فائدے کی تصویر ہے، تمہیں اس کی اچھی
 طرح سے پہچانی کرنی چاہئے“

”قومی فائدہ تھے بھائیں۔ پہلے تو میں اپنا فائدہ دیکھوں گا۔ بڑے آگے بے سبق پڑ جانے والے۔ ہنڈل
 پکڑ کے ڈانٹر کر۔ تم نے تو مجھے لوٹ دیا“

”کیا لوٹ لیا“ ستیہ رائے نے چلا کر کہا، تصویر دو دن چلے یا دس دن یا دس بیسے۔ تمہارے پیسے
 کمرے میں۔ سب علاقے بکے ہوئے ہیں“

”بکے ہوئے میں تو اس سے کیا ہوتا ہے“ شیو کتر چند خفا ہو کر بولے ”سب پیسے سب علاقوں سے
 اکٹھی جائیں، تو بھی مجھے نقصان نہ پہنچے“

”کیسے؟“ ستیہ رائے چپ کر بولا ”سارا خرچ میرے ہاتھ سے ہوا ہے۔ میں نے پانی پانی کا حساب
 رکھا ہے۔ سب پیسے آجائے تو پچاس ہزار کا نقد فائدہ ہے جس میں تمہارا سود اور رائی کاٹ کر بے

چند ہزار بچتا ہے

”کیسے؟“ چند ہزار بچتا ہے تم مجھے روزی شیشا ہی کا سود نہیں دو گے؟“

”سیٹھراں غلام نہ کرو“ اکرم بولا۔ ”دوسری ششماہی میں صرف دس دن اور بچے ہیں۔ میں نے یہ تصور چھو بیٹے اور دس دن میں تیار کی ہے۔ تم نے خود ستیرائے سے کہا تھا۔ تم اس دس دن کے لئے سود نہیں لو گے۔ دوسری ششماہی کا سود نہیں لگاؤ گے۔“

”میں نے بالکل نہیں کہا تھا“ سیٹھراں نے کہا۔

”تم۔۔۔ تم جھوٹ بولتے ہو ستیرائے نے غصے میں آپ سے باہر ہوتے ہوئے کہا اتنی بددہائی، تم نے اس آدمیوں کے سامنے کہا تھا۔“

”ذرا اہلالت میں نے کہا انا انہیں“ سیٹھراں نے جواب دیا مگر اپنے منہ کے کہا۔ ”مجھے جھوٹا اور بددہائی کہنے والے کوئی نہیں۔ میں ان کا چہرہ دیکھنا چاہوں گا۔“

خیر میں نے کہا ہوا کہ ہاں ہر گز ٹھیک میں تو لکھا ہے کہ چھ ماہ میں اگر تصویر تیار نہ ہوئی تو دوسری ششماہی کا سود چڑ جائے گا۔ تم دو دن کان کھول کر سن لو اور اس حساب سے تمہیں ستر ستیرائے، اچھے دوسری ششماہی کا سود دینا پڑے گا اور اس حساب سے ستر اکرم قاضی خان کے بڑا ڈیو ستر ستیرائے کو تمام ٹیری کواریج سے مدد پر وصول ہو جائے گے بعد اچھے جسے اکرم بزرگ کی رسم دینا پڑے گی جسے وصول کرنے کے لئے مجھے ان کے خدات عداوت سے ڈرنا پڑے گا ان کے باہم کے فلیٹ پر ملنے والی پڑے گی۔ اور ان کے روبرو کھڑے رہنا پڑے گا اور سو فیٹ اور عاقلیچے کو قوی کرنا پڑے گا۔ اور تو کوئی طریقہ ہے نہیں۔ ستیرائے اب سے روپیہ وصول کرنے کا۔“

یہ کہہ کر سیٹھراں نے دو دن کو کاٹا لیٹے اور دیا اور اپنی بیوی کو کہا کہ اپنا ڈیو ستر ستیرائے کو دے دے۔

اکرم نے غصے میں کہا۔ ”سالہ۔ جب تک بچہ مکمل نہیں ہوئی تو کتنا باکرم بیٹا میں دوسری تصویر بھی تمہارے سنگ بناؤں گا۔ ابھی سے انا خوش کر دو۔“

ستیرائے کہا ”پاجی سارا دوسرے خود کھا لینا چاہتا ہے۔“
 ”صرف یہی نہیں، اکرم نے کہا ”وہ تو تبار کے فلیٹ پر قریبی گارہا ہے۔“

جب سے تصویر کا کام شروع ہوا تھا۔ ستیرائے چونکہ پروڈیوسر تھا اور اسے بہت سے ڈسٹری بیوٹروں اور دوسرے فنانشروں اور سرمایہ داروں سے ملنا پڑتا تھا اس لئے وہ اپنی چھوڑ کر چلا گیا تھا اور سب میں اس نے ایک فلیٹ لے لیا تھا اور اُسے ایک فلمی پروڈیوسر کے فلیٹ کی طرح سجایا تھا۔ ٹیلی فون ریمو بجھ کر ریڈیو گرام، غلیچے، مٹھی پر دے۔ اگر کوئی کسی تھی تو ایک سوٹنگ اور ایک داسٹہ کی اور یہ دونوں ہی بہت ہنگامی تھیں۔ گو ستیرائے موٹر کے خلاف تو نہیں تھا لیکن داسٹہ کے بہت خلاف تھا اور جب اس کے دوسرے دوست ہنسی ہنسی میں اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ”تم کیسے پروڈیوسر ہو۔ تمہاری تو کوئی داسٹہ ہی نہیں ہے۔“ تو ستیرائے ہنس کے جواب دیتا ”میں خود ہی اپنی موٹروں خود ہی اپنی داسٹہ ہوں۔“

”تمہی گارہا ہے، مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔ ستیرائے کا پتہ پھر معروف فٹ پاتھ ہو سکتا ہے مجھے اس بات کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی اس بات کی کہ وہ اسے کہیں دوسرے تیسرے درجے کے فیئر میں نہ ڈال دے۔ اور اس کی اپنے طریقے سے سلیٹی نہ کرے۔ اکثر اوقات ایک عمدہ تصویریری سٹی سے مرجاتی ہے۔“

ستیرائے کا غصہ سے تنہا، ہوا چہرہ فوراً تبدیل ہو گیا اور وہ اپنی ہنسی روک نہ سکا سکراتے ہوئے کہنے لگا ”دیکھو اکرم میں دعا کرتا ہوں یہ سچ نہ ہو مگر بھائی جانے کیا بات ہے۔ ہوتا تو ایسا ہی ہے جب تصویر کی سنس تعریف کرتے ہیں وہ سالی دودنی میں اڑ جاتی ہے۔“

”اوہام پرستی ہے اور کچھ نہیں۔“ اکرم نے چلا کے کہا
 ”نہیں اصل بات یہ ہے۔“ ستیرائے نے ہنسل اپنی ہنسی روک کے کہا ”سنس دے جوڈے

ہیں۔ بہت سے ان میں سے اب زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں فطری طور پر انہیں دلچسپی نہیں جو ان اور صحت مند فطری مری معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا شروع کھلنے ڈراہن انہیں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ تنہا ان فطری کی تعریف کرتے ہیں جو عوام کی دلچسپی کی نہیں ہوتیں..... بچے بھی ڈر لگتا ہے کہیں یہ تصویر بھی ناگام نہ ہو جائے۔ تو پھر سمجھو اپنا بوریر بستر یعنی سے گول آکر مے کہا "تم دیکھتے جاؤ۔ آج تو کچھ منسہ ہوئی ہے۔ ایک بڑا سا شو کو سنتے ہیں میں مختلف طبقوں اور خیالات کے لوگوں کو بلاتے ہیں۔ ان سے تصویر کے بارے میں صحیح رد عمل معلوم ہوگا"

مگر اس پرائیوٹ شو سے بہت پہلے بہت سی باتوں میں گولا بڑ ہو گئی۔ سیٹھ نے مطالبے کی رو سے بہت سی چھوٹی موٹی غلامیوں کی مثالیں دے کر ستیہ رائے کے کان تصویر کا ٹیکٹو اپنے نام لکھوا دیا۔ پھر اس نے اپنے آٹھ ہزار روپے کا اتفاق کیا اور ایک فوجی بھرتہ کھل کے ستیہ رائے کے غلامی ڈگری مائل کر لی۔

ایک انجی تصویر بنانے کے بعد بھی اکرم کے منہ میں ایسا فائدہ تھا جیسے وہ لکڑی کا برادہ کھا رہا ہو۔ یہ لوگ تصویر نہیں دیکھتے، اس کا اثر اس کی خوبصورتی، اس کی جمجمی صفات پر غور نہیں کرتے۔ اب تو اس بچہ کی سب ٹیری لہری بک چکی ہیں، تجارتی اعتبار سے اس میں منافہ بھی ہے مگر

سیٹر لوگ سوت سٹاف بھی نہیں دیکھتے۔ یہ سارے کا سارا ہنڈ این کی جیب میں جانا چاہئے۔ وہ لوگ جنہوں نے گذشتہ چھو بیٹے اس پر محنت کی ہے فائین فلز کا سناہتہ جنہوں نے آدھی تھوڑا ہر کام کیا ہے سٹوڈیو کے مزدور جنہوں نے اسٹوڈیو کی شوٹنگ کا محنت آدھا روپیہ لیا ہے۔ آدھا آدھا روپیہ ہے۔ ڈانسرز وین کی لڑکیاں، اکثر ایو نہیں کے لوگ بستی کے لوگ جنہوں نے اس بچہ میں کام کیا ہے۔ ان سب لوگوں کی آخر میں ماری جائیں گی۔ چھائیں کے وہ مزدور جنہوں نے دو دو آئے کر کے اس فلم میں چند روپیہ اُن کے حق سواروے تک واپس نہیں ہر سکیں گے۔ جتنا۔۔۔ کیا زندگی ہے ایک تصویر بنانے کے بعد تھے سینکڑوں آدمیوں کی مسلوٹیں سننا پڑیں گی۔ کوئی نہیں کہے گا کہ سیٹر کٹر چند نے بد معاشی سے کام لیا ہے۔ سب ستیہ رائے کو ادھر اکرم کو گالی دیں گے۔ یہ لوگ روپیہ کھائے قوم کے نام پر ترقی پسندی کے نام پر ایک یادو آدمیوں کو بھجانا آسان ہے۔ اتنے سینکڑوں آدمیوں کو کیسے بھجایا جائے گا۔ کیسے انہیں بتایا جائے گا کہ محنت کے رس سے چمکتا ہوا ہمیں کس طرح منفعتی شایخوں سے توڑ کر ناصب کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے جو اس سماج کا بدیہی اصول ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی طریقے سے اس عمل کو اپنی زندگی کے دائرے میں دیکھتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں وہ اپنے کو عظیم اور دوسروں کو بے ایمان سمجھنے پر مجبور ہے وہ لوگ کسی طرح ان کی باتوں کو نہیں کریں گے۔

جس وقت ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے ستیہ رائے کے فیٹ کو اس طرح سے بچاؤ پڑتا ہے کہ اس کو اس کے ستیہ رائے پریشان ہو گیا، پوچھا اسے یہ کون سے اس بڑی طرح وہاں سے ہر جہت اٹھا لیا ہے کہ وہ چپ ہو گیا۔

کوئی نہ کوئی رستہ نکالے گا۔ یہ سنا رہی تھی رہا ہے اور وہ اپنے خیالوں میں مشغول ہو گیا۔

قرنی کے دی جب سیٹھ کتر چند بلیٹ اداس کے پانچ آدمیوں کو لے کر ستیہ رائے کے فیلڈ میں داخل ہوا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دس بارہ آدمی فیلڈ میں جیسے ہیں اور مختلف کڑوں میں مختلف چیزوں کے قریب دھرا دئے خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ سیٹھ کتر چند نے ادھر ادھر دیکھا، مگر کوئی شخص اس کی تعلیم کے لئے نہیں اٹھانہ کسی نے اُسے آداب کیا۔ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

سیٹھ کتر چند نے بھونک کے کہا ”ٹپا نچ لایا ہوں؟“

ستیہ رائے نے کہا ”لئے ہو تو لے آؤ۔ لے جاؤ حوالہ کیا رہا ہے“

سیٹھ نے ادھر ادھر خاموشی سے دیکھا، مگر کوئی اپنی جگہ سے ہل نہیں اُسے ایک گونہ اطمینان ہوا وہ ریڈیو گرام کے پاس گیا۔ وہاں دھوے پنا سر منڈائے، ہاتھ میں ایک ذنی ہتھوڑا لے بیٹھا تھا سیٹھ نے ریڈیو گرام پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”یہ قرن کرو؟“

سیٹھ کے ہاتھ پر زندہ کا ایک ہتھوڑا چڑا دہ بلبل کے اور اچھل کے ریڈیو گرام سے دو فٹ پرے جا رہا ”کیا بات ہے، کیا بات ہے۔“ دنگنا کرنا چاہتے ہو؟

دھوے بولا ”میری چیز کو تم ہاتھ نہیں لگا سکتے“

”تمہاری چیز؟“

”ہاں! ستیہ رائے یہ ریڈیو گرام عرصہ ہوا مجھے فروخت کر چکا ہے۔ یہ کانڈ دیکھ لو؟ دھوے نے کانڈ خاموشی سے بلیٹ کو دکھائے، کانڈات قافونی تھے، بااصل درست ریڈیو گرام عرصہ ہوا فروخت

ہرچکا تھا۔

سیٹھ کتر چند غصے میں ریفریجریٹر کی طرف بڑھا۔ وہاں سردار میں جیت سنگھ ہاتھ میں ایک بڑا سا سونا بھلے ایک اسٹول پر بیٹھتے تھے ان کا سونے والا ہاتھ ریفریجریٹر پر تھا۔ سیٹھ کو اپنی طرف آنے دیکھ کر دوسرے بولے ”سنبھالو ادھر نہ آؤ۔ پہلے سے کہتا ہوں۔ ادھر نہ آؤ۔ نہیں تو مارا سکتے پھڑکی بنا دیواں گا۔“
 (یہ کام کر دیکھ لے) ”من جیت سنگھ نے کافر بلیٹ کو دکھایا، بالکل ٹھیک تھا قانونی حیثیت سے اس فرخت میں کوئی نقص نہ تھا۔ سیٹھ ریفریجریٹر کو ہاتھ نہ لگا سکا۔

سیٹھ نے بھناکے کہا ”اچھا یہ صوفہ اٹھا لو یہاں سے“

مگر صوفہ سیٹ بھی بگا ہوا تھا تین مزدور وہاں بھی بیٹھے تھے ایک سے ایک ٹھکڑا اور ہاتھ میں ان کے بازوؤں سے بھی ٹھکڑا او قانونی پرزد۔

”قریب ناچو“

مگر غالیو بھی بک چکا تھا۔

کرسیاں، اسٹول، میز، الماریاں، کپڑوں کی کھونٹیاں تک بھی ہوتی تھیں غصے کے مارے سیٹھ کے منہ سے جھگ بھگنے لگی۔

اس نے چلکے پوچھا ”یہاں کوئی چیز ایسی بھی ہے جو پہلے سے بچی ہوئی نہیں ہے؟“

”ہاں ہے؟“ اکرم نے بڑی گھبراہٹ میں کہا ”یہ میری قلم دوات ہے آٹ تک کوئی خرید نہیں سکا اسے تم فرق کر سکتے ہو“

ستیرے سیٹھ کتر چند کے قریب آیا اور کہنے لگا ”وہی قلم ہے ایک نیا چیک کم دو دس ہزار

روپے کا“

”ہے کے لئے؟“ سیٹھ کتر چند نے حیران ہو کر پوچھا۔

”دوسری بچہ کے ایذا دہانے کے لئے۔ میں دوسری بچہ تھا اسے لئے بنانا ہوں۔ وہ ہزار ایذا دہانے کر دے یہ آٹھ ہزار جو تم نے مجھ سے زبردستی کا لیا ہے اس رقم کو بھی اگلی بچہ میں ڈال دو۔“

کتر خیز ستیر رائے کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ تجویز مقبول تھی۔ مگر اس وقت اُسے اپنی ہاکی پرخت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے قلم دولت اٹھا کر فلیٹ کی کڑکی سے باہر پینک دی اور غصے میں جھلٹا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان کے جانے کے بعد بلیف اور اس کے قوی بھی چلے گئے۔ ان سب کے جانے کے بعد ستیر رائے نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر چوہ کے کہا ”جسٹہ اگاڑ دیا۔ رکھا! بانڈھا! تانا کیچھا اور کیچ کے چھڑ دیا۔ جاڑ بیٹے لنگے رہو۔ گھو بیٹا“ ستیر رائے نے جسوت سے پوچھا ”کیسی رہی میری ترکیب“

جسوت نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا ”اب لوگوں سے بننا تم خوب جانتے ہو“

ستیر رائے نے کہا ”اور کیا، اب ہم ان چیزوں کو بیچ کر جن لوگوں کی رقیں باقی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جن رقموں کا حساب تصویر کے ذریعہ ہے وہ تو سیدھا کیا سیدھ کے باب کو بھی دینی پڑیں گی لیکن کچھ رقیں جو ذاتی حیثیت میں ہم نے رکھی ہیں جہاں اہل کے مزدوروں کا قرضہ جتنا کاروبار بستی کے پشیمان شہباز خان کا مدھیہ یہ بدھیہ تو ہم اب واپس کر سکتے ہیں۔“

جسوت نے ستیر رائے کا ہاتھ دبلے کہا ”میں نے سمجھا تھا تم صرف صوموں لے دلاؤ۔ معلوم ہوا تم انسان بھی ہو۔“

ستیر رائے خاموشی سے مسکراتا رہا جسوت نے پوچھا ”اب تم کہاں جاؤ گے۔“

”وہی تھا کہ پاس بستی میں صرف فٹ ہاتھ بھی! ستیر رائے کا وہی پرانا پتہ ہے اب تو“

پرائیویٹ شو کا دن آن پہنچا۔

اکرم نے طرح طرح کے لوگوں کو بلایا تھا۔ فلم انڈسٹری کے سربراہان اور وہ لوگ تو موجود تھے ہی۔ مگر اکرم نے مزدوروں، چھوٹے چھوٹے دوکان داروں، طالب علموں، ٹیکسی ڈرائیوروں، کام کرنے والی عورتوں کو خاص طور پر مدعو کیا تھا اس نے انگریزی تصویریں دکھانے والے تمام سینماؤں کے منیجر لوگوں کو بھی دعوت دی تھی۔ ان میں ماترو سینما کا امریکی منیجر جان رولینڈ بھی شامل تھا۔

”ماترو سینما کے منیجر کو کیوں بلاتے ہو“ دھومے نے چلا کے کہا ”وہ ضرور تمہاری تصویر دیکھے گا یا جی!“

اکرم نے کہا ”میں تو سب کو بلاؤں گا، امریکی ہوا تو کیا ہوا۔ کیا امریکی کسی اچھی چیز کو پسند نہیں کر سکتا“ دھومے نے ہنس کر طنز اُگھا ”ہاں کیوں نہیں پسند کرے گا بہت جلدی تم نے سن آت انڈیا ایسی پکڑ تیار کر لے بہت اس میں راجے ہمارے ہیں۔ سانپ میں جوگی ہیں۔ نیم عریاں ناچ میں ناچو وہ لے ضرور پسند کرے گا؟“

اکرم جیسے پ گیا ”بہت سے امریکیوں کی بہت سے مغربیوں کا ہندوستان کے بارے میں یہی نظریہ تھا۔ مگر اکرم جب بھی ڈھما رہا۔ کہنے لگا ”کے بھی ایک سو فی صدی ہندوستانی فلم دیکھنے دو کیا ہرج ہے؟“

اور اس طرح سے ماترو سینما کے امریکی منیجر جان رولینڈ کو ”کسان“ کا پرائیویٹ شو دیکھنے کی اجازت ملی وہ چھوٹا اونچا لانا بہت ہی عمدہ گوشت اور بہت ہی عمدہ مٹھن پر ملا ہوا امریکی تھا۔ نیو یارک کا رہنے والا۔ پتلے پتلے نہپ کی طرح بند ہو جانے والے ہونٹ۔ فلو کے رنگ کی سی آنکھیں،

جہاں پڑ جائیں وہاں گویا ایک کیل کا ٹرپ۔ بڑے بڑے ہاتھ بے مدبے سین اور مضطرب! جب "کسان" کا شو ختم ہوا تو حسب دستور اکرم کو ڈائریکٹروں اور اداکاروں نے گھیر لیا۔

جمال آبادی ڈائریکٹر نے اکرم سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "راہ واہ لطف آگیا۔ پھر منہ پھیر کے اپنے دوست گوند خرم سے کہا۔" سارے نے ہور کر دیا۔"

ڈائریکٹر دھیرند کمار نے اکرم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "قائین" دھیرند کمار کا مسکراتا ہوا گورا چہرہ خلوص اور محبت کی زندہ تصویر تھا۔

اکرم نے سر جھکا کے شکریہ ادا کیا۔

دھیرند کمار نے واپس جاتے ہوئے اپنی بیوی سے زریب کہا "بھواس"

جوشی جی نے اکرم کو گلے لگایا "واہ۔ واہ۔ کیا تصویر بنائی ہے تم نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کی

لاج مکملی "جوشی نے جوشی میں آکے اکرم کا منہ چوم لیا۔ "اے اکرم تم GENIUS ہو GENIUS کیوں سیٹھ"

جوشی جی نے سیٹھ ہانکڑا سے داد چاہی۔

سیٹھ ہانکڑا بڑی دیر تک اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے رہتے ہوئے "کیا بتاؤں اُن دنوں میں لے تہاری قدر نہیں کی۔ میری نطفی تھی۔ پارٹراب تم کسی دن دفتر میں آ جاؤ۔ مگر دفتر میں آنے سے پہلے ٹیلی فون کر لینا اور دو غلوں کے کانٹریبیٹ پر دستخط کے اپنا ایڈریس لے جانا"

اکرم نے پھر سر جھکا کے سیٹھ ہانکڑا کا شکریہ ادا کیا۔

اکرم سے دور جا کے سیٹھ ہانکڑا نے جوشی سے کہا۔

"جوشی جی بال بال بک گئے۔ یہ اکرم تو پھر میرے چار لاکھ پر بانی پھیر دیتا۔"

"ابھی کیا پوچھتے ہو سیٹھ! ایسی بٹل بکچر زندگی میں نے نہیں دیکھی۔ سارے کوشاٹ لینے کی تیز

نہیں ادا آ جاتے ہیں مگر سے ڈائریکٹر بننے! اس تو سیٹ پر کلپر لوائے نہ رکھوں اسے! جتنی بھی اور سیٹھ باجھو یا اسی طرح باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

راج ہمشاد اور درجن نے اک بڑی خوب صورت سی تخلیق بنا کر اکرم کو گھیر لیا۔ وہ بہت ہی عمدہ ساڑیاں اور بلاؤز پہن کے آئی تھیں۔ ان کی محاکا میں بار بار اکرم کی تصویر کی تفریق کرنے ہوئے ادھر اُدھر پھٹک جاتیں۔ وہ محاکا ہیں دراصل فوٹو گرافر کو تلاش کر رہی تھیں جو اس موقع کا پوزے لے۔ عمدہ سا فوٹو لے لے تو یقیناً کل کے اخبار میں آجائے گا۔ حالانکہ ان تینوں میں سے کسی نے کسان میں کام نہ کیا تھا مگر یہ سلسٹی کرنے والے کہاں اصلی کام کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ تو خوب صورت اور مشہور چہرے دیکھتے ہیں۔

ہمشاد نے مسکرا کر اپنی گہری آنکھوں سے اکرم کو دیکھتے ہوئے نیم اُناس لہجے میں کہا

”کئی جگہ تو میں سو فی پٹری۔ آپ جیسے ظالم ہیں“

راج نے چمک کے کہا ”اے ان کے ظلم کا کچھ مت پوچھو یہ تو بہت بڑے شاعر ہیں۔ پہلی بھی اداکاروں سے تو بات کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ اب تو یہ پچر سلور جو بی منائے گی۔ اب ان کے ٹھانڈ دیکھنا۔ ہم غریبوں سے ...“

اتنے میں اتفاق سے ایک فوٹو گرافر آگیا۔ تینوں ہیردکنوں کی جان میں جان آئی۔ راج اپنا فقرہ بیچ میں چھوڑ کر اپنی ساڑی کا پلو ٹھیک کرنے لگی۔ جلدی جلدی تینوں ہیردکنوں نے اکرم کے ساتھ ایک دلفریب پور لیا۔ کمرے میں کشکا سا ہوا اور ختم۔ تینوں ہیردکن جلدی جلدی سے اکرم سے ہاتھ ملا کے بلکہ ہاتھ چڑا کے بھاگیں۔

راتے میں ہمشاد نے کہا ”یا اللہ اتنا خوب صورت آدمی ہے۔ مگر ایسی اور کچھ کیوں بنا تا ہے اور کسے دلچسپی ہے۔ کسانوں کی زمین میں۔ یہاں۔ یہی میں تو ایک کمیت بھی نہیں!“

راج نے کہا ”بھئی میں نہیں ہیں۔ مگر بھئی کے باہر تو ہیں۔“

ششاد نے چڑکے کہا ”گرواں کھیت ہیں۔ وہاں سنیا گم تو نہیں ہیں۔ کون اس تصویر کو دل چسپی سے دیکھے گا؟“

”بھئیابی“ ہاں ری۔ اور بیرونی کے کپڑے دیکھے تم نے ایک بھی تو اچھا ڈیس نہیں دیا اس کو۔
 اری جب بھیرو بھائی ہستہ کی کچھ ”کسان پتری“ میں کام کر رہی تھی تو میرا بھی کسان کی بیٹی ہی کا محل تھا۔
 اسی کسان کی طرح وہ غریب تھا مگر بھیرو بھائی نے مجھے پندرہ تے ڈیس دے دیے تھے۔“

”اری چھوڑو“ راج نے چڑک کہا ”کس کی بات کرتی ہو۔ یہ اکرم سر پر ہے دونوں بھی اس کی بچہ ہیں جائے
 تو میرا نام راج نہیں گیراج رکھ دینا۔“

اس پر رنجنا اور ششاد بہت خنسیں۔ رنجنا نے قرضی چھاہوں سے راج کی طرف دیکھ کے کہا ”اے
 راج سے گیراج۔ ارے بھئی۔ کچھ راج تو بڑی اچھل چوٹل باتیں کرتی ہے۔“

جب میں چھٹ گیا اور بہت کم لوگ دو گئے۔ اس وقت جان دو لینڈا اکرم کو ایک
 طرف لے گیا اس نے اکرم سے بڑے مولی طریقے سے مصافحہ کیا اور بھڑی بھیدہ آواز میں اس سے
 کہا ”تم نے ایک عمدہ تصویر بنائی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں میں اسے اپنے سنیا میں چلانا پسند
 کروں گا۔“

”اترو میں؟“ اکرم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

روینڈے آہستہ سے اپنا سر لایا۔

اکرم چکرا گیا "کسان" اترو میں؛ ایسا تو اس نے اپنے کسی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔
روینڈے نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا "مجھے نیو مارک سے اس کی منظوری منگانی چاہیے گی۔ مگر وہ
ایک ضابطہ کی کارروائی ہے۔ اس میں میرے خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ میں تمہیں چار ہفتے کی
کارروائی دیتا ہوں۔"

اترو میں چار ہفتے؛ جان بڑی سے بڑی تصویر دو ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہرائی جاتی تھی محال کے
پھینک دی جاتی تھی جہاں کوئی ہندوستانی تصویر آج تک پیش نہ کی گئی تھی جہاں صرف امریکن
تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔

اکرم نے ہاتھ کے اشارے سے سیٹھ کتر چند کو بلایا جس کے پاس تصویر کا نیکیٹو گروی تھا۔ تصویر
دیر کی گفتگو کے بعد سیٹھ کتر چند جان روینڈے اور اکرم اور ستیہ رائے نے ایک دوسرے سے
بات چلوا اور رخصت ہو گئے۔

"مذیہ تو ایک سپنا ہے۔"

"بہت جلدی ہماری شادی ہو جائے گی اب" مذیہ نے رنگ رنگ کے کہا۔

اکرم تلچے تلچے رنگ گیا۔

ایک اور جڑ سے نے اکرم کی طرف گور کے کہا "آگے چلو"

والزنج رہا تھا مگر اکرم کیا سوچ رہا تھا۔ یکایک گھورتے ہوئے تلچنے برے بوڑھے کی طرف
 دیکھ کے معافی مانگ کے مسکرایا اس کے ہاتھ پھر روضی کی لکڑی کی طرف گئے اور والز بجنے لگا
 ”روضی کیا تمہیں انوس تو نہیں ہوگا کہ تم نے دوسرے مذہب کے آدمی سے شادی کی؟
 روضی نے کہا ”میرا تھا ارا مذہب تو ایک ہے، محبت؟“

اکرم روضی کا جواب سننے کے لئے ہنسنے لگا گیا تھا پھر اُسے ایک تلچے ہوئے بوڑھے کی غٹکی کا سامنا
 کرنا پڑا۔ وہ قہقہہ مار کے ہنس پڑا اور روضی کو اپنے ساتھ ہال کے باہر کھینچ لایا ”اؤ روضی آج ہم ایک
 سوئیں تک چلنے جائیں گے۔ پیدل!“
 ”کہاں؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں! محبت کی کوئی منزل ہوتی ہے؟“
 ”اؤ ستاروں سے پوچھیں“ روضی نے مشورہ دیا۔
 ”اؤ“

روضی نے اپنی دونوں بائیں آسمان کی طرف پھیل کے کہا ”اے ستارو!“
 اکرم نے اپنے دونوں بازو روضی کی کمر میں ڈال کے اُسے اٹھایا، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں
 ڈال کے کہا ”اے کہکشاں!“

ایک سپاہی نے اُکے اُسے ٹھوکا دیا ”اے تم کیا نشے میں ہے؟“
 ”کیا پیلا ہے کا جو؟“ سپاہی نے پوچھا۔

”نہیں؟“

”فرا؟“

”نہیں“

”پھر کیا ہے تو؟“

”جنت!“

پرسیدہ مسکرایا ”احق جنت کرنے سے یہی بہتر ہے کہ تو پولیس میں نوکری کرے“

”کیوں؟“

”کبھی میں نے بھی جنت کی تھی تو میرے سات بچے ہیں۔ خواہ ستر روپے ہے۔ جنت کہہ کر گئی؟“

پرسیدہ نے گہر کر اکرم کی طرف دیکھا جیسے اُسے کچا کھا جائے گا۔

اکرم نے اک آہ بھر کے روزی سے کہا ”آؤ روزی گھر چلیں۔ یہ آدمی بھی ماوریت پرست معلوم ہوتا ہے“

شہر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے فزٹوشن کی طرف سے ایک ٹائٹس جاری تھی جس میں
 امریکی، روسی، انگریزی، جاپانی، اطالوی، چینی، چیک اور فرانسیسی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں مملکت
 ملکوں سے برگزیدہ فلمی ہستیاں بھی اس موقع پر مدعو تھیں۔ روس سے پندرہویں اور چار سو ست اور لاکھ
 سے فریک کیر ایسی مشہور ہستیوں نے بمبئی کے فلمی حلقوں میں اک ہل ہل سی دوڑادی تھی۔ جنہرستان
 میں بین الاقوامی فلموں کی یہ پہلی نمائش تھی اور اس قدر کامیاب تھی کہ محض گھروں پر گھنٹوں کی نوگاہ رہتا
 تھا یہ شوق کی کئی دن پہلے تک بوجھاتا تھا بین الاقوامی فلموں میں روسی، اطالوی اور چیک فلموں میں
 لوگوں نے بڑی دل چسپی ظاہر کی کیونکہ امریکی فلمیں تو ہر روز دیکھتے تھے۔ یہ ان کے لئے پہلا موقع تھا کہ وہ
 دوسرے ملکوں کی فلموں کے موضوعات ان کی قومی ہیئت ترتیب و تدوین اور مسائل سے آگاہ
 ہو سکیں۔ اور دل ہی دل میں ذہنی طور پر موازنہ کر سکیں۔ روسی فلموں میں "خال آف بلیں" اور "ٹائی
 باں مائزرز" بہت پسند کی گئیں۔ اور پبلک کے اسرار پر ان کے کئی شو کئے گئے۔ اس کے بعد اطالوی
 فلموں کا نمبر آگیا تھا "بائیگل چورز"۔ "روئی ٹی"۔ "مریل آف میلان" کو عوام نے بہت سراہا چیک فلمیں
 کی فلمیں بھی پسند کی گئیں۔ اطالوی فلمی حقیقت بھاری کے اسکول سے ہٹ کے کچھ لوگوں کو فرانسیسی فلموں

میں بات کہے جانے کی جوا دے بہت بھائی، جینی غلوں میں سفیدالوں والی لڑکی نے ہر ایک کے گلے کو مس دیا۔ جینی غلوں کا انداز ہماری غلوں سے ملتا جلتا تھا۔ اُن کی طرزِ ادا میں ایک ایسی ایضائیت تھی جو انہیں ہمارے بہت قریب لے آتی تھی۔ اس نائش میں حصہ لینے والے ہر ملک نے اس موقع پر ایک غلی وفد بھی بھیجا تھا۔ مختلف وفود کا حکومت اور پبلک کی طرف سے شاندار سواگت کیا گیا۔ اکرم آج رات ہی ابھی ایک سلسلہ تھپڑے واپس آیا تھا جس میں روسی وفد کا شاندار استقبال کیا گیا تھا، ہندوستانی فلم کی تمام اہم اور نامور ہستیاں اس موقع پر موجود تھیں۔ لیکن جس چیز نے اس سواگت کو یادگار بنادیا وہ پنڈت نہرو کی اس کچھل سواگت میں غیر متوقع شرکت تھی۔ پنڈت جی ای دن لٹن سے لوٹے تھے اور سفر کی سہولت اور اپنی دلچسپ مصروفیات کے باوجود انہوں نے استقبال کی کمی کی استعفا پر اس میں شرکت کی تھی۔ ایک سلسلہ تھپڑے کا بال کچا کچ بھرا ہوا تھا بلکہ لوگ اُس کے باہر بھی کھڑے تھے۔ ہر حیثیت سے یہ یادگار دن تھا۔ اس لئے دوسرے دن اکرم کو بہت غصہ آیا جب اس نے تنگ نظر دفیناموں میں یہ پڑھا کہ پنڈت جی کو اس استقبال جلسے میں شرکت نہیں کرنی چاہیے تھی وہ بہت صاف صاف کھل کر توذ کہہ سکتے تھے کیونکہ ایک عام سیدھے سادھے خوب صورت کچھل جلسے کی مخالفت کرنا بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس لئے وہ الفاظ میں اور منہ بنا کر اور طرح طرح کی دھڑا دھڑا باتیں کہہ کر وہ پنڈت جی کے اس اقدام کی خدمت کر رہے تھے۔

جس وقت نے کہا "میں تم سے کہتا نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں تنگ نظریوں اور رجعت پرستوں کا ابھی تک ایک بہت بڑا گروہ ہے جو پنڈت جی کی صلاح کل پالیسی سے اتفاق نہیں رکھتا جو ہر موقع پر اس کی پیٹھ میں پتھر بھونکنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس لئے وہ لوگ جو باشعور ہیں، اور صلح جو ہیں ان کے لئے یہی جانی لینا کافی ہے کہ پنڈت نہرو اور ان کی حکومت ان کے لئے خاطر خواہ کوشش کر رہی ہے۔ یہیں خود بھی اس کوشش میں ان کا ہاتھ بٹانا ہو گا۔ اپنی ترقی پسند کاوشوں

کو باری رکھتے ہوئے پنڈت نہرو اور اپنی حکومت کی صلاح جو پالیسی کے ہاتھ مضبوط کرنے ہوں گے :

”جیسے بڑے غور سے اس گفتگو کو سن رہی تھی ان پچھلے سات آٹھ ماہ میں اس نے ذہنی طور پر بہت فاصلہ طے کر لیا تھا۔ کسان تصور کے متحمل کرنے میں اس کی ان محک کوششوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا وہ دی رات کام کاج میں جتنی رہتی تھی سیٹ پر وہ اکرم کی اسسٹنٹ کا کام باقاعدگی سے کرتی تھی۔ اس کے علاوہ عورتوں کے لباس اور آرائش کا شعبہ بھی اکرم نے رضیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ رضیہ کا خیال تھا کہ شاید رضیہ ضرورت سے زیادہ کام کرتی ہے مگر رضیہ زیادہ کام سے کبھی گھبراتی نہیں تھی بڑی خندہ پیشانی سے روزمرہ کے شوٹنگ کی الجھنوں کو سلجھا دیتی۔

ایک دی رضیہ نے پوچھ لیا ”تو جو دی رات کام میں لگی رہتی ہے قیراجی کبھی گھوٹے کو نہیں چاہتا ؟ کہیں تفریح کرنے کو رضیہ ؟“

”رضیہ یہ ایک سیل ڈرگمی بولی ”گھوٹے کو؟“ — اب نہیں چاہتا اب کسی کے ساتھ کہیں تفریح کیے کر نہیں چاہتا!“

رضیہ نے اسے گلے سے گلابا ”اسی نے زیادہ کام کرتی ہے“

رضیہ نے کہا ”نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھے کام میں بہت گھٹن آتا ہے فلم کا کام مجھے پسند ہے تو پھر میں اسے اچھی طرح سیکھ کیوں نہ لوں ؟“

”فلم ڈائریکٹر بنے گی ؟ ایک عورت ہو کر ؟“

”عورت ایک فلم ڈائریکٹر کیوں نہیں بن سکتی ؟“

رضیہ نے ہنس کر کہا ”میں جانتی ہوں۔ تو اس نے زیادہ کام کرتی ہے کہ کسی کو بھول سکے ؟“

رضیہ چپ ہو گئی۔ بہت دیر کے بعد بولی۔ ”گویا اب تک پنا دل ٹھول رہی تھی ؟ یہ کبھی ٹھیک ہے رضیہ میں اب تک عشرت کو بھولی نہیں ہوں۔ مگر اسے بھلا دینا چاہتی ہوں مگر اس کام میں زیادہ دل لگانا

موت اس نے نہیں ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے۔ مگر سب سے بڑی وجہ نہیں ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کام۔ خدا اس کام میں مجھے بڑی دلچسپی ہے میں سمجھ نہیں سکتی۔ ہم میں سے بہت سی لڑکیاں عہد سلائی پہننے لپ اسٹک اور سُرخ لٹکائے زیوروں میں خیم چھاتی ہوئی سیٹ پر اس کوٹے سے اُس کوٹے تک بیکل جاتی ہیں اور کبھی یہ نہیں سوچتی کہ فلم کیسے تیار ہوتی ہے۔ کیونکر تیار ہوتی ہے اس کی تیاری میں کون سے مراحل آتے ہیں کون سے مسئلے اُنہیں کس طرح سے حل کیا جاسکتا ہے ایک چیز جو ہماری روزمرہ کی زندگی ہے جس کی بنیاد پر ہماری ساری زندگی چلتی ہے ایک اسی سے ہم اس قدر لاپرواہ ہو جاتی ہیں کہ دل میں ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ کب کسی طرح جلدی سے شوٹنگ ختم ہوا ہم بھاگ جائیں۔ یہ بھاگنا ہمیں بہت ہنگامہ پڑ رہا ہے ”رضیہ“

رضیہ بچا ایک خاموش ہو گئی۔ اتنی لمبی تقریر اس نے زندگی میں کبھی دیکھی تھی اب جب وہ ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ گئی تو خود اپنے آپ پر اُسے حیرت ہونے لگی اور رضیہ کا تو منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رضیہ آہستہ سے بولی ”ایسی کم نیت تو تو بہت لگے بڑھ گئی“ رضیہ کے ایک اس جملے نے رضیہ کی ہمت اور بندھادی۔ اب تو وہ اکرم کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے سابق کاموں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ رضیہ بھی کام کئی تھی مگر اسے اپنے لباس میں اپنی تزیین و آرائش ہی سے کم فرصت ملتی تھی۔ دھڑکی کہ ان دونوں سے حسین تھی اور وہ ایک زیادہ افراد ماحول میں پائی تھی اور مسلسل مشق کرنے سے اب اُسے اپنے میک اپ میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر ابھی وہ نوکرنہ رنجیت تھی کام کم کرتی تھی اکرم کو زیادہ دیکھتی تھی۔ آپس میں زیادہ بھرتی تھی اور خاص طور پر جب کبھی اکرم کہیں اس کے نزدیک جوتا تو اس کے گرد پیش کیا ہو رہا ہے۔ اسے کچھ یاد نہ رہتا اس وہ طرز پر اکرم کو دیکھنے لگتی اور رضیہ کو اُسے ڈانٹتا پڑتا اور روزی کا چہرہ اک دم سُرخ ہو جاتا اور وہ رضیہ سے سانی مانگ کر پھر اپنے کام میں لگ جاتی۔ مگر پھر جب کبھی اکرم اُسے دکھائی

دے جاتا پھر اپنے گرد پیش کی دنیا کو بھول جاتی۔ ان دنوں صفی کے لئے سارا سامان گھونٹی تھا اور ساری زمین اک نیلگوں سبزے میں گھونٹی ہوئی تھی۔ رضیہ صفی کو بخشش میں آتے ہوئے اپنے دل میں اک چپنی سی محسوس کرتی۔ اک لمحے کے لئے عشرت اس کی ٹھاپوں کے سامنے آکر ہوتا مگر پھر اس کی یاد کو بڑی سختی سے دل کے کسی کونے کھدے میں دھکیل دیتی اور اپنے ہونٹ چبائے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

اس وقت جنوت اور اکرم کو رات کے چلے پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر اُسے یاد آ گیا کہ رسول بیسی شانتی بسا کی غم کیٹی کی طرف سے باہر سائے ہوئے قنصلت ملک کے قلمی دفین کو منتقل ہو گیا۔ میں ایک دھرت دی جانے والی ہے جس کا ذرا اکرم اور اس کے ساتھیوں نے پایا ہے اور ابھی اس مسئلے میں کچھ کام نہیں ہوا ہے۔

رضیہ نے اکرم کو یاد دلانے ہوئے کہا "اٹھو کب تک یہاں بحث کرتے رہو گے۔ اس دھرت کے خلق کہاں کہاں جاتا ہے۔ کچھ تہ بھی نہیں ہے۔"

اکرم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جنوت نے پوچھا: "اس دھرت میں کی کوئی کوڑا رہے ہو؟"

"تمام قلمی دفینوں کو۔"

اُسے کچھوں کو بھی ستیہ رائے نے چٹاکے پوچھا "کم قیمت جہاں جلتے ہی فلاں کھڑا کر دیتے ہیں۔ کوریا میں، انڈونیشیا میں، تائیوان میں، جاپان میں، شانت سالگرہ کے جزیروں میں، قبرص میں، آئی میں، برطانیہ میں، اسے جہاں پاؤ۔ یہ سب لوگ اپنی خفیں گن اپنا بوائی آٹا، اپنا ٹیم لے کر جگہ موجود ہیں؟"

"کیوں نہیں جلائیں گے۔ خود جلائیں گے۔"

"کام کرتے ہو شانتی بسا کا۔ جلاتے ہو جنگ بازوں کو ..."

سرت نے کہا "جے ستیہ رائے کی دلیل میں کچھ وزن معلوم ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ اصل غلط بات ہے کہ امریکی جنگ باز ہیں۔ ایک آدمی جنگ باز ہو سکتا ہے دس آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں، دس ہزار آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں لیکن دس کروڑ آدمی جنگ باز نہیں ہو سکتے۔ کیا تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ امریکہ کے شہروں اور دیہاتوں میں انسان نہیں بستے۔ کیا ان انسانوں کے گھر نہیں ہیں۔ ان گھروں میں ان کے محبوب بچے، عورتیں، مائیں، باپ اور بھائی نہیں رہتے۔ کیا تم مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہ لوگ اپنے سر پر ایٹم بم کی تلوار لٹکتے ہوئے نہیں دیکھتے کیا ان کو یہ بھروسہ ہے کہ اگر کوئی جنگ شروع ہوئی، تو یہ بم ان کے گھروں پر نہیں گرے گا کیا وہ لوگ اوپر سے ایسی ہی دل ہی دل میں یہ دمانیں لگتے ہوں گے یا خدا کسی طرح یہ جنگ کی مصیبت ٹل جائے، کسی طرح سے ٹل جائے؟ کیا ان ایسا نہیں سوچتے ہوں گے میرا خیال ہے کہ ضرور سوچتے ہوں گے۔ کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ حکومتیں بُری ہو سکتی ہیں، سناج بُرے ہو سکتے ہیں، معاشرے بُرے ہو سکتے ہیں، معاشی نظام بُرے ہو سکتے ہیں لیکن لوگ بُرے نہیں ہوتے۔ چند آدمی بُرے ہو سکتے ہیں لیکن سارے لوگ بُرے نہیں ہوتے۔"

"جناب کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا" ستیہ رائے نے جھٹکے کہا "آج کل تو جو اخبار پڑھو جنگ کی خبریں آتی ہیں جو امریکی جنرل یا ایڈمرل اٹھتا ہے۔ ایٹم بم کا سوشا گھلتے ہوئے دھماکا آئینہ نقسری کرتا ہے۔ میں تم سے پچ کہتا ہوں۔ ان موت جلاؤ۔ یہ لوگ ساری دنیا پر اپنا جھنڈا لگانے کی فکر میں ہیں یہ لوگ پختے جنگ باز ہیں"

اکرم نے کہا "تم کہتے ہو وہ لوگ جنگ باز ہیں وہ لوگ کہتے ہیں ساری مسرت کی جرم کنٹ میں پھر فیصلہ کس طرح سے ہو گا۔" ایٹم بم سے: "دوسرے نے سر ہلا کے کیا۔"

اکرم نے جس کے کہا "فیصلے ہی کی ایک صورت ہے۔ دونوں کو ایک ہی دھمکت میں جلا دیا جائے"

کہہ کر کم میں تو بلاؤں گا اسی دعوت میں ؟

جسوقت نے شبیہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم بوائے مگر میرا خیال ہے وہ نہیں آئیں گے۔ مگر آجائیں تو آجائیں مگر کنیڈین آئیں گے نہ فرانسیسی اور اطالوی وفد کے سربراہی بھی ان کی غمگینی کا جبر ہے۔ امریکی لوگوں کی حالت میں نہیں آئیں گے دیکھتے ہو یہ سوچ جاگ کتنے زوروں پہ ہے"

اکرم نے کہا "وہ آئیں نہ آئیں میں تو حاضر ہوں گا"

مگر شاعری سب کا کی غمگینی کی دعوت خط و قلم بہت کامیاب رہی امریکی بھی لکھتے اور برطانوی بھی اور کنیڈین بھی۔ فرانسیسی بھی اور اطالوی بھی۔ روسی چینی اور چیک وفدوں کے اراکین بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ وہاں فرینک کیپرل تھے اور پیو وکن تھے اور فرانسیسی ڈاکٹر کیٹر اور اطالوی کیرہ مین۔ کنیڈین اور چینی اور ہندوستانی قلم اند شری کے تمام ذمہ دار افراد برگزیو پروڈیوسر اور فنائٹر تمام بڑے بڑے اداکار موجود تھے۔ سنٹرل سٹوڈیو کے نمبر دو سٹیج کا شہنشاہ ملال بہت عمدہ طریقے سے سجایا گیا تھا ہندوستانی طریقے سے یہاں نہ کرسیاں تھیں نہ میز فرش پر بڑے بڑے نرم اور گداز خالی بچا دئے گئے تھے اور سب لوگ شرقی بھی اور مغربی، ایشیائی اور یورپین سب لوگ ناگیں پارے یا ناگیں دبائے یا ناگوں پر ناگیں رکھے یا اپنی پالتی لڑے۔ صبح ہندوستانی طریقے سے بیٹھے تھے اور ہندوستانی اداکاروں کی طرف سے پیش کئے گئے کپڑے پر دم گرام کو بڑے خوبے دیکھ رہے تھے اور سن رہے تھے یہ ایک عجیب و غریب دعوت تھی جو رات کے تین بج چک

چلتی رہی۔ کوئی دہاں سے نہیں ہلا اس قدر دل چسپ پروگرام تھا۔ بار بار پروگرام کے مختلف حصوں کو سوز
مہانوں کے اسرار پر دہرایا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں امریکی، روسی، چینی اور ہندوستانی فرانسیسی اور
اطالوی۔ شہر و شکر ہو کے دس سو بول رہے تھے جیسے کبھی ایک دوسرے سے جہان تھے۔

اور اس ہال سے باہر سرد جنگ جاری تھی۔ سرد پے گئے تھے۔ خندق میں کھدی تھیں، ایذا میں کئی جگہیں
پر اس وقت بھی بمباری ہو رہی تھی۔ ہوائی جہاز کوریامیں نیپلام کا آتش گیر مادہ غریب کوریائی گاؤں
کے چھوٹے چھوٹے گروں پر برس رہے تھے آج کی اس تاریک رات میں کہیں پر کوئی گھر جھکے
اڑ گیا۔ کوئی بچہ نیم ہو گیا۔ کوئی بیوی بڑھ ہو گئی۔ کوئی ماں اپنے جوان بیٹے کی شکل و شمس سے ہٹ کر رہ گئی۔
اور لاکھوں یورپی گھروں میں مائیں اڑ رہی تھیں۔ بیٹے اور جوان۔ آئندہ جنگ کے قرب سے بے
ہوش اس وقت بھی یہ سوچ رہے تھے کہ کل کی صبح کون سی خبر پڑے گی۔

لیکن اس ہال میں کتنا امن تھا۔ کتنا سکون تھا۔ کتنی مسرت کتنا ہمدردیاں پر مبنی تھے اور ناز
اور گریہ اور تالیاں، یہاں دوستی کے پر جوش مصلحت تھے اور نکاحوں میں دوستی اور مفاقت
انسانیت، بھرنے اور مہربانی کی چمک اور تابانی !

اس ہال میں تمام دنیا کے مختلف قوموں، نسلوں، رشتوں اور نظریوں کے لوگ جمع تھے۔ گوگ جو
انگ انگ ایک دوسرے سے برگشتہ فاطمے تھے۔ یا یوس تھے اور نفرت کے نقطے پر پہنچتے جا رہے
تھے۔ شاید جب وہ اس ہال میں آئے تو اپنی تمام مجبوریاں، گزوریاں اور اپنے پہلے سے سوچے گئے
ہوئے خیال اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن جب یہاں ان کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو پتہ
بٹ گئے اور ساتھ بیٹھے ہوئے ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک ہی گیت کو پسند کر سکتے ہیں
ایک نغمہ پر تالی بجا سکتے ہیں۔ ایک ہی مذاق پر ہنس سکتے ہیں۔ وہ آدمی تھے اور عورتیں وہ بچے تھے
ہاں ! ہاں کے اندر! — تو پھر ہال کے باہر کوئی نہیں۔

ہاں کے اندر چند گھنٹے! ————— چند گھنٹے! ————— تو پھر چند برس کیوں نہیں! چند صدیاں کیوں نہیں! ہمیشہ کے لئے کیوں نہ ہم صلح سے رہیں۔ یہ جنگ کا غوت ہمیشہ کے لئے کیوں نہ انسان کے دل سے مٹا دیں۔

جھٹل کے غوت کی طرح! رات کی تاریکی کے غوت کی طرح۔ بادلوں کی گرج کے غوت کی طرح۔ اس جنگ کے غوت کو بھی ہندوب انسان کے دل سے مٹا دیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

”آج کی رات بڑی تاریکی تھی“ اکرم نے چلتے چلتے روضہ اور جسونت سے کہا۔
 صبح کے چار بجے تھے وہ لوگ دعوت کے خانے کے بعد اپنی بستی کی طرف جا رہے تھے
 جسونت نے کہا ”جے ایسا محسوس ہوا جیسے آج کی رات اُمید کا جنم ہوا ہے“
 ”جیسے اندھیرا بہت دور دور تک چھٹ گیا ہے“ روضہ نے آہستہ سے کہا۔
 روضہ نے گرائڈ روڈ کے پل پر کھڑے ہو کر کے چاروں طرف دیکھا۔ رات نے اپنے پر محیط لئے تھے
 سمندری ہوائوں میں تازہ ٹھک کا سوندا چاہا تھا۔ مشرقی آسمان پر سج کی تصویر کھیل اٹھی تھی۔ یکایک
 ایک سپید وکل شبنم میں خراپور اپنے گٹاروں سے اس کے قطرے چمکاتی ہوئی اپنی باریک آواز
 کو گئی ہوئی پل کے نیچے سے گزر گئی۔ اور چاروں طرف بالابوڑ گیا۔

اس رات کے چند روز بعد رضیہ رضیہ کے پاس جھونپڑوں میں آئی اور اس سے کہنے لگی
 "عشرت سائیں ہسپتال میں ہے اور مر رہا ہے"

رضیہ کا چہرہ اک دم پیلا چڑ گیا اتنے زور سے اس نے سانس اندر کو کھینچی کہ اس کے مطلق سے ایک عیب
 زخمی جانور کی سی جھنجھ نکل گئی۔ رضیہ نے اُسے سہارا دیا۔ مگر وہ رضیہ کا رد عمل دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اتنے
 غصے سے کبھی اس کے اور رضیہ کے درمیان عشرت کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اگر کسی رضیہ
 نے بات کی بھی۔ تو رضیہ نے ہنس کر ٹال دیا۔ یا ایسی لاپرواہی سے اس کا ذکر کیا۔ جیسے وہ اُسے بھول
 چکی ہے۔ لیکن اب رضیہ کو اس حالت میں دیکھ کر رضیہ کو اپنی رائے بدلتا پڑی۔ اس نے سوچا اگر مجھے
 معلوم ہوتا۔ یہ موتی اسے اپنی جان کو نگالے گی تو میں یہ خبر دوسرے طریقے سے آہستہ آہستہ سے
 سناتی۔

تھوڑی دیر کے بعد رضیہ نے پوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟" اس کی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔
 "سائیں ہسپتال میں"

”سائیں ہسپتال کہاں ہے ؟“

”سائیں میں؟ جہاں پہلے فطری کی بائیس ہوا کرتی تھیں نا انہیں اب جنرل ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔“
”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”جیسے شاکر گج راج سنگھ اپنے اکثر اہلین کے پریذیڈنٹ نے بتایا وہ اُسے دیکھنے گئے تھے۔ کیوں کہ عشرت نے اُسے بلایا تھا اور اس نے.... میرا مطلب ہے عشرت نے خاص طور پر مجھے۔“
”سے کہا تھا کہ رضیہ کو میری بیماری کی اطلاع نہ ملے۔ مگر چونکہ اب وہ مر رہا ہے اس لئے میں نے.... رضیہ نے فقرہ تاتمام چھوڑ دیا۔ رضیہ نے اپنا ہنس اٹھایا اور چھوڑنے سے باہر نکل گئی۔“

”کہاں جا رہی ہے تو۔۔۔۔۔ رضیہ نے چلا کے پوچھا۔“
”مگر رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

وہ بستی کی گلی سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہاں سے بائیسٹھ کچے پل تک بسا گئی ہوئی گئی۔ ایک دیوانی عورت کی طرح۔ جب وہ بائیسٹھ پل کے سبس اسٹینڈ پہنچی تو اس کا دم پھول رہا تھا اس کا سارا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ لیکن اُسے اپنی جسمانی تکلیف کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہاں سے اس نے سائیں جانے والی تیز بس لی اور اس میں بیٹھ کر سائیں ہسپتال کے نام کے پر جا اترتی۔ اور سیدی اندر چلی گئی۔ مریضوں سے ملاقات کا وقت ساڑھے چار بجے کا تھا اور ابھی اس میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کچھ عرصہ تو نرسوں اور ڈاکٹروں سے پوچھنے میں گزر گیا کہ عشرت کو کون سے و۔۔۔!

میں داخل کیا گیا تھا اس کے بعد رفیعہ دیر تک ہسپتال کی سڑکوں اور پگ ڈنڈیلوں پر چلتی رہی گھاس کے قلعوں میں کہیں کہیں پھولوں نے کھلنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہسپتال کی بیمار فضا میں ان کی کوششیں کچھ عجیب متحرک خیر معلوم ہو رہی تھی۔ سبز سے بھی قائل اور پھول کی بو آ رہی تھی۔ سڑخ اینٹوں کی لمبی لمبی خمی بارگاہیں ایک عجیب انفرود منظر پیش کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ملاقاتیوں کی تعداد بڑھتی گئی بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں پھل اور پھول تھے۔ ان سے رفیعہ کو بھی خیال آیا اور وہ دوڑی دوڑی ہسپتال کے باہر گئی۔ جہاں دو تین ٹھیلے والے دوکانیں بھلائے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کی شہجہ نرخ بازار سے دوگنی تھی۔ پھر کبھی رفیعہ نے آدمی و جن موسیایاں اور حوسیب خریدنے اور گلابیہ کے پھولوں کا ایک گچھا اُسے چار آنے میں مل گیا پھل اور گلاب نے کردہ پھر ہسپتال کے اندر آگئی عشرت بنی وارڈ میں داخل تھا۔ رفیعہ جلدی سے بنی وارڈ کی روشنی کی طرف گئی کیوں کہ ہسپتال میں اب ملاقات کے وقت کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اور لوگ باگ بچے عورتیں مائیں اور بھائی باپ اور بہنیں دوست اور رشتہ دار مریضوں کو دیکھنے کے لئے مختلف وارڈوں میں گھس رہے تھے۔ رفیعہ بھی جلدی سے بنی وارڈ میں گھس گئی۔ جنرل وارڈ کے اندر قطار در قطار لپٹنگوں پر مریض بیٹھے یا لیٹے ہوئے اپنے ملاقاتیوں سے باتیں شروع کر رہے تھے۔ ہسپتال کی زندگی میں مریضوں کے لئے یہ زندگی کے سب سے دل خوش کن لمحے ہوتے ہیں جب باہر کی زندگی کے تازہ جھونکے ہسپتال کی بیمار فضا میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ آمید، مسرت اور ہمتی ہمتی کی شادمانی اپنے ہمراہ لےتے ہیں۔ مریضوں کے بھوکے تڑپے چہرے بیدار اور اداس چہرے اس مسرت کی طرف اس آمید اور اشک کے لمحے جلد جذبات سے دیکھتے ہیں جیسے زندگی کو اپنے ہاتھوں اپنے ہاتھوں اور اپنے پیروں سے پکڑ کر اسی سے کلک جائیں گے۔

رفیعہ ایک بار سارے وارڈ کا چکر لگا کے گھوم گئی۔ اسے عشرت کہیں دکھائی نہ دیا۔

دوسری بار وہ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہر ایک چنگ کو غور سے دیکھتے ہوئے نرس کی طرف
بڑھ رہی تھی تاکہ اس سے پوچھے کہ عشرت کہاں ہے کہیں اس کا پتہ بتانے میں نرس نے غلطی تو نہیں
کی دوسری بار وہ دائیں دیوار سے لگے ہوئے بہت سے چنگوں کو دیکھتی ہوئی مرکز میں گچے ہوئے
نرس کی میز کی طرف جا رہی تھی کہ کسی نے اُسے تحفہ آواز میں پکارا۔

”رضیہ“

رضیہ نے پلٹ کر دیکھا۔

یہ میز کے بیڈ سے ایک سیاہ دھواکھا ہوا چہرہ اس کی طرف تک رہا تھا۔ آنکھیں گہرے گڑھوں
میں دھنس ہوئی تھیں۔ دھار اندر کو گھسے ہوئے تھے معلق ہتی گردن سے باہر کسی پڑانے وقت
کی گرہ بند جڑ کی طرح جو زمین سے اُگ کر باہر آگئی ہو۔ ایک پتلا سا نوا سا ہاتھ اٹھا اور پھر چنگ
پر گر گیا۔ رضیہ نے بڑی حیرت سے اس بچی کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب گئی، اور
پوچھنے لگی۔

”میں نے آپ کو سمجھایا نہیں۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کون ہیں“

وہ تاریک گڑھوں کے اندر کی سیاہ سیاہ پتلیاں ذرا سی چمک گئیں۔ بہت عرصے تک وہ بیار
چہرہ رضیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ سوکے سیاہ سے جڑ پڑے۔ ”عشرت“
”عشرت“ رضیہ بچی اور اُس پاس کے چنگوں کے روضہ اور اُن کے ملاقاتی چونک کر ان کی طرف
دیکھنے لگے نرس نے کہا ”شیش شیش شور مچا کر“

”عشرت! اپنی آواز کی حیرت کو بدلے ہوئے دھیر پھر بولی۔ اور عشرت کے چنگ پر بیٹھ گئی عشرت!“
”وہ بہت دیر تک اُس مخ شدہ چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور اُن نے پچھلے کشتوں
کی باتوں سے اس چہرے کو غیر کرتی رہی، جو کبھی عشرت کا چہرہ تھا۔ بہت آہستہ سے اسی

بھلے سے وہ لب اُبھرے جو کبھی عشرت کے تھے اور ان گالوں پر وہ سُرخئی اور صباحت آئی جو کبھی
عشرت کی تھی۔ بہت ہی آہستہ سے وہ آنکھیں ان تنگ ادھ تارک گرہوں سے اوپر اُٹھنے لگیں
سیاہ دھواکھا ہوا پرشکن، اتھا روضہ اور بھات ہوتا گیا، اور جب رضیہ نے اپنے عشرت کو بھان لیا
تو اس نے اس کو نحیف و نزار ہاتھ اپنے ہاتھ میں تمام لیا اور چُپ چاپ روئے لگی۔ سستے سالوں
کی گنتی بڑی تیزی ہوئی، بھروسہ محبت اس کی آنکھوں سے اُبلن کر باہر آگئی اور اس کے خیالات پر پہنچنے
لگی اور وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ اور چُپ چاپ اُنسو پونچھے بغیر روتی رہی۔ اور عشرت کا ہاتھ اس
کے ہاتھ میں کا پتار با۔ یہ ہاتھ جو ہاتھ نہ تھا ماضی کا ایک پٹا ہوا ادق تھا۔ ایک ادق کتاب زندگی
سے اُکھڑا ہوا جس کے مستقبل کے سب صفحے غائب تھے۔ "تم اس زندگی کا یا بنا سکتے ہو۔" رضیہ تم
بچی نہیں ہو کہ اس کاغذ کی ایک گشتی بناؤ اور اسے زندگی کے دیبا میں بہا دو۔ اور اسے لہریں
لیتے ہوئے دیبا کی سطح پر غائب ہوتے ہوئے دگھتی رہو۔ تم اس قدر غیر جذباتی بھی نہیں ہو کہ اس
کاغذ سے اپنے جوتے ہوئے پوچھ لو اور اُن کا پاش چکاؤ۔ بہت سے لوگ دوسروں کا زندگیوں سے
ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کاغذ پر اب وہ روشن تصویر کی سی ہے۔ وہی قبائلی امیدوں کا مرکز
تھی کہ تم اس وجہ سے اسے تھکر کے اپنے بلاؤں کے نیچے لپیٹ دیکھتے ہوئے بنے لگاؤ۔ یہ
تو ایک شکستہ زندگی کا پٹا ہوا ادق ہے جو سماج کے تیز و سحر خیزوں کے چھیڑے کھاتا ہوا، بلیا
سے اُڑتا ہوا، تمہارے سامنے آ رہا ہے۔ اس پر راہ چلتے قدموں کی کچھڑے۔ گندی نالیوں کی بو ہے،
بیسے زخموں کا بھور اور کھنکھارتے ہوئے گلوں کا شور مچا رہا ہے۔ اس سلسلے کچھ پٹے ہوئے ادق کا تم
کیا کرو گی، جس کی زندگی کا ایک حرف بھی اب تنگ طرح سے نہیں چڑھا جاتا۔ بھاگ جاؤ
رضیہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔

لیکن رضیہ یہاں نہیں۔ دوڑی نہیں۔ غائب نہیں ہوئی۔ وہ اس بستر پر بھی بیٹھ سکتی رہی۔ وہ ادھ

بھی عشرت کے خاموشی اٹکار کے باوجود اس کے قریب آگئی۔ اس نے عشرت کو سب کے سامنے اپنے گلے سے لگایا۔ اس نے اس کا ماتھا چوما۔ اس کے بٹے ہوئے زخموں پر ہاتھ مارے اور اس سے آہلہ آنکھوں اور سر کیوں کے پتھر میں کہا۔

”تم زندہ رہو گے عشرت۔ تم زندہ رہو گے۔ میں تمہیں زندگی دوں گی۔ اپنی ساری زندگی تمہیں دے دوں گی۔ یہ کہتے ہوئے رفیعہ کے چہرے پر وہ جلال تھا۔ جیسے وہ خود کوئی انسان نہ ہو، میسا ہو۔ اور ساتھ ہوئے عشرت کے دل میں زندگی کا شعلہ بھڑکا، اور حیات کی بجلی ہوئی تو پھر سے سہارا پا کر کھنکھنے لگی، اور وہ سوچنے لگا۔ سچ، کوئی محبت نہیں کر سکتا عورت کی طرح، اور کوئی قربانی نہیں دے سکتا عورت کی طرح، اور کوئی سعادت نہیں کر سکتا عورت کی طرح، اور کوئی کسی کے لئے جان نہیں دے سکتا عورت کی طرح، عورت ایک بہت ہی معمولی ہستی ہوتی ہے۔ بہت ہی معمولی چھوٹی اور نازک لیکے اپنے معمولی سے چھوٹے سے ماحول میں اک خدا کی طرح ہستی ہے۔ وہ چلتی کرتی ہے اور شب و روز زندگی دیتی ہے۔ اور اس کی کوکھ سے اور پیٹ سے ہر شے اور ہاتھ کی انگلیوں سے، زندگی کے ہوا اس کے دودھ اس کے شہد اور اس کے گلاب کی ہلک آتی ہے

بہت دیر تک رفیعہ عشرت کا سر اپنی آغوش میں لئے بیٹھی رہی اور بہت دیر تک اس کی باتیں سنتی رہی۔ ٹوٹی پھوٹی باتیں سب سے بڑے سچے۔ خاموشیوں کے وقفے جو کبھی کبھی جھلکے سے نہ رہتے تھے سکون میں ڈھیلے ہوئے فخر سے بے غل بے غم طمان آہستہ آہستہ دیر سے دیر سے اگلے قریبی چاندنی میں رفیعہ کے چہرے میں خوشی کے آئینے کی کہانی اگلے خوشی میں نمودار کرنے لگی۔ اس کہانی کی کوئی معمولی شکل و صورت نہ تھی۔ وہ ایک عجیب ہوتا کھیر تھی، کیوں کہ عشرت نے زندگی کی تپش کا آخری قطرہ پیا تھا، اور وہ سماج کی تہ میں ٹھوب کرانے کا دل لگ ہوا تھا، جہاں ناسودوں کے پھول کھلتے اور بیاریوں اور جڑیوں کی پیپ لادے کی طرح بہتی ہے اور غیر سماجی افراد شامک پھیلوں کی طرح ٹھ

اور بے باک اس جذبہ آب دنیا میں اپنا شمار ڈھونڈتے ہی۔ عشرت نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اور اب دنیا نے اس کی ہڈیوں تک ہاگوشت کھایا تھا۔ اور اس کی رگوں کا سارا لہو خور لیا تھا۔ اور اسے لمبوں کی نچڑی ہوئی کھال کی طرح باہر کوٹھے پر پھینک دیا تھا، کسی نہ کسی طرح عشرت اس ہسپتال میں پہنچ گیا تھا، اپنی زندگی کے آخری ایام پورے کرنے کے لئے

عشرت نے کہا ”میں چاہتا نہیں تھا کہ میں تمہیں اپنا چہرہ دکھاؤں ؟“
”کیوں ؟“

”کہ نہیں سکتا“ عشرت نے اپنا دل ٹٹوتے ہوئے آہستہ آہستہ رگ رگ کر کہا ”موت یہ چاہتا تھا کہ جب مرداؤں تلاش نہ کرے مارے کر دی جائے“
”کیوں ؟“

سوچتا ہوں جن لوگوں نے میری زندگی کی بے عزتی کی۔ وہ میری موت کی کیسے عزت کر سکیں گے موت یہ خیال تھا، تم میرے مرنے کے بعد میری بے عزتی نہیں کر سکو گی ؟
رضیہ چپ ہو گئی۔

عشرت نے کہا ”اں مرنے سے پہلے راج کو اپنا چہرہ ضرور دکھانا چاہتا تھا ؟“
حداد اک خبر کی طرح رضیہ کے دل میں گھوما۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جتنی نہیں ابھی تک اس سے محبت ہے ؟

”محبت ؟ عشرت ہنسا۔ اس کی ہنسی بڑی تلخ اور ناخوش گوار تھی۔ عشرت نے بڑی تیزی اور جلدی سے کہا ”موت ایک لمحے کے لئے اُسے یہ چہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ آج کا چہرہ میرا چہرہ۔ جیسے آج ہے۔ موت ایک لمحے کے لئے۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو ؟“
رضیہ نے کہا ”اں میں سمجھتی ہوں ؟“

عشرت نے کہا ”زی نے مجھے بتایا، ان کا خیال تھا۔ میں ایک ہفتے میں مر جاؤں گا۔ ڈاکٹر نے دس دن پہلے مجھ سے کہا تھا۔ تم اپنے گمراہوں کو اطلاع کرو۔ مگر میری ہمت نہ ہوئی اور بدھی اماں کے پاس یہی بھی نہ ہوں گے آنے کے لئے اور جھوٹے چھوٹے بہن بھائی۔ نہیں۔ نہیں۔ میری ہمت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا میں اکیلا ہی مر جاؤں گا۔ وہ ہفتہ بھی گزر گیا اور میں زندہ ہوں۔“

رضیہ نے کہا ”تم زندہ رہو گے۔ میں تمہیں زندہ رکھوں گی۔ اب تم نہیں مرو گے۔ رضیہ کے لیے میں بڑا یقین تھا۔ عزم اور اعتماد اور بھروسہ یکا یک ہسپتال کے وارڈوں میں گھنٹیاں بجے ٹیکس ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ رضیہ نے اپنے آنسو دیکھ کر کہا ”میں کل پھر آؤں گی۔ ہر روز آتی رہوں گی‘ مت گھبراؤ اب تم باطل اپنے ہو جاؤ گے۔“

ہسپتال کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے رضیہ گوی، عشرت برابر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اگلے دن عشرت کی حالت زیادہ خراب تھی۔ جب رضیہ وہاں پہنچی تو اس کی آنکھیں
 بے فوری نظر آتی تھیں۔ اور وہ بہت خاموش لیٹا تھا، ٹاکٹروں نے آج اُسے سیلائن پر رکھا
 انیل کے سینڈ پر کانچ کی ٹوٹیوں سے سیلائن قطرہ قطرہ کر کے اُس کے جسم میں پہنچایا جا رہا تھا۔
 ”تم اس قدر خاموش کیوں ہو“ رضیہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں“ عشرت نے جواب دیا اور پھر بہت دیر تک خاموش رہا۔
 رضیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہاں سے کہہ کر سے وہ اسے جنت دلانے کیسے؟ یکا یک اس کی نظر
 قریب کے میڈ پر پڑی۔ انہیں خبر کے بیڈ پر آج ایک نیا مریض آیا تھا، کل والا یہاں موجود تھا، جو
 بار بار رضیہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ رضیہ نے پوچھا۔
 ”تمہارا ٹیڈی آج بدل گیا؟“

”ہاں“

”وہ چُرانا کہاں چلا گیا“

”مر گیا“ عشرت نے آہستہ سے کہا۔

رضیہ نے اگلے روز رضیہ سے کچھ روپے اُدھار لئے کچھ اس کے پاس بھی تھے لڑکے اُس نے اس دن کا ایڈوائس کرایہ ہسپتال میں داخل کر دیا، اور عشرت کو پرائیویٹ وارڈ میں ایک بنگلہ کمرے میں داخل کر دیا، پرائیویٹ وارڈ میں داخل ہوئے ہی عشرت کی حالت بہتر ہونے لگی۔ رضیہ ہر روز آتی تھی ہر روز اس کے لئے پہلن اور بھول لاتی تھی اور یہ ثواب پرائیویٹ وارڈ کا کمرہ تھا، اس لئے رضیہ جتنی دیر چاہے وہاں ٹھہر سکتی تھی اس لئے جب بھی اُسے کام سے فرصت ملتی وہ یہاں آجاتی۔ بلکہ کئی بار تو کام کو ترجیح نہ دے کر وہ یہاں آجاتی۔ ڈاکٹر اہتہ جو ہر روز عشرت کو دیکھنے آتے تھے عشرت کی بہتر حالت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ رضیہ سے بولے ”جب سے تم آئی ہو اس کی حالت اچھی ہو رہی ہے۔ میں تو تقریباً بائیس ہو چکا تھا، کیونکہ عشرت میں اپنی زندگی سے رونے کے لئے اند فوٹ نہ تھی اور جب مریض ہی مرنے کا ہے تو ڈاکٹر اسے کب تک زندہ رکھ سکتا ہے۔“

جب ڈاکٹر ملا گیا تو عشرت نے کہا ”ڈاکٹر سچ کہتا تھا۔ اُن دنوں میرے دل میں جینے کی خواہش تک باقی نہ رہی تھی۔“

”تم کو زندہ رہنا ہوگا! عشرت! اپنی بوڑھی ماں کے لئے اپنے ننھے بھائی بہنوں کے لئے۔“

”میں تمہارے لئے زندہ رہوں گا۔“ عشرت کی اچھلیاں رضیہ کی آنکھوں سے کھیلنے لگیں۔

”رضیہ! کیا تمہیں میرین ڈرائیو کی سیر یاد ہے؟“

رضیہ کی آنکھیں یہ ایک سترت سے چمک اٹھیں۔

”جیسے کبھی یاد نہیں آئی“ عشرت نے کہا ”اتنے سالوں میں۔ راج کے ہاں، شمشاد کے ہاں، دلایت حج کے ہاں، قرہ کے ہاں، دادا کے ہاں۔ کبھی مجھے وہ رات یاد نہیں آئی۔ تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ہاں تمہارا چہرہ کئی بار سامنے آیا جیسے مجھ سے شکایت کر رہا ہو اور ہر بار میں نے تمہارے چہرے کو اپنے ذہن سے مٹا دیا۔ آدمی شکایت کرنے والے چہرے بھول جاتا چاہتا

ہے میں بھی ایسا ہی کرتا تھا، میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ لیکن جزل وارڈ میں بائیس نمبر کے بستر پر موت اور زندگی کے درمیان وہ خوبصورت یادگاری بار میرے ذہن میں چمک اٹھی اور مجھے سب کچھ یاد آیا وہ کولانے میں سوزین لیڈر شوز کی دوکان پر جاتا۔

”وہ سبز جوتا اکی تک میرے پاس ہے اس تہی کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں پہنا۔“
 عشرت نے کہا۔ ”انڈیا گیٹ سے ہم چو پائی گئے تھے وہاں ہم نے کھٹی میٹھی پاٹ کھائی تھی پھر انڈیا گیٹ سے ہم برٹی گئے تھے، جہاں ہم نے پھلوں والے سینڈ پر...“
 رفیع نے اس کی بات ٹوک کر کہا۔ ”بھولتے ہو جو چو پائی سے ہم برٹی نہیں گئے تھے برٹی جانے سے پہلے ہم ساٹریج گئے تھے جہاں ہم نے آئس کریم کھائی تھی۔“

”پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھنا اور بارش کا برسنا اور ہولے ہولے ٹیکسی کا میری ڈرائیور کی طرف چلے جانا تم میرے پہلو میں بیٹھی تھیں۔“

”اور وہ دھند؟“ رفیع نے آہستہ سے کہا، اور اس خدائی یاد سے اس کا چہرہ مستقر ہو گیا۔ ”جائے وہ دھند کبھی نہیں بھولتی۔ دھند میں تمہارا وہ چہرہ، تمہاری وہ بانیں۔ تمہارا وہ ———۔“
 ”بس ———۔“ رفیع نے شرم سے عشرت کا ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیا۔
 عشرت کے چہرے پر شرم کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔

”وہ رات اس کے بعد کئی بار میرے بستر پر آئی، بائیس نمبر کے بستر پر زندگی اور موت کے درمیان ٹپکتے ہوئے کئی بار وہ رات میری زندگی کے مقدس لمحے کی طرح آئی۔ رفیع تم سے سچ کہتا ہوں جب میں نے اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیا تو صرف ایک وہی رات معلوم ہوئی۔ جسے میں اسی صحن میں طرح رکھنا چاہوں گا۔ اس کا ایک لمحہ تبدیل نہیں کروں گا۔ لیکن باقی ساری زندگی ———۔“
 اگر یہ میرے مس میں ہو ناگرجے وہ بارہ زندگی بسر کرنے کی اجازت ملے، شروع سے آخر تک خدائی

سب بدل ڈالوں گا۔ صرف وہی ایک رات باقی رہنے دوں گا۔
 رفیعہ کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

عشرت کچھ دیر چپ رہا پھر بولا "مگر وقت کے دھارے کے بہاؤ میں تم واپس نہیں جاسکتے
 اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتے۔ کچھ نہیں کچھ نہیں ایک لمحے تک کو بدل نہیں جاسکتا" عشرت کے لہجے
 میں اک پر خلوص پختہ ادا تھا۔

"ماضی نہیں مگر مستقبل قریب لا جاسکتا ہے" رفیعہ نے کہا۔

"اب اگر میں زندہ رہا۔ اب میں شب و روز اپنی زندگی کے لئے لڑتا ہوں، تو میں نے فیصلہ کیا
 ہے۔۔۔ کیا بے قدموں میں رہوں گا؟"

ان لفظوں کے لئے۔ لفظوں کے لئے نہیں لفظوں کے بند اس صداقت کے لئے
 کب سے رفیعہ کا دل تڑپ رہا تھا اس کے کان بھوکے تھے ترے ہوئے اس آواز کے لئے وہ کب
 سے غلام ڈھونڈ رہے تھے اس نئی آواز کے بلاوے کو جو اس وقت رفیعہ کے کانوں میں گونج
 رہی تھی

عشرت چپ ہو گیا۔

نھوڑی دیر کے بعد بولا "تم نے میری ماں دیکھی ہے؟"

رفیعہ نے سر ہلایا۔

"اس کے بال سفید سی اس کا قد چھوٹا ہے اور اس کا رنگ گورا ہے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی
 اس کے گالوں پر خیریاں مگر جب وہ ہنستی ہے رفیعہ تو اس کی عمر کے دس پندرہ سال کم ہو جاتے
 ہیں نہ آج بھی ایک بچے کی طرح ہنستی ہے، بہت کم ہنستی ہے کیوں کہ اس کا غامد مزاج ہے اللہ
 اس کے بیٹے نے اُسے بہت ڈکھائے ہیں مگر پھر بھی ان دکھوں کے درمیان جب وہ ہنستی ہے

تو اس کا چہرہ صبح کے آسے کی طرح جھلکے گا ہے۔ ان دنوں میں اپنی ماں بچے بہت یاد آئی وہ ہاتھوں پر ہندی ایسی عمدہ جاتی ہے کہ محلے بھر کی جوان لڑکیاں میری ماں سے اپنے ہاتھوں پر ہندی کے نقش و نگار ابھارنے کے لئے آتی ہیں۔ بامیں نمبر کے پنگ پر لٹھے لٹھے کئی باریں نے اپنی ماں کو تہا رہا اور ہندی سے جلاتے ہوئے دیکھا ہے :

رفیقہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

عشرت نے کہا ”کئی بار تجیل میں میں نے دیکھا ہے۔ اپنے آپ کو سہرا لگائے اپنے گھر کے باہر کھڑے سائیں سے کہتے ہوئے گھوڑا لاؤ۔ پھر نہایت میں جھولنا وہ نواشاہ کا گھوڑا میرے سامنے آیا۔ میں اس پر سوار ہوا اور جانے کن پڑنچ علیوں میں ہوتا ہوا میں تنہا ہی ڈولی کے آگے آگے اپنے گھوڑے پر سوار تھیں اپنے گھر لے آیا۔ کون گیت گارہ تھا یہ تو میں نے نہیں دیکھا میں نے تو صرف گھوڑے سے اُتر کر تنہا ہی ڈولی کا پردہ کھینکا دیا۔ اور میری ماں بتیں بڑے پیار اور محبت سے سہارا دے کر“

”ہیں! میں! رفیقہ سبک سبک کر رونے لگی ”ہن تصویروں کو ہاتھ مت لگاؤ عشرت ایک عورت! ہمیں تصویروں کو دیکھ دیکھ کر کسی کی سفارقت میں اپنی ساری زندگی بسر کر دیتی ہے“

عشرت کے چہرے پر اک خف سی مسکراہٹ آئی وہ تھک کر اپنے محلے پر جا کر اس کی آنکھیں بند کر گئیں۔ رفیقہ نے اس کی بغض دیکھی۔ اسے گرم گرم دودھ پلایا۔ عشرت کے چہرے پر خدا سی سُرخی دہیں آگئی۔

”عشرت تم زیادہ باتیں نہ کرو“ عشرت نے خوشی اور محبت سے رفیقہ کی جانب دیکھتے ہوئے بہت آہستہ سے کہا: ”اجا“

”اچھا“ زم زم شیریں لفظ اچھا چاروں طرف محبت کا مدغم مدغم نور کھیرتا ہوا لفظ اچھا گہری
 سانس لیتا ہوا پرسکون لفظ جو رنج و غم کے رخساروں کو اکسیر کی طرح چھو گیا۔
 ”یہ اچھا پس لے کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔“ میں اب کل تاؤں گی؟“

دوسرے دن سیٹر باخو دیا کا دیوانہ عمل گیا۔ کوریا کی جنگ بند ہو گئی تھی، بچی اور شاگ
 اکینچ کے بھاء دھڑے چمچہ کر گئے تھے۔ باخو دیا کا خیال تھا کہ جنگ جاری رہے گی۔ اس کا خیال تھا
 کہ امریکی بھی رخ نہیں کریں گے۔ جنگ ہوتی رہے گی حالانکہ کئی دنوں سے طرح طرح کی خبریں آرہی
 تھیں۔ مگر باخو دیا کو صل پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس کا پورے یقین تھا کہ جنگ جاری رہے گی، یہی سوچ کر
 اس نے شاگ اکینچ پر بڑے بڑے دافل کھیلے تھے وہ اور سیڈم ہمیشہ بڑے بڑے
 دافل کھیلنے کے عادی تھے اسی لئے انہوں نے لاکھوں کمائے تھے۔ اسی لئے آج ان کا دیوانہ
 بھی عمل رہا تھا۔

دلورین روڈ پر اور ادھر ادھر کے شوڈیوز میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی سیٹھ باخو دیا
 نے دیوانہ بحال دیا۔ سڑکوں پر سیٹر کو اتنی لاکھ کا ہرمانہ دینا پڑا اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا
 سیٹھ باخو دیا ایک رات میں اسی لاکھ روپے ہار گیا تھا۔ اپنی کل پونجی۔ ایک چھٹی کوڑی اس کے پاس
 نہ رہی تھی۔ اس کا کل جنگ سلیبس۔ اس کے شوڈیوز کارخانوں میں چھتے، بلڈنگیں ایک رات میں
 ہلک تبدیل کر چکی تھیں۔ اب سیٹھ کے پاس بس وہی روپیہ ہونگا جو اس نے گھر میں رکھا ہوگا یا میٹم

کے زیور اور ایک گاڑی جو خوش قسمتی سے اس کے بھتیجے کے نام تھی۔

یہ خبر سنتے ہی جوق در جوق لوگ۔ انڈسٹری کے ہر شعبے کے لوگ سینٹر باخولیا کے دفتر میں انبار افسوس کے لئے پہنچنے لگے۔ کیونکہ سینٹر باخولیا کچھ بھی کہنے غلام انڈسٹری کا ایک نامور مشہور آدمی تھا۔ اس تک درجنوں تصویریں بنا چکا تھا۔ سینکڑوں آدمیوں سے اس کے تعلقات تھے بہت سے اداکاروں نے اس کی اپنے والی دو ایک فلموں میں مفت کام کرنے کی پیش کش کی۔ اس کے سٹوڈیو کے مزدوروں نے اگلے تین ماہ کے لئے تزاوا لینے کی آفر دی۔ ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے انبار افسوس کو رہا تھا کچھ بھی نہیں۔

اکرم بھی یہ سنتے ہی سینٹر باخولیا کے ہاں پہنچا۔ وہاں میڈم اپنے کمرے میں بدستور تاش کی بازی کھیل رہی تھی۔ وہی رمی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ صرف میڈم اپنے سینے کے اوپر کا ٹوک بار بار اس طرح جھٹکتی تھی جیسے وہ خواتین کوئی اڑا رہی ہو مگر یہ تو میڈم کی پرانی عادت تھی میڈم کے پاس اگرے کی ایک مشین ملوانت شیشی تھی جو فلموں میں اپنی قسمت آزمائی کرتی تھی۔

میڈم نے اکرم کے انبار افسوس کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے وہی کھیلتی رہی۔ اس نے گھبراہٹ دیکھ کر بچن دت سے کہا۔

”ایک منٹ سے اوپر ہو گیا تم چال نہیں چلے“

میڈم کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی کیونکہ میڈم وقت کی ٹہنی پابند تھی۔ وہی کہتے وقت اگر کوئی چال میں دیر لڑتا۔ یا سیٹ پر آنے میں دیر کرتا۔ یا کسی کام میں دیر کرتا تو اسے سخت کوٹت ہوئی تھی وہ وقت منٹ نہیں سیکنڈ تک کے حساب کی سختی سے پابند تھی بچن دت موسیقار نے مسکرا کر کہا ”میڈم میرا دل کہیں اور چلا گیا تھا“

”دل؟“ میڈم نے غصا ہو کر کہا ”دل کاری سے کیا کام؟“

”تم بھوتے ہو جین دت“ اکرم نے کہا ”میڈم کسی کے دل کی بات نہیں سمجھیں وہ صرف دقت کی سوسیاں دیکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ میڈم کے پاس کوئی دل نہیں ہے۔ وہاں اندر بھی ایک گھڑی ہے جس کی ٹک ٹک کو وہ غلطی سے اپنے دل کی دھڑکن سمجھتی ہیں“

میڈم نے چلا کے کہا ”تم خواہ خواہ اپنا فلسفہ بگھار رہے ہو، دیکھتے نہیں میں کیل رہی ہوں“
 ”میڈم“ اکرم نے پوچھا ”کیا آج بھی آپ کو اس کمیل کا پتہ نہیں چلا۔ جو آپ برسوں سے کیل رہی ہیں۔ یہ کیل ہے کہ بزنس ہے۔ جو آپ کے قب خانہ بے گناہ ہے۔ بند رو کا سٹرا ہوا پانی ہے؟
 کتنے ہی بنگلوں کی چیک کریں۔ کتنی ہی عیصوں کی ڈوریاں۔ کتنی ہی غلامی کی ریتیاں۔ دھلگے بھیریں۔ ان ماشوں کے تہوں سے بندھی ہیں۔“

”جکے جاگو“ میڈم نے کہا ”اتر دو میں تمہاری پچھڑا توں پہنچے میں کیا داغل ہوئی کہ تم اکرم سے دنیا کے سب سے بڑے دانش ور بن گئے۔ یہ تو تم آج اخبار افسوس کرنے آئے ہو کہ پچھڑا جانے لگے ہو، تمہیں مشرم نہیں آتی آج میں دلوالیہ ہوئی ہوں اور تم اس طرح“

”تم اگر دلوالیہ ہو تم میڈم، تو مجھے اس قدر افسوس نہ موتا کہ اکرم نے کہا ”افسوس تو یہ ہے میڈم کہ تمہارے ساتھ آج کتنے ہی اسٹوڈینٹ کے ملازم، کتنے ہی تصویریں میں کلام کرنے والے اداکار دلوالیہ ہوئے ہیں۔ جب تم شاگ اپنیخ پر داؤ لگاتے ہو تو کیا تم بھی یہ سوچتے ہو اس ایک داؤ میں تم کتنے سو لاکھ کتنے ہزار انسانوں، زندہ گیوں کو داؤ پر لگا دیتے ہو۔ یوں ایک چکی میں“

میڈم نے کہا ”تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر اندر حاؤ سیٹھ یا محو یا سے بات کرو۔ وہ بے چارہ آج باطل بولکھلایا ہوا ہے۔ میرا قابلِ قدر شوہر۔ وہ آج تمہاری ہر بات سننے کے لئے تیار ہے“

اکرم نے کہا: "میں تو اس وقت بھی رنی کاکھیں دیکھوں گا۔ مجھے اس میں بٹاؤ نہ آ رہا ہے۔"
چند منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر بچہ ایک میڈم گہرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "آج اس تاش میں کوئی
خرا نہیں رہا۔"

اکرم مسکرا کر میڈم کے پاس گیا اور اس کے ناک کے سرے پر ہاتھ رکھ کے بولا "تو آؤ میڈم اس
پرانی گھسی پٹی تاش کو بھاڑ ڈالیں۔ اتنے دھاگوں، رستیوں، زرخیزوں، ڈوزیوں سے اپنی بوٹی بادی
پتروں والی تاش کو بھاڑ ڈالیں۔ اور یادوں ہزار۔ یادوں لاکھ، یادوں کروڑ کی بہت بڑی تاش سے زندگی
کایک نیاکھیں کھلیں۔ جس میں کوئی دھاگا نہ ہو، کوئی ڈوری نہ ہو، کوئی زرخیز نہ ہو۔
پچھے بازو، میڈم بڑی حقارت سے اکرم کی طرف دیکھتی ہوئیں کرے سے باہر نکل گئیں۔

سیٹھ باکٹر یا داتنی بیت بوکھلائے ہوئے پریشان حال اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے
تھے۔ اکرم کی بات سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو تم آج میرے ڈائریکٹر ہو جس نے میرے
ایک پچر مفت بننے کی آفر دی ہے۔ آج صبح سے میرے ہاں لوگوں کا تانا بگاڑا ہوا ہے۔ اکرم ایک
عجیب و غریب بات مجھے معلوم ہوئی۔ مجھ سے ٹیلیفون پر ٹیلیفون کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھوں
کے میرے کمرے دو ستروں کے، افسوس ہمدردی کے ٹیلیفون کر ایک شخص بھی ان کمرے میں سے میرے
پاس آئے نہیں آیا جنہیں میں نے ضرورت کے وقت پانچ پانچ لاکھ روپے قرض دئے ہیں، اور اگر
آ رہے ہیں تو تمہارے ایسے لوگ تم سے بھی غریب لوگ میرے سٹوڈیو کے مزدور، ملازم، نوکر پیشہ
بد حال غریب لوگ ان کے پاس تو خود ایک پیسہ نہیں ہے لیکن وہ کس بچے دل سے میرے ساتھ
ہمدردی کر رہے ہیں۔

حالانکہ ————— حالانکہ ————— ان تمام لوگوں پر مصیبت لائے والا میں ہی وہ اکیلا آدمی ہوں۔ لیکن یہ لوگ کبھی اپنی مصیبت کی بات نہیں کرتے۔ صرف میری مصیبت کی بات کرتے ہیں۔
اکرم چپ رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیٹھ اُٹھا۔

”میرا خیال ہے! اکرم! کسی کے پاس زیادہ روپیہ نہیں ہوتا چاہئے اتنا زیادہ روپیہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس کا دماغ خراب ہو جائے۔“

اکرم نے مسکرا کر کہا: ”سیٹھ یہ تم تو آج سوچتے ہو۔ لیکن اگر کسی کو تباہی سے پاس پھر کہیں سے پانچ دس لاکھ روپیہ آجائے تو تم پھر —————؟“

”ہاں۔“ سیٹھ ہانچو دینے اپنی افسردگی کے بازو نہیں کر کہا: ”تم باطل ٹھیک کہتے ہو۔ ————— میں بھڑی۔ ————— ہاں تم باطل ٹھیک کہتے ہو۔“ سیٹھ زور سے ہنسنے لگا۔ بات اس کی بھڑی لگی تھی

ایک رات رضیہ کو مشرت کے پاس رہنا پڑا۔ کیوں کہ اچانک ہی مشرت کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شام کے وقت جب رضیہ اس کے ہاں پہنچی تھی تو وہ خاصہ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ آج رضیہ بھی بہت خوش تھی کیونکہ اکرم کی تصویق کسان ”مارو میں آنٹوں جتنے میں جا رہی تھی۔ کارخانوں کے مزدور۔ ایسے لوگ جو ہمارے شہر کے سینکڑوں گھرانوں میں اپنے چھوٹے گھر اور کھیتیاں چھوڑ کر

آئے تھے یا زنداؤں کے ظلم کی وجہ سے وہاں سے بے دخل ہو کر چلنے لگے تھے اور شہر بکری میں
 اگر نئے نئے مزدور رہتے تھے۔ ان لوگوں کے لئے کسان اور اس کی زمین کا سارا ایک گہری دل چسپی کا
 باعث تھا، جوق و جوق سینکڑوں کی تعداد میں یہ لوگ ہر مزدور مائتہ سینا میں دس آنے خرچ کر کے
 کسان - بچر و بچر رہے تھے اور جان رو لینڈ کہتا تھا کہ مائتہ میں تاشائیوں کا یہ طبقہ کبھی سینا دیکھنے
 نہیں آیا تھا۔ خود اس کے لئے یہ تصویر ایک نیا تجربہ تھی۔ اتنے سالوں میں ہالی وڈ کی صرف ایک
 پچر کے سوا مائتہ میں کوئی اور تصویر آٹھویں ہفتے میں نہیں پہنچی تھی اور جان رو لینڈ کا خیال تھا کہ ابھی
 تین چار ہفتے یہ تصویر اس طرح زور پکڑے چلے گی۔ اور گو اکرم اور ستیہ مائے اور دوسرے لوگ
 پچر کی کامیابی سے بہت خوش تھے مگر سینہ کتر چند سے جھگڑا ہونے کی وجہ سے وہ کوئی نئی تصویر
 شروع نہیں کر سکتے تھے۔ سینہ سے ان کی بدستور لڑائی تھی۔ مائتہ کی پٹلی کے اخراجات بہت
 تھے۔ اور ان اخراجات کو ادا کرنے کے بعد جو تھوڑا سا فائدہ ہوتا تھا وہ سینہ کتر چند کی جیب میں
 جا رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس ایک پانی نہ پہنچی تھی جس سے وہ کوئی دوسری پچر شروع کر سکتے نہ
 ابھی کسی دوسرے فائبر سے کوئی پیش کش آئی تھی۔ اس لئے ذہنی اعتبار سے نہ بھی مالی اعتبار سے
 یہ لوگ بہت پریشان تھے۔

انہیں دونوں سویت اس سپورٹ فلم بھی کے ناظم نے کسان، فلم دیکھی اور بہت پسند کی
 اس نے ماسکو کو دکھا کہ اس فلم کی نمائش اگر سویت یونین میں ہو تو بہت اچھا رہے گا۔ فلم ماسکو
 بھی گئی۔ یہاں ماہرین فن نے دیکھی پسند کی اور سویت یونین میں نمائش کے لئے خرید لی گئی۔ اکرم
 اور ستیہ راتے بہت خوش ہوئے اب وہ نئی تصویر شروع کر سکتے تھے۔

فیبر نے عشت کو بتایا کہ اکرم کہہ رہا تھا جب چاروں طبقات اندھرا تھا اور کسی کوئی روشنی نہ
 تھی۔ پچر کا سیلاب تھی مگر سب روپہ سینہ کی تجویز میں جا رہا تھا اور وہ جنہوں نے اپنے دل و دماغ اور

جسم کی ساری محنت سے اس بچہ کو کامیاب کیا تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرتے بیٹھے تھے۔ اور کوئی تصویر شروع نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت ہاتھ اُٹائے۔ یہی میں کام کرنے والوں کے ہاتھ اور ہاتھ کے لوگوں کے ہاتھ۔ ایک مضبوط مصافحہ کی طرح ہمارے ہاتھوں سے مل گئے اور ہم نے محسوس کیا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ مگر لاکھوں کروڑوں لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ وہ لوگ جو ہماری ہی طرح ہیں وہ ہماری ہی طرح محسوس کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں، کام کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، روتے ہیں، ہنستے ہیں اور صلح اور امن کی باتیں کرتے ہیں۔

اور اگر کم کہہ رہا تھا مجھے آج محسوس ہوا ہے جیسے میری وہ نہیں دس لاکھ دس کروڑ ہائیں ہیں۔ آج رخصتی کی آنکھوں میں مسرت کی گہری چمک تھی وہ عشرت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نے کر لیا۔ یہ دو تین ہاتھوں کے ہیں پھر ہماری نئی تصویر شروع ہو جائے گی اور میں نے گرم سے وعدہ لے لیا ہے جب تم اپنے جو بوائے گے تبیں وہ اس بچہ میں مضحکہ کام دیں گے۔ بیرو کا نہیں مگر کوئی اچھا سا رول جسے تم بخوبی سمجھا سکو۔

”اچھا بھوکے اب میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی معمولی سا کام، مگر اپنے ہاتھوں کی محنت کا کام۔ جس سے میرے ہاتھ سے پسینہ چکے میرے ہاتھوں میں قوت آئے۔ میرے سینے میں سانس مضبوطی سے چلنے لگے۔ میں اب ایسا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اور اچھا ہو کے اب میں یہی کروں گا۔“ عشرت چُپ ہو گیا۔ رخصتی فریسی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

عشرت نے کہا ”کیا تم نے مجھے سات کر دیا ہے؟“

رخصتی نے اپنے رخسار عشرت کے گالوں سے گلا دے ”کیسی باتیں کرتے ہو میں عورت ہوں مجھے معلوم تھا۔ ایک دن تم میرے پاس آؤ گے۔ میری محنت اتنی مضبوط تھی ا“

یہ ایک عشرت کا چہرہ باطل نمود ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں وہ بھیچے پر لڑکے

گہرے سانس لینے لگا۔
”کیا ہوا۔“

”پتہ نہیں بہت ہی سخت درد ہو رہا ہے۔“

رضیہ بلدی ہے نس کو بلا لائی۔ نس بھاگی بھائی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اب عشرت کا درد بڑھتا جا رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں میٹھ رہے تھے۔ اس کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے غور سے دیکھنے کے بعد کہا ”پیٹ کے اندر میریج ہو رہا ہے اللہ اندر کا زخم کھل گیا ہے۔“
”زخم؟ رضیہ چون۔“

”گر دے کا آپریشن جو ہوا تھا۔ وہ زخم شاید کھل گیا ہے اندر سے۔“
”پھر؟“

ڈاکٹر نے اپنے شلے ہلائے اور خاموش بہت دیر تک وہ عشرت کے پاس بیٹھا رہا۔ دوا دی گئی انجکشن لگائے گئے۔ سب ترکیبیں کی گئیں۔ مگر عشرت کی حالت بگڑتی گئی۔ رات کے تین بجے ڈاکٹر رضیہ کو پچھانے کے لیے گیا۔ اور اس سے کہنے لگا ”اب کوئی امید نہیں رہی“
رضیہ خاموش تھی۔

ڈاکٹر نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا ”اب یہ چند گھنٹوں کا زمانہ ہے تبہیں اس سے اگر کوئی خاص بات کہنی ہو تو کہو۔ اس کے گھر والوں کو بلانا ہو تو بلا لو۔ میں اپنی گاڑی دیتا ہوں۔ اب خاتمہ قریب ہے۔ رضیہ باہل خاموش رہی ڈاکٹر نے گھڑی دیکھ کر کہا ”مجھے ایک دوسرے مریض کو دیکھنے جانا ہو گا۔ دوسرے ڈاکٹر کو ادھر بھیجتا ہوں۔ ہم لوگ تو آخری وقت تک لڑیں گے۔ مگر۔۔۔۔۔“
ڈاکٹر نے اپنے شلے ہلائے اور سر جھیکائے وارڈ سے باہر چلا گیا۔

”واکٹر کیا کہتا تھا۔ عشرت نے پوچھا۔

”وہ کہتا تھا تم زندہ رہو گے۔“ رضیہ نے کہا۔

”میں جانتا ہوں اس نے کیا کہا تھا۔ میں مر رہا ہوں۔“

”نہیں عشرت!“

”ہاں! میں جانتا ہوں۔ میرے جسم کی ہر ہڈی اور ہر فنس۔ داغ اور اعصاب کا ہر ذرہ اس وقت جانتا

ہے۔ رضیہ میرے قریب آ جاؤ۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اپنے رخسار میرے رخساروں سے

لگا دو۔ ہاں اس طرح۔ رضیہ میری بیوی!“

رضیہ کے ہونٹ کاچنے۔ اس نے زور سے ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبائے اس کی

آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے زور لگا کر بڑی فخل سے ان آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روکا۔

مگر آنسو نہیں رکنے چھلک کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس کے رخساروں سے ہوتے ہوئے

عشرت کے رخساروں پر بہنے لگے جیسا پہلے ہی سے عشرت کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”رہو۔ رہو۔“ رضیہ ان آنسوؤں کو اپنے دو تھلے آنسوؤں کو میرے آنسوؤں کو ایک

قدم سے پھسل جانے دیا۔ آنسوؤں کا سنگم ہے۔ میری روح اس میں نہا کر پاک رصاف ہو رہی ہے۔

آج ساری غلطیوں ساری کوریایاں اور ساری برائیاں چٹ گئی ہیں اب میری روح دھلی دھلائی تمہاری

محبت کے نور کا لباس پہنے جگمگا رہی ہے۔ دیکھو رضیہ آج میں پھر حیا ہوں۔ پہلے کی طرح پھر

میرد ہوں.... تمہارا بیرو!

آج میں ایک ہیرو کی موت مروں گا۔ تمہاری باہنوں میں ایک ہیرو کی طرح ہاتھ دھو رہے چلتا ہوں۔ پھر
یہ ایک اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے اور وہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔

اس کے بعد وہ ہوش میں نہیں آیا۔ لمحہ بہ لمحہ۔ سیکڑ منٹ۔ گھٹے گھڑ گئے۔ زلیوار پر گئی
ہوئی گھڑی ٹپک ٹپک کرتی رہی ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔ ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔ ٹپک ٹپک میں جاتی
ہوں۔ . . . ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔

”عشرت“

”ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں“

لیکن عشرت نے رضیہ کی آواز نہیں سنی۔ اس کا بے ہوش سنا ہوا چہرہ اب باطل نیلا چڑ گیا تھا۔
آنکھیں بند تھیں۔ اور سینے میں الٹی سیدی سانسون کا شور عالم مکرات کا پتہ دیتا تھا۔ سیکڑوں منٹ
سیکڑوں صدیوں کی طرح گزر گئے۔ صبح کے پانچ بجے کے قریب عشرت نے آنکھیں کھولیں۔ اور
اس نے کہا۔ ”ماں ڈوبی آگئی“

اس کے بعد اس نے آنکھ بند کر لی۔ اس کے گلے کا سٹکا ڈھلک گیا۔ اور اس کا ہاتھ رضیہ کے ہاتھ
میں مزد ہو گیا۔

”عشرت۔“ رضیہ زور سے چلائی۔

”ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں“

رضیہ پیڑ لکھا کے زس کی باہنوں میں جاگزی۔ زس نے ایک بچی کی طرح کُسنے لگے سے لکھایا۔ اور اسے
ٹوہا رس دینے لگی۔ مگر رضیہ اس طرح بلک بلک کے رو رہی تھی۔ جیسے ایک انسان نہیں ایک زخم
رو رہا ہو۔

کہتے ہیں مرنے والے کے ساتھ اس کی ساری مصیبتیں اور دکھ ختم ہو جاتے ہیں۔ جب وہ مردانا ہے تو اپنی ساری زندگی اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور پھر اس دنیا میں اس کا کچھ نہیں رہتا اس کی یاد رہتی ہے اچھی یا بُری۔

اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ مگر ہم لوگ بڑے عجیب وقت میں ایک عجیب زمانے میں ایک عجیب نظام زندگی میں رہتے ہیں یہاں مرکز کی غلامی نہیں ہوتی اور مصیبت کم نہیں ہوتی۔ جو بے عزتی زندگی میں حاصل ہوتی ہے وہ مرنے کے بعد دو چند ہو جاتی ہے۔ ایک حد ہے جس کے آگے کوئی نہیں جاتا، جہاں مرنے والے کے سارے گناہ بخش دئے جاتے ہیں۔

مگر جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہاں مردوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ یہاں کوئی حد نہیں ہے کوئی معافی نہیں ہے۔

رہزیہ جوں ہی دار ڈسے باہر نکلے سر جھیکے ہوئے آنسو پونچھتی ہوئی۔ زہی نے اس کے ہاتھ میں ایک پل دیا، رفیعہ نے جھللاتے ہوئے آنسوؤں میں اسے پڑھا۔

۲۲۲ — . — .

کرے کا کرایہ

۳۲۱ — . — .

انجکشن دلائیاں

۴۰ — . — .

خاص غذا اور کمی

۵۶۳ — . — .

۶۰ — . — .

جور قسم اب تک دی جا چکی ہے

۴۶۳ — . — .

بقایہ

نہ لے کہا ”مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی۔ مگر اُسے نہ بچا سکے۔ موت ناگزیر ہے۔ تم اب کرنا کہ یہ بل عشرت کی لاش کو لے جلنے سے پہلے ادا کر دیتا۔ ہسپتال کا قاعدہ ہے۔“

رضیہ نے کہا ”بہت اچھا“ مگر اس کی بھرمیں ڈرایا کہ وہ چار سو تریسٹھ روپے آٹھ آنے کا بل آج ہی ان اگلے چار گھنٹوں میں کہاں سے ادا کر سکے گی۔ اکرم کے پاس پیسے نہیں تھے ستر روپے کے پاس پیسے نہیں تھے اور اب تو رضیہ کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔

پھر وہ کہاں سے یہ چار سو تریسٹھ روپے آٹھ آنے کا بل ادا کرے گی۔

یہ ایک سے راج کا خیال کیا جس لڑکی نے عشرت کو تباہ کیا تھا جس لڑکی نے عشرت کے سینے لگ کر اس کی جوانی کا سارا رس چوس لیا تھا۔ یقیناً وہ عشرت کے کفن کے پیسے تو دے دے گی۔

اگر رضیہ کے پاس پیسے ہوتے تو وہ مر جاتی مگر کبھی راج کے پاس نہ جاتی مگر اس وقت کوئی چارہ نہ تھا وہ اپنے محبوب کی لاش ہسپتال میں مٹا نہیں سکتی تھی۔

باندھ بیچ کر وہ دیر تک راج کے بنگلے کے باہر گل ہیر کے درخت کے نیچے کھڑی رہ

فیصلہ کرنے کی کوششیں کرتی رہی کہ وہ اندھ جائے کر نہ جائے۔ اس کا دل اندھ جانے کو نہ چاہتا تھا۔ وہ ایک قدم اٹھاتی مگر پھر اس کا احساس اسے روک لیتا۔ پورے میں راج کی بادی رنگ کی کیڑی لگ سورج کی شعاعوں میں چمک رہی تھی اس کا خاندان شکر کاڑی کے اندر خاموش بیٹھا تھا پتھر کی صورت۔ شاید راج کہیں باہر جانے والی تھی۔ یہ ایک رضیہ نے سوچا۔ وہ بڑھ کر اندھ چلی ہی جائے اور راج سے بات کرے۔ کہیں راج باہر چلی گئی تو اسے ایسا موقع نہیں ملے گا۔

اس نے بلاؤں سے وہ بل نکالا۔ چار سو ترسیٹھ روپے اٹھائے والا۔ اور جرأت کر کے کینڈی لک کے آگے سے گھوم کے اندر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ جین اس وقت راج اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ بھی بھائی۔ ایک عمدہ بناری ساڑی میں طبوس، خوبصورت، دلکش، دل ربا، اس کے ہوشوں پر ایک تاناک تبتم تھا اور اس کی نل میں ایک نوجوان چل رہا تھا۔ رنجیٹ اُسے دیکھ کر حیرت کی خیمہ لکڑ پر ٹھٹھک کر رو گئی۔

”بائیں یہ عشرت تھا، زندہ؟“

دوسرے لمحے میں جب وہ نوجوان قریب آیا تو رنجیٹ نے محسوس کیا کہ یہ عشرت نہ تھا، یہ تو کوئی اور تھا۔ مگر جلد ہی کیوں اس نوجوان کا چہرہ دھندل گیا کسی ان جلدی نے طریقے سے مسرت کی یاد دلاتا تھا جیسے اس نوجوان اور عشرت میں کوئی ثالث ہو۔ دوسرے لمحے یہ اچانک رنجیٹ کی سمجھ میں آ گیا۔ ہاں اس نوجوان کا چہرہ بھی ایٹن ٹاڈ سے ملتا تھا۔

راج نے رنجیٹ کو اس نوجوان کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اس کا تبارک کولتے ہوئے کہتا یہ بری سہیلی رنجیٹ۔ آپ میں عشرت؟“

عشرت؟ رنجیٹ چوہکی۔

راج نے ہنس کر کہا۔ نہ رئیس گنج والا عشرت نہیں۔ ان کا نام بھی اتفاق سے عشرت ہے۔ وہی فراخ سینہ، مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ وہی بروگ کے جوئے، وہی دونوں راتالی ہون

کی پیش فرسٹ وہی نام وہی لباس۔ رنجیٹ کا بھی چاہا وہ بڑھ کر اس عشرت کو اپنی باہو میں جکڑ لے، اس سے چڑا چلا کے کچھ نہ جاؤ عشرت پر سے بھولے عشرت۔ اس زندہ موت کے ساتھ کہیں نہ جاؤ راج نے مسکرو کے پریشان ملا رنجیٹ سے پوچھا کہیں۔ کچھ کام ہے کچھ چاہئے؟ وہ نے ہل میں کہا۔ ہاں مجھے تمہارے کام تھا۔ میں تمہارے کچھ ملنے آئی تھی۔

ایک کفن : —————

عشرت کے لئے ایک کفن —————

مگر اب میں سوچتی ہوں تم سے کس کے لئے کفن مانگوں؟

اس عشرت کے لئے جو ہسپتال میں مردہ پڑا ہے؟

یا اس عشرت کے لئے جو تباہی بانہوں میں زندہ ہے؟

رفیقہ نے ایک لمحے کے لئے نظر سحر کے راج کی طرف دیکھا اور پھر چپ چاپ خاموشی سے اسکا میں

سر لادیا بغیر شعوری طور پر اس نے وہ ہاتھ چھپے کر لیا جس میں ہلکا سا بھرا رکھا تھا۔

پھر وہ ہلٹ کر اپنے آنسوؤں کو روکتی ہوئی تیز تر قدموں سے دوڑتی ہوئی پھلے کے باہر چلی گئی۔

فہرست کتب

90 00	دیوان سنگھ مفتون	ناقابل فراموش
80.00	جوش ملیح آبادی	یادوں کی ہارات
27 00	سعادت حسین منٹو	منٹو کے ڈرامے
18.00	..	منٹو کے افسانے اور ڈرامے
15 00	..	جسٹازے
15 00	..	چغہ
18 00	..	پھندلے
12.00	..	دھواں
12 00	..	ہر قسم
12 00	..	بغیر اجازت
10 00	..	آتش پارے
10 00	..	سرگزشتِ اسیر
8 00	..	شکاری عورتیں
6.00	..	نور جہاں سرور جاں
10 00	..	بغیر عنوان کے
27 00	کرشن چندر	باون پنے
18 00	..	ایک کروڑ کی بوتل
12 00	..	ہوکاشم کی ڈالی
12.00	..	وزیروں کا کلب

مکتبہ شہرِ ادب سہن آباد - لاہور